# مقیدِ خاک

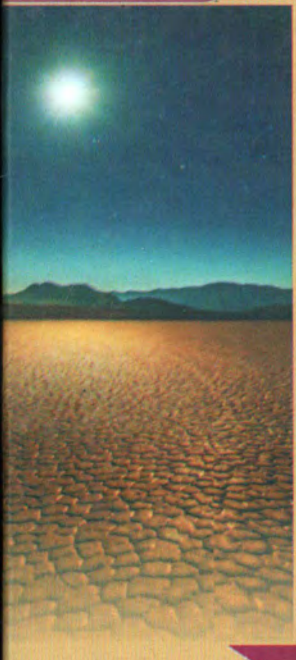

سیّدہ ضوباریہ ساحر

PakistaniPoint
Aik Rabta Apnon Sey

# مقیدِ خاک

سیّدہ ضوباریہ ساحر

پاکستانی ادب کا عظیم ذخیرہ
وقار احمد کی ڈاٹ کام

عبداللہ اکیڈمی
الکریم مارکیٹ۔ اُردو بازار، لاہور (پاکستان)
فون: 0423-7230350 فیکس: 009+42-37241382
موبائل: 0344-4422336 0345-4061241
E-mail: abdullahacademy@gamil.com

ہماری کتابیں معیاری کتابیں
خوبصورت اور کم قیمت کتابیں

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں


| | | |
|---|---|---|
| نام کتاب | — | مقیدِ خاک |
| مصنفہ | — | سیّدہ ضوباریہ ساحر |
| ناشر | — | مشتاق احمد |
| اہتمام | — | سلمان منیر |
| اشاعت | — | 2013ء |
| مطبع | — | اسد نیئر پرنٹرز، لاہور |
| ڈیزائن | — | عاطف بٹ |
| کمپوزنگ | — | عاصم شہزاد 0306-4171117 |
| قیمت | — | 300 روپے |


کتاب ہذا میں اگر کہیں کوئی غلطی نظر آئے تو ادارہ کو مطلع فرما کر شکریہ ادا کرنے کا موقع فراہم کریں تاکہ اگلے ایڈیشن میں درستگی کی جا سکے۔ شکریہ!

مشتاق بک کارنر
الکریم مارکیٹ اُردو بازار، لاہور فون: 37230350

# انتساب

قارئین کے نام

جو میری تحریر کے سراہتے ہیں

سیّدہ ضوباریہ ساحر

پاکستان ورچوئل لائبریری ڈاٹ کام

پاکستانی وقار عظیم ڈائجسٹ ڈاٹ کام

# مقیدِ خاک

''بعض انسانوں کا اپنی زندگی میں ایسے حیرت انگیز اور ناقابل فہم واقعات سے واسطہ پڑتا ہے کہ انہیں خود یقین نہیں آتا کہ آیا ایسا حال حقیقت میں ان کے ساتھ ہوگزرا ہے یا ماضی میں جو کچھ بھی ہوا وہ محض ایک خیال، ایک حیران کن خواب تھا؟ ایک ایسا خواب جس کا حقیقت سے دُور کا بھی تعلق نہ ہو۔

اس کے باوجود کچھ واقعات ہماری کتابِ حیات پر اس طرح نقش ہو جاتے ہیں کہ برسوں بیت جانے کے باوجود جب کہ ہم اپنے ماضی کو تاریکیوں کے حوالے کر کے، مستقبل کی روشنیوں میں بہت آگے آچکے ہوتے ہیں اور ہمیں اپنے عقب میں دھندلکوں کے ماسواء کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ اپنی کتاب کے اوراق پلٹتے ہوئے اپنے ماضی کے انہی دھندلکوں میں جھانک کر کچھ دیکھنے کی کوشش کر رہے ہوتے ہیں تو ایسے میں مخصوص اوراق پر پہنچ کر ہم خود ساکت رہ جاتے ہیں اور ہمارا لاشعورا فوراً حرکت میں آجاتا ہے، تمام تاریکیاں اور دھندلکے چھٹ جاتے ہیں، تمام واقعات، کردار مناظر ہمارے پردہ تصویر پر روزِ اوّل کی طرح واضح اور روشن ہو جاتے ہیں۔ہمیں یوں لگتا یہ جیسے یہ تمام واقعات ابھی کل کی بات ہوں۔

ایسا ہی ایک دور بذات خود میری اپنی زندگی کا حصہ رہ چکا ہے۔

میں جب بھی اپنے ماضی کے اس دورانیے کے بارے میں سوچتا ہوں تو خود کو ایک عجیب سی سنسنی خیز کیفیت کا شکار پاتا ہوں۔

میرا خیال ہے کہ پہلے میں سرسری طور پر آپ کو اپنے بارے میں بتا دوں تو زیادہ مناسب رہے گا۔''

''جیسے کہ آپ کو معلوم ہے کہ میں ایک کارڈیالوجسٹ ہوں تو ظاہر ہے کہ میڈیکل کا یہ شعبہ میں نے اپنے شوق سے ہی چنا ہوگا۔ مجھے شروع سے ہی دل کا بہت بڑا ڈاکٹر بننے کا شوق تھا۔مگر آج جو کامیابی، عزت، شہرت اور مقام مجھے حاصل ہے، یہ میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ ایک دن میں اتنا بڑا ڈاکٹر بن جاؤں گا اور پوری دنیا میں مجھے ایک ''ہارٹ اسپیشلسٹ'' کے نام سے پہچانا جائے گا۔ مجھے تو یہی یقین نہیں تھا کہ میں ایم بی بی ایس مکمل کر سکوں گا۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ میرا تعلق ایک متوسط گھرانے سے تھا۔ان دنوں ہمارا پورا خاندان مصر کے شہر ''سیوا'' میں آباد تھا۔تعلیم کے اخراجات اٹھانا ابا جی کے بس کی بات نہیں تھی۔یہی وجہ تھی کہ میں پارٹ ٹائم جاب کے طور پر ایک پرائیویٹ کلینک پر بطور ڈسپنسر کام بھی کرتا تھا۔ایم بی بی ایس میں ٹاپ کرنے کے بعد ابا جی نے اپنی ایڑی چوٹی کا زور لگا کر چچا جی کے ساتھ مل کر مکان بیچا اور مسلسل قرض ادھار لے کر مجھے اسپیشلائزیشن کے لئے امریکہ روانہ کر دیا۔ شاید قدرت کی رضا بھی میرے ساتھ تھی۔

امریکہ سے اسپیشلائزیشن کرنے کے بعد واپس آیا اور میڈیکل کے شعبہ سے وابستہ اپنے چند دوستوں کے ساتھ مل کر ایک چھوٹا سا ہاسپٹل قائم کر لیا جب ہاسپٹل کا افتتاح ہوا تو سب اپنی جگہ مصروف ہوتے گئے۔ چاروں طرف کی بستیوں اور دیہاتوں سے مختلف رئیسوں کے پیغام اور دعوت نامے میرے نام آنے لگے۔ روز روز کی ان دعوتوں سے میں اس قدر تنگ آ گیا کہ کچھ عرصے کے لئے میں نے خود کو ہاسپٹل میں پوری طرح ریزرو کر لیا۔

تقریباً ایک ماہ کا عرصہ گزر گیا آس پاس علاقوں سے ایسے مریض جن کے امراض خطرناک تھے، یا شدید اور مختلف امراض میں مبتلا ہونے کے باعث دور دراز کے ہسپتالوں میں ایڈمٹ تھے اور دوری کے باعث مسلسل دوہری پریشانیوں کا شکار

تھے۔ وہ بھی اب یہیں ٹرانسفر ہو رہے تھے اور پورا عملہ مصروف کار تھا۔

میں اپنے آفس میں تھا۔ دو سینئر ڈاکٹر اور ایک لیڈی ڈاکٹر بھی آفس میں موجود تھے۔ ہم نہایت اطمینان سے کافی کی چسکیاں لے رہے تھے اور ہسپتال کے کچھ ضروری امور پر گفت وشنید کرنے میں مگن تھے کہ اچانک ایک شور کی آواز سنائی دی اور ہم سب چونک پڑے۔ کوئی زور زور سے چلا رہا تھا۔

''منقو روطور خس...... صطفوا، صطفوا...... آقو صطفوا، صطفوا '' میں نے کپ ٹیبل پر رکھا اور فوراً باہر نکل آیا، چند افراد تھے جو راہ داری میں ایک اسٹریچر بھگائے لا رہے تھے۔ غالباً کوئی مرد اس پر بے ہوش پڑا تھا۔

ایک اونچا لمبا حبشی آگے آگے تھا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ برق رفتاری سے میری جانب دوڑا اور گھٹنوں کے بل میرے قدموں میں بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ میرے گھٹنے تھامتے ہوئے میری جانب دیکھ کر بولا۔

''میسحو...... میسحو رحمی...... ماردقلبو معکوسط...... میسحو باشا مارتاً دیوتا، باشا قلبو معکوسط...... میسحو رحمی پاشا نفس الدورا'' وہ حبشی کوئی افریقی تھا جو قدیم مصری اور افریقی قبائلی زبان کو مرکبی انداز میں پیش کر رہا تھا مگر اس کی بات کا مفہوم اور پھر صورت حال میں سمجھ گیا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔

''مسیحا (ڈاکٹر) مالک کا دل الٹ گیا ہے (یعنی ہارٹ اٹیک) یہ میرا دیوتا ہے مسیحا پاشا کا دل الٹ گیا ہے، مسیحا رحم کرو ورنہ پاشا کی روح جسم سے دور ہو جائے گی۔''

اسٹریچر بالکل قریب آ چکا تھا ڈاکٹر میرے برابر آ کھڑے ہوئے، میں نے انہیں مخاطب کیا۔

''ایمرجنسی...... گو ہری اپ...... گو فاسٹ......!'' میں تیز آواز میں کہتا ہوا خود بھی آپریشن روم کی جانب دوڑ پڑا۔ مریض ایک ادھیڑ عمر کا آدمی تھا جو اپنی آخری سانسوں پہ تھا اور یہ حقیقت تھی کہ اگر میڈیکل ٹریٹمنٹ میں چند منٹ بھی دیر ہو جاتی تو اس کا بچنا ممکن نہ تھا لیکن شاید ابھی اس کی زندگی تھی جو اس کے اقرباء اسے

بروقت ہاسپٹل لے آئے تھے۔ یہ تو مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ کوئی معمولی ہستی کا مالک نہیں بلکہ ایک بہت ہی امیر کبیر آدمی ہے۔عدلان پاشا..... ہاں یہی نام تھا اس کا عدلان پاشا۔

میں جیسے ہی آپریشن روم سے باہر نکلا ایک نرس مجھ سے مخاطب ہوئی۔

''سر..... ! لیڈیز ویٹنگ روم میں پاشا صاحب کے کچھ عزیز آپ کے منتظر ہیں۔''

''ہوں.....!'' میں گردن ہلاتا ہوا ویٹنگ روم کی جانب بڑھ گیا۔اندر داخل ہوتے لمحے میں ایک ذرا ٹھٹک کر رُک گیا۔ میرے ٹھٹکنے کی وجہ وہ حسن برق نما تھا جو بے ردا و حجاب سامنے ہی صوفے پر موجود تھا۔ غالبًا یہ عدلان پاشا کی صاحبزادی تھی۔وہ پریشانی میں گم سم اداس بیٹھی تھی۔ اس کا رخ سامنے کی سمت تھا۔اس کے علاوہ دو ادھیڑ عمر کی عورتیں بھی اندر موجود تھیں جو حلیے اور انداز سے خادمائیں معلوم ہوتی تھیں۔

میں اندر داخل ہوگیا مگر وہ بے خبر اس طرح بیٹھی رہی۔ایک لمحے کو میں اس کی صورت دیکھ کر خالی الذہن کیفیت کا شکار ضرور ہوگیا تھا کیونکہ اس کے چہرے پر کچھ ایسی ہی سادگی اور بھول پن بکھرا ہوا تھا اوپر سے اس معصوم صورت پر ایک سوگوار سی پرچھائیں۔

میں نے گلا کھنکارا تو وہ یوں چونک پڑی جیسے اچانک کسی نے سوتے میں سے جگا دیا ہو۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ ہڑبڑا کر اٹھ کھڑی ہوئی اور بوکھلائے ہوئے انداز میں ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

غالبًا وہ اپنی چادر ڈھونڈ رہی تھی جو اسے اس لئے نظر نہ آرہی تھی کہ وہ صوفے کے عقب میں گری پڑی تھی میں نے آگے بڑھ کر وہ ریشمی سی چادر اٹھائی اور اس کی جانب بڑھا دی۔اس نے چادر پکڑی اور جسم سے لپیٹتے ہوئے مخملی سے لہجے میں میرا شکریہ ادا کیا اور رخ پھیر کر کھڑی ہوگئی۔ میرا خیال تھا کہ کچھ کہے گی مگر خلاف توقع جب وہ کافی دیر خاموش کھڑی رہی تو میں نے ہی کہا۔

''فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ اب آپ کے والد صاحب خطرے سے باہر ہیں۔'' میں نے ایسی تو کوئی بات نہیں کی تھی جو غیر اخلاقی ہوتی ، مجھے علم تھا کہ میرے ان الفاظ کا اس پری زاد پر کیا اثر ہوگا لیکن میرے جملے کے مکمل ہوتے ہی وہ کچھ اس برق رفتاری سے میری جانب پلٹی تھی کہ میں ہڑ بڑا کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا کہ مبادا مجھ پر حملہ آور ہی نہ ہو جائے۔

اس کے چہرے پر زلزلے کے تاثرات ابھر آئے تھے اور وہ عجیب سی نظروں سے یک ٹک مجھے گھور رہی تھی۔

''یہ آپ کیا فرما رہے ہیں.....؟'' حیرت اس کا انداز تھی۔

''کیا مطلب.....؟ میں نے کچھ غلط کہہ دیا کیا.....؟ میں نے تو صرف اتنا کہا ہے کہ فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں، آپ کے والد صاحب اب خطرے سے باہر ہیں۔''

وہ دونوں ہتھیلیوں کی روک میں چہرے کو تھام کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے گویا ہوئی۔

''للہ.....! خاموش ہو جائیں، یہ آپ کیا کہے جا رہے ہیں۔ وہ میرے والد نہیں، میرے خاوند ہیں..... میرے مجازی خدا.....!''

اور اس بار حیران ہونے کی باری میری تھی۔ وہ ساٹھ برس کا بوڑھا اور یہ کمسن سی لڑکی جو بمشکل سترہ سال کی ہی ہوگی۔ اور یہ اس بوڑھے کی بیوی.....؟ جانے کیوں مجھے بڑا دھچکا سا لگا اور میں نے اس کمسن لڑکی کے لئے اپنے دل میں بڑی ہمدردی محسوس کی۔

''معزز خاتون.....! میں معذرت خواہ ہوں، مجھے معلوم نہ تھا۔ لہٰذا میری معذرت قبول کی جائے۔'' میں نے دلی خلوص سے معذرت کی۔

''آپ کے خاوند اب پروردگار کی رضا سے خطرے سے باہر ہیں۔''

وہ لڑکی برابر مجھے گھور رہی تھی جیسے اسے کوئی خاص چیز نظر آ رہی ہو..... جیسے وہ مجھ میں کچھ تلاش کر رہی ہو۔

میں نے ایک نظر ان خادماؤں کی طرف دیکھا، وہ بدستور اپنی جگہ یوں بے حس وحرکت کھڑی تھیں جیسے پتھر کی مورتیاں ہوں۔اس لڑکی کی نظریں جھک گئیں اور روشن پیشانی پر سوچ کی لکیریں ابھر آئیں۔ میں نے رسمی سے الفاظ کہے اور کمرے سے نکل آیا۔

میری تمام فیملی سیوا میں ہی رہائش پذیر تھی۔سو میں چند ڈاکٹروں کے ساتھ ہسپتال کی عقبی عمارت میں ہی رہتا تھا۔میں سیدھا اپنے کمرے میں جا کر بیڈ پر دراز ہوگیا۔اس لڑکی کی معصوم سی صورت کثیف دھوئیں کی طرح میرے دماغ کے اندر جھومنے لگی۔ بے چاری کی تمام خواہشوں کو روند کر حسرتوں میں بدل دیا گیا تھا۔

بھلا وہ بوڑھا کھوسٹ اس کی تمام تر ضروریات کیسے پوری کرتا ہوگا؟ اور یہ معصوم بھلا اس بوڑھے کے پوپلے وجود کوکس طرح برداشت کرتی ہوگی؟ طرح طرح کے خیالات دماغ میں امنڈتے چلے آرہے تھے۔آخر کو میں سوگیا۔

☆☆☆

عدلان پاشا بالکل صحت یاب ہوکر ہسپتال سے اپنے محل کو رخصت ہوگیا۔ وہ مجھ پر نہایت مہربان تھا۔سمجھتا تھا کہ میری وجہ سے اس کی زندگی بچی ہے اگر میں نے یہاں ہاسپٹل نہیں کھولا ہوتا تو اس کا دسواں بھی ہو چکا ہوتا۔ بہرحال جاتے جاتے وہ مجھے اپنے ہاں دعوت کے لئے ضرور پابند کر گیا تھا اور میں نے بھی چار و ناچار ہامی بھر لی تھی۔ اب یہ مشیت ایزدی کہ دو روز بعد ہی مجھے ایک میڈیکل کانفرنس کے سلسلے میں آسٹریلیا روانہ ہونا پڑ گیا اور وہاں سے مہینے کے آخری عشرے کے آخری دنوں میں میری واپسی ہوئی تو پتا چلا کہ عدلان شاہ کا حبشی غلام بیسیوں بار میرا معلوم کر گیا ہے اور میں مسکرا کر رہ گیا۔

اس روز ایک بہت ہی خاص واقعہ ہوا۔ایک ایمرجنسی آپریشن آیا تھا بظاہر تو اس واقعہ میں کوئی حیران کن یا خاص بات نہیں تھی بلکہ یہ ایک قابل افسوس واقعہ تھا کہ ایک غریب مزدور ''بحر مرگ کنار'' پہنچ گیا تھا۔مگر اس میں گرنے سے بچ گیا تھا لیکن درحقیقت اس حادثے کے پس پردہ بہت ہی حیران کن اسرار مخفی تھے۔

چند مزدور اپنے ایک زخمی ساتھی کو لے کر آئے تھے۔ وہ خون میں لت پت نیم بے ہوشی کی حالت میں تھا۔ اس کے دائیں کندھے میں کدال لگی تھی اور کندھے کی ہڈی کو چورہ چورہ کر گئی تھی۔ اس کے علاوہ ایک نوجوان صرف بے ہوش تھا اور بظاہر وہ زخمی بھی نہیں تھا جب اسے آپریشن روم لے جایا جا چکا، آپریشن شروع ہو گیا تو ان کے ساتھ جو ان کا سپروائزر تھا، میں نے اسے طلب کیا۔ اور اس حادثے کے رونما ہونے کی جو وجہ، کہانی کی صورت اس نے میرے گوش گزار کی وہ مجھے بڑی دلچسپ لگی۔

سپر وائزر کا نام ''یوساف بے'' تھا میں نے اسے آفس میں بلایا اور سوال جواب شروع کئے۔

''مسٹر یوساف بے...... ! آپ نے بتایا نہیں کہ اس جوان کو کدال لگی کیسے......؟''

اس مختصر سے سوال کے جواب میں یوساف بے نے کہا۔

''ڈاکٹر صاحب...... ! ہم یہاں سے کچھ دوری پر کھدائی کا کام کر رہے ہیں۔ مشرقی سمت یہاں سے دس بارہ کلو میٹر کے فاصلے پر جو نیلگوں چٹانیں موجود ہیں ناں...... ان کے دوسری جانب...... سبھی اپنی محویت میں کھدائی کر رہے تھے کہ اچانک یہ نوجوان چیخ پڑا۔ پتا چلا کہ دوسرے مزدور نے عقب سے اس پر حملہ کیا تھا اور یہ اس کی خوش قسمتی کہ یہ کھدائی کر رہا تھا کدال کا وار کرنے کے لئے جیسے ہی سامنے کی جانب جھکا، دوسرے مزدور نے عقب سے اس پر کدال کھینچ ماری۔ اگر یہ جھک نہیں گیا ہوتا تو کدال کندھے کی بجائے اس کی کھوپڑی پر پڑتی اور اس کی کھوپڑی ٹکڑوں میں تقسیم ہو جاتی اور حیرت کی بات یہ ہے کہ حملہ کرنے والا اس کا حقیقی بھائی ہے...... اور ان دونوں کی ایک دوسرے میں جان ہے اور اب غم کی شدت سے بار بار اس پر بے ہوشی کے دورے پڑ رہے ہیں...... یہ جو دوسرا نوجوان بے ہوش تھا ناں...... اسی نے وار کیا تھا۔''

''حیرت ہے...... ! جب اتنی ہی محبت تھی تو اس نے اسے جان سے مارنے

کی کوشش کیوں کی......؟''

''ڈاکٹر صاحب......! اس نے بتایا ہے کہ یہ وار اس نے ازخود نہیں کیا بلکہ نہ چاہنے کے باوجود وہ ایسا کر بیٹھا۔''

''اس کا کیا مطلب ہوا......؟''

''مطلب تو جی معلوم نہیں مگر بے ہوشی سے قبل اس نے سرسری سا بتایا تھا کہ وہ کھدائی کر رہا تھا اس کا بھائی اس سے دو قدم آگے اپنے کام میں مگن تھا، کہتا ہے کہ اچانک جب کدال میں نے سر سے بلند کر رکھی تھی مجھے یوں معلوم ہوا جیسے کسی نادیدہ قوت نے اسے فضا میں ہی تھام لیا ہو۔ میں نے زور لگایا مگر کدال نیچے نہ آئی۔ میں نے کدال چھوڑنا چاہی مگر باوجود کوشش کے چھوڑ نہیں پایا۔ مجھے خوف محسوس ہوا کہ یہ بھائی کے سر میں نہ لگے گی۔ میں نے چیخ کر اسے خبردار کرنا چاہا مگر میرے حلق سے آواز نہیں نکل پائی اور پھر اچانک وہ بھائی کے کندھے میں اتر گئی۔''

میں بغور یوساف بے کی صورت دیکھ رہا تھا۔ وہ پوری طرح سنجیدہ تھا اس کی آنکھیں اور چہرے کے تاثرات اس کے سچ کی گواہی دے رہے تھے۔ میں نے بے یقینی کے سے انداز میں اسے مخاطب کیا۔

''یوساف بے......! کیا یہ بات قابل یقین ہے؟ کیا ایسا ممکن ہے؟ میں ہرگز نہیں مانتا اس کہانی کو۔''

''آپ کے ماننے نہ ماننے سے کیا ہوگا......؟''

چند لمحے ہمارے درمیان خاموشی رہی پھر میں نے ہی اسے مخالب کیا۔

''اچھا...... یہ کھدائی کس سلسلے میں ہو رہی ہے......؟''

یوساف بے مسکرایا اس کی مسکراہٹ میں چھپے ہوئے مضحکہ خیز اور طنزیہ تاثرات کو میں نے بخوبی محسوس کر لیا تھا۔

''ایک خشک دماغ بوڑھا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ اس جگہ زمین کے نیچے صدیوں پرانا کوئی مقبرہ دفن ہے اور وہ اسے دریافت کرنا چاہتا ہے۔''

''ہوں...... ویری انٹرسٹنگ......! پھر کیا کوئی آثار ملے......؟''

''نہیں...... ابھی تک تو کوئی نام و نشان نہیں ملا اور شاید آئندہ پچاس سال تک کوئی آثار ملے بھی نہیں۔''

ہم باتیں کر رہے تھے کہ چپڑاسی اندر داخل ہوا۔

''سر......! توسامہ آیا ہے۔ آپ سے ملنا چاہتا ہے۔''

''کون توسامہ......؟''

''سر......! وہ عدلان پاشا کا حبشی غلام......!''

''ہوں...... بھیج دو اسے۔''

یوساف مجھ سے ہاتھ ملا کر باہر چلا گیا تو وہ کالا بھوتنا اندر آ گیا۔ پہلے تو اس نے دونوں ہاتھ سینے پر جوڑ کر مجھے تعظیم دی اس کے بعد زیریں ناف ہاتھ باندھ کر نظریں جھکا کر باادب کھڑا ہو گیا۔

''کہو توسامہ......! کیسے آئے ہو......؟'' میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ اور وہ اپنے مخصوص انداز میں گویا ہوا۔

''میسحو......! مارتے آقا عمت بلنوا حامص وقمامت مرت طمت اندروا۔''

(مسیحا......! میرے آقا نے تمہیں کھانے پر بلایا ہے اور میں تمہیں لینے آیا ہوں)

چند لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے اسے مخاطب کیا۔

''مسرت مصوا پچھم آترت حلیم۔''

(میں مصروف ہوں شام کو آنا میں چلوں گا)۔

کچھ دیر وہ خاموشی سے نظریں جھکائے کھڑا رہا پھر آہستگی سے واپس پلٹ گیا۔

دن میں اس بے ہوش ہو جانے والے نوجوان سے میری ملاقات ہوئی تو میرے دریافت کرنے پر اس نے وہی کہانی دوہرائی جو میں یوساف بے کی زبانی سن چکا تھا۔ وہ سب تو واپس جا چکے تھے البتہ زخمی ہونے والے مزدور کو کم از کم تین چار ہفتے کے لئے روک لیا گیا تھا۔ اسے اپنے بھائی سے کوئی شکایت نہیں تھی کہ اس نے

اس پر اتنا کاری وار کیا تھا کہ وہ مرتے مرتے بچا تھا۔

غروبِ آفتاب کے وقت تو سامہ دوبارہ آن پہنچا اور میں اس کے ساتھ روانہ ہوگیا۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد ہم ایک خوبصورت اور عالی شان قدیم طرز کی عمارت کے صحن میں موجود تھے۔ جس کے عین وسط میں سنگ مرمر کا فوارہ پانی اگل رہا تھا، نیچے تالاب تھا جس میں ہلکے آسمانی رنگ کا سنگ مرمر استعمال کیا گیا تھا اور نیلا نیلا شفاف پانی بڑا ہی بھلا دکھائی دے رہا تھا۔ تالاب کے چاروں کونوں میں ''آئی سس'' اور ''عدونس'' کے مجسمے سجائے گئے تھے۔ سنگی روشوں کے گرداگرد سبز سبز گھاس بچھی ہوئی تھی جس میں جگہ جگہ ''قلوپطرہ'' اور ''گالیکا'' کے خوش رنگ پھول کھلے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

اس کے آگے کافی دوری تک سبزہ بچھا ہوا تھا جس کی حد بندی سیاہ گلاب کے خوب صورت پودوں سے کی گئی تھی اور اس سے آگے سفید سنگ مرمر سے تعمیر کردہ وہ خوب صورت محل نما عمارت تھی جس کے در و بام اس قدر شفاف، ملائم اور چکنے تھے کہ نظر پھل پھل جاتی۔ عمارت کے اوپری برج و منارے اس قدر بلند و بالا تھے کہ سر اٹھا کر دیکھتے ہوئے یہ خوف دامن گیر ہوتا کہ سر کندھوں سے لڑھک کر عقب میں نہ جا گرے۔

عجیب سحر خیز ماحول تھا۔ میں حیران نظروں سے یہ سب دیکھتا ہوا تو سامہ کی ہمراہی میں آگے بڑھ رہا تھا۔

میں یہ کہنے میں کوئی عار محسوس نہیں کر رہا کہ ایسی بہشتی خوب صورتی اس سے قبل میری نگاہوں سے نہیں گزری تھی۔ یہ ماحول دیکھ کر ہر کوئی بخوبی اندازہ کر سکتا تھا کہ عدلان پاشا کس قدر رنگین مزاج اور حسن پرست انسان ہے اور ظاہر ہے حسن پرست انسان عیاش نہ ہو یہ کوئی قابل یقین بات تو نہیں؟ میں جیسے جیسے آگے بڑھ رہا تھا ایک عجیب سی بوجھل بوجھل بے خود کر دینے والی مہک بھی میرا حصار کیے جا رہی تھی۔ حیران کیے دے رہی تھی۔

جانے یہاں کے در و دیوار، فرش وغیرہ کیسے کیمیکل سے دھوئے جاتے ہوں

گے کہ کہیں کوئی ہلکا سا داغ، ہلکا سا دھبہ بھی نام کو نہ تھا۔تمام کا تمام پتھر ہی استعمال کیا گیا تھا،مگر اس میں ایسا اجلا پن تھا کہ یوں لگ رہا تھا جیسے سفید دودھیا شیشہ استعمال کیا گیا ہو۔

فرش اور دیواروں میں مجھے اپنا تمام سراپا صاف دکھائی دے رہا تھا اور حیرت کی بات نہ کوئی مکھی نہ کوئی چیونٹی، کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔شاید اس بات کا خاص خیال رکھا گیا تھا کہ چیونٹیوں کے رینگنے سے فرش آلودہ ہوجائے گا۔ سو چیونٹیوں اور مکھیوں کا خاص انتظام کیا گیا ہوگا۔

برآمدے تک پہنچنے کے لئے چھ زینے تھے۔میں جیسے ہی آگے بڑھنے لگا میرا پاؤں پھسل گیا۔وہ تو برق اندازی سے توسامہ نے مجھے تھام لیا۔ورنہ تو میرا ناک ماتھا برابر ہو جاتا۔ میں نے ہارڈسول کے جوتے پہن رکھے تھے،مجبوراً وہ مجھے اتارنے پڑے۔توسامہ نے بھی جوتے اتار دیئے اور ہم ٹھنڈے فرش پر ننگے پاؤں ہی آگے بڑھنے لگے۔عمارت میں داخلے کے لئے ایک محرابی راستہ تھا جس کے ذریعے ہم اندر داخل ہوئے۔بڑا وسیع وعریض ہال نما کمرہ تھا جس میں چاروں طرف کی دیواریں اطلسی پردوں کے پیچھے گم تھیں اور انہیں پردوں میں سے جا بجا دروازے نظر آرہے تھے جو غالباً صندل کی لکڑی سے تیار کردہ تھے۔چاروں طرف صندل کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔فرش پر انتہائی نرم و نفیس قالین بچھا ہوا تھا جس کی دبیزیت کا یہ عالم تھا کہ پاؤں رکھتے ہی احساس جاگزیں ہوتا کہ پورے کا پورا وجود ہی اس میں دھنس کر رہ جائے گا۔چھت کے ساتھ، جہازی سائز کا فانوس لٹک رہا تھا۔جس میں لگے ہوئے بیش قیمت ہیروں کی کچھ ایسی چمک تھی کہ فانوس روشن کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔

میں تو اس خواب نگری میں آکر بالکل ہی گم سم ہوکر رہ گیا تھا۔سامنے کی جانب ایک راہ داری تھی جس کے دروازے پر دونوں اطراف دوننگی سپاہیوں کے مجسمے تلواریں تھامے ایستادہ تھے جو بظاہر بے جان پتھر تھے مگر عدلان پاشا کا نہایت ہی وفادار غلام توسامہ ساتھ نہ ہوتا تو میں یقیناً آگے بڑھتا اور بے خبری میں ان کی تلواروں کا شکار ہو جاتا۔

تو سامہ نے ان کے شانوں پر ہاتھ رکھے تو وہ دونوں مجسمے روبوٹ کی طرح گھوم گئے اور تو سامہ میرا ہاتھ پکڑ کر راہ داری میں داخل ہوگیا۔

مجھ پر کچھ ایسی محویت طاری تھی کہ میں سمجھ ہی نہیں سکا کہ تو سامہ مجھے کدھر کدھر سے گھما کر اس کمرے تک لایا تھا۔ اتنا تو مجھے یقین ہوگیا تھا کہ اب اگر از خود چاہوں تو واپسی کا راستہ تلاش نہیں کر سکوں گا۔ مجھے ایک صوفے پر بٹھا کر وہ خود کمرے سے باہر نکل گیا اور میں اپنے منجمد ہوتے ہوئے حواس بحال رکھنے کی کوشش میں مصروف ہوگیا۔ اصل میں یہاں کا ماحول ہی کچھ ایسا تاثر انگیز تھا کہ میں خود کو انتہائی زیادہ انڈر پریشر محسوس کرنے لگا تھا۔ شاید اسی باعث میرے حواس معطل ہوتے جارہے تھے۔

بہر حال جلد ہی میں خود پر قابو پانے میں کامیاب ہوگیا۔

یہاں تک آتے ہوئے مجھے صرف چند افراد ہی نظر آئے تھے۔ عمارت سے باہر کچھ مرد غالباً خادم اور اندرونی حصے میں آتی جاتیں خادمائیں۔

کچھ دیر مزید گزری تھی کہ تو سامہ آگیا اس نے مجھے بتایا کہ کھانا تیار ہے اور عدلان پاشا آپ کے منتظر ہیں۔ میں اس کے ہمراہ ایک اور ہال کمرے میں پہنچ گیا جہاں قالین پر انواع و اقسام کے کھانے سجے ہوئے تھے۔ عدلان پاشا نے اپنی جگہ سے اٹھ کر مجھے تعظیم دی۔

کھانے کے بعد کچھ دیر تک گپ شپ ہوتی رہی پھر میں نے اجازت مانگی۔ عدلان پاشا اور اس کی کمسن زوجہ انا آطو مصر تھے کہ میں رات رکوں مگر میرا دل بری طرح اس جگہ سے اچاٹ ہو چکا تھا۔ دن کو بچت ہوگئی تھی رات کو جانے کیا ہوتا؟ سو میں عدلان پاشا کی ہزار ضد کے باوجود واپس ہولیا۔ تو سامہ مجھے ہسپتال تک چھوڑنے میرے ہمراہ آیا تھا۔

اس کے بعد کافی دیر تک عدلان پاشا تو سامہ سے میری ملاقات نہیں ہوئی۔ تقریباً ایک ماہ گزر گیا۔ زخمی ہونے والا مزدور اب تندرست تھا گو کہ اس کا زخم پوری طرح مندمل نہیں ہوا تھا مگر اب وہ بہت بہتر تھا سو اسے ڈسچارج کیا جا سکتا تھا۔

اس کا بھائی اور سپروائزر یوساف بے اکثر آتے تھے مگر میری ان سے ملاقات نہیں ہو پاتی تھی۔زخمی ہونے والے مزدور کی زبانی مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ ان کا کھدائی کا کام بند ہو چکا ہے۔وجہ معلوم نہیں تھی۔آخر ایک دن یوساف بے آیا اور میری اس سے ملاقات ہوگئی۔

''بس ڈاکٹر صاحب......! چند عجیب و غریب اور ناقابل فہم واقعات ظہور پذیر ہوئے اور وہ خبطی بوڑھا خوفزدہ ہو کر شہر ہی چھوڑ گیا۔اور اسی باعث کام درمیان میں ہی بند ہوگیا۔'' میرے پوچھنے پر یوساف بے نے تفصیل بتائی۔

''بھلا ایسے کیا عجیب و غریب واقعات تھے جو وہ اتنا گھبرایا کہ شہر ہی چھوڑ بھاگا......؟''

''رات کے وقت ہم وہیں کیمپوں میں ہی سو جایا کرتے تھے اور صبح سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی اپنے کام کا آغاز کر دیتے تھے۔پچھلے چھ دنوں سے سبھی ایک نامعلوم سے خوف کا شکار تھے اور سبھی کی متفقہ رائے تھی کہ اس علاقے میں کچھ نادیدہ وجود بھی موجود ہیں جو ان کے اردگرد چکراتے رہتے ہیں۔اکثر مزدوروں نے رات کو کچھ پراسرار انسانی ہیولے وہاں چکراتے، ٹہلتے ہوئے بھی دیکھے، اور ایک رات تو میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔

وہ کوئی دوشیزہ تھی۔اس نے قدیم طرز کا لباس زیب تن کر رکھا تھا اور وہ ایک مخصوص جگہ پر دائرے کی صورت چکرا رہی تھی...... اس کے جسم کے کھلے حصوں میں سے ایک عجیب قسم کی روشنی منعکس ہو رہی تھی۔اس کے ہاتھ پاؤں اور چہرے سے دودھیا رنگ کی سبزی مائل روشنی پھوٹ رہی تھی۔فاسفورس نما، اور میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ چاند کی مدھ روشنی میں ہی مدغم ہو کر رہ گئی۔

اور تو اور رات کو اکثر کسی عورت کے رونے، کراہنے کی آوازیں، گھمبیر خاموشی میں چاروں طرف پھیل جاتیں اور باوجود کوشش کے ہم کسی بھی عورت کو تلاشنے میں ناکام رہتے۔آخرکار وہ بوڑھا خوفزدہ ہو کر تمام سامان مشینیں اور اوزار وغیرہ سمیٹ کر بھاگ نکلا۔''

میں نے تیکھی نظروں سے یوساف کو گھورتے ہوئے مخاطب کیا۔

''یوساف......! کیا تم مجھے بے وقوف بنا رہے ہو......؟''

''باخدا...... ڈاکٹر صاحب......! میں سچ بیان کر رہا ہوں۔''

''یعنی تمہارا کہنے کا مقصد یہ ہے کہ وہاں بھوتوں کا بسیرا ہے......؟''

''بات کچھ ایسی ہی ہے۔''

''یوساف......! کیا تم مجھے احمق سمجھ رہے ہو......؟ اگر اصل وجہ نہیں بتانا چاہتے تو نہ سہی مگر یہ بچگانہ کہانیاں سنا کر مجھے اُلو بنانے کی کوشش تو نہ کرو۔''

''ڈاکٹر صاحب......! آپ کا کیا خیال ہے...... کیا میں آپ سے محض مذاق کر رہا ہوں......؟ یا آپ یہ سمجھے ہیں کہ میں آپ سے جھوٹ بول رہا ہوں......؟''

''تو پھر یہ سب کیا خرافات ہیں......؟ کیا تم قدیم عہد فراعنہ میں بیٹھے ہو جو اس طرح کی لغویات کا یقین کیا جائے۔ یہ سائنس کا دور ہے، مشینری کا دور ہے اور اس دور میں بھلا بھوت اور بدروحیں...... عجیب منطق ہے......؟''

''ڈاکٹر صاحب......! یہ سب میرا آنکھوں دیکھا اور کانوں سنا ہے اور پھر میرے علاوہ بھی بہت سے لوگ ان واقعات کے گواہ ہیں اور اگر پھر بھی آپ کو یقین نہیں آتا تو آپ خود چار دن وہاں رہ کر کھدائی کروا کر دیکھ لیں۔ آپ کو خود بھی کچھ نہ کچھ نظر آجائے گا۔'' یوساف کی بات پر میں چونک پڑا۔ یوساف کے الفاظ پانی میں پھینکے ہوئے پتھر کی طرح میرے دماغ کی گہرائیوں میں بیٹھتے چلے گئے اور میں ایک ٹک یوساف کو دیکھے گیا لیکن میرا ذہن میری بصارت کی جانب نہیں بلکہ کسی اور جانب متوجہ تھا۔

''آپ مجھے ایسے کیوں دیکھ رہے ہیں......؟'' یوساف قدرے پریشان ہوگیا۔ میرے زیرلب ایک مسکراہٹ ابھر آئی۔ میں نے بدستور اس کے چہرے پر نظریں جمائے اسے مخاطب کیا۔

''یوساف......! ابھی ابھی تم نے کہا کہ میں خود کھدائی کروا کر دیکھ لوں مجھے کچھ نہ کچھ نظر آجائے گا......؟''

''ہاں...... یہ میں نے اس لئے کہا ہے کہ ظاہر ہے آپ کو کھدائی کے دوران وہاں قیام کرنا ہوگا یا آپ چاہیں تو ویسے ہی چار راتیں وہاں گزار کر دیکھ لیں کوئی نہ کوئی پراسرار واقعہ تو پیش آئے گا ہی سو آپ کو میرے کہے پر یقین آجائے گا۔''

یوساف اگر میں کھدائی کروا کر وہ مقبرہ تلاشنا چاہوں تو کیا تم میرا ساتھ دو گے......؟''

''مم...... میں...... کیوں جی......'' میں نے صاف محسوس کیا کہ ایک لمحے کو یوساف کے چہرے کی رنگت متغیر ہوگئی تھی مگر جلد ہی اس نے خود کو سنبھال لیا۔

''کیا بات ہے یوساف......! کیا تم وہاں دوبارہ سے کھدائی کرنے سے خائف ہو......؟''

''نہیں تو...... مگر ڈاکٹر صاحب......! آپ اتنے بڑے ڈاکٹر ہیں...... آپ کا ہسپتال ہے...... اس ہسپتال کو آپ کی ضرورت ہے، بھلا آپ کو ویرانوں کی خاک چھاننے کی کیا ضرورت ہے......؟''

''یوساف......! میں انسانی دلوں کے آپریشن کرتا ہوں۔ اب میں نے سوچا ہے کہ ایک آپریشن اس سنگلاخ زمین کا بھی کر کے دیکھ لوں جہاں تم لوگ ناکام ہوگئے۔ ممکن ہے کہ مجھے زمین کے دل تک رسائی ہو جائے۔''

''مگر ڈاکٹر صاحب......! نہ کوئی مشین ہے نہ اوزار ہیں مزید کھدائی ہاتھوں سے تو کی نہیں جا سکتی اور کھدائی کے مکمل سامان پر تو بہت زیادہ اخراجات آجائیں گے۔ سٹون ڈولز، ڈرل مشین، جیکر مشین، کرینز، جنریٹر، پریشر کٹر، سٹون کٹر اور چھوٹا چھوٹا بہت سامان...... یہ سب کہاں سے آئے گا......؟ ہمارے پاس تو کچھ بھی نہیں۔''

''تم اتنے دنوں تک کھدائی کرتے رہے ہو تمہیں معلوم ہوگا کہ مزید کتنی کھدائی کرنا ہوگی۔''

''ڈاکٹر صاحب......! وہ تو ابتدائی کھدائی تھی اصل کام تو ابھی شروع ہوا تھا اور مزید کتنی کھدائی کرنا ہوگی؟ اس بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ہو سکتا ہے ابھی

سینکڑوں فٹ گہرئی تک کھدائی کرنا پڑے۔''

میں چند لمحے خاموش ہو رہا۔ نہ تو مجھے روپے پیسے کی فکر تھی اور نہ کسی مشینری وغیرہ کی۔ دنیا کے بڑے بڑے ممالک تک میری رسائی تھی۔ اور میں جدید سے جدید مشینری حاصل کر سکتا تھا۔ میں نے یوساف کو مخاطب کیا۔

''یوساف......! کیا تم میرا ساتھ دو گے......؟''

''ڈاکٹر صاحب ......! اگر آپ مشینری کا مناسب بندوبست کر لیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔'' یوساف نے کندھے اچکائے اور میں مسکرا اٹھا۔

''تو ٹھیک ہے تم تمام مشینری اور ضروریات کی ہر چیز کی لسٹ تیار کر کے مجھے دو اور مزدوروں کو تیار رکھو ہم جلد ہی کھدائی شروع کرا رہے ہیں۔'' میری بات ختم ہوتے ہی یوساف نے قلم اور پیڈ سنبھالا پھر سامان کی فہرست ترتیب دینے کے لئے ٹیبل پر جھک گیا۔

☆☆☆

کھدائی کا یہ مقام ہاسپٹل سے تقریباً دس بارہ کلو میٹر پر مصر کے قدیم شہروں ''بلبیس'' اور ''فرما'' کے درمیان واقع تھا۔ یوں تو صحرائی علاقوں کے علاوہ ایسے علاقے بھی تھے مگر کم تھے۔ یہ ایک پہاڑی خطہ تھا۔ جس کے دونوں اطراف میں چٹانیں بکھری ہوئی تھیں۔ یہ چھوٹا سا چٹانی خطہ اگر عبور کر لیا جاتا یا کسی بلند چٹان کی چوٹی پر چڑھ کر دیکھا جاتا تو لق دوق صحرا ہی دکھائی دیتا تھا۔

یہاں سے ٹھیک پندرہ میل دور وہ مقام تھا جہاں کہ 634ء اور 635ء کے درمیان میں مجاہدین اسلام کے لشکر اور رومی فوج کے درمیان بڑی ہی گھمسان کی جنگ ہوئی تھی۔ میرا خیال ہے مختصر سا یہ ذکر بے جا نہیں ہوگا۔

اس دور میں شام، ایران اور مصر پر رومی عیسائیوں کا تسلط تھا۔ مصر میں زیادہ تعداد قبطیوں کی تھی۔ قیصر روم ''ہرقل'' ذاتی شجاعت، جنگی قیادت اور فطری فرعونیت کے لحاظ سے دہشت کا ایک نام تھا۔ اسے طاقت کا دیو کہا جاتا تھا اور قیصر روم کی جنگی طاقت ہیبت ناک دو طاقتوں میں سے پہلے نمبر پر خیال کی جاتی تھی۔ کوئی تصور بھی

نہیں کر سکتا تھا کہ ان دو طاقتوں (دوسری طاقت کسریٰ ایران) میں سے کسی ایک کو بھی کوئی اور طاقت اٹھ کر کمزور کر سکے گی۔

لیکن ایک تیسری طاقت ابھرتی چلی آ رہی تھی یہ صرف ایک جنگی طاقت نہیں تھی بلکہ ایک نظریہ تھا۔ابتداء میں ایرانیوں اور رومیوں کے محلات میں اس کی خبریں پہنچیں تو ان دونوں قوموں نے کہا کہ یہ صحرائے عرب کے لٹیرے بدو ہیں۔انہوں نے مذاق اڑا کر ان خبروں کو نظرانداز کر دیا۔ یہ تیسری طاقت اُفق سے اس طرح اٹھی جس طرح طوفانِ باد و باراں کی کالی گھٹائیں بجلیوں سے لدی ہوئی اٹھا کرتی ہیں یا وہ صحرائی طوفان اٹھتا ہے جو ٹیلوں اور ٹیکریوں کو اپنے ساتھ اڑا کر لے جاتا ہے۔یہ تیسری طاقت ہتھیاروں سے کم اور ایک ایسے جذبے سے زیادہ لیس تھی جو اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے ان پر اتارا تھا۔

یہ ایک ایسا لشکر تھا جس کی نفری بہت ہی تھوڑی تھی لیکن اسے اللہ تعالیٰ نے ایسی قوت عطا کی تھی جسے ایمان کی قوت کہا جاتا ہے۔یہ تیسری طاقت ایسی ابھری کہ تیز تند طوفانوں کی طرح باطل کی قوتوں کو خس و خاشاک کی طرح اڑا اور بہا کر لے گئی اور ان بادشاہوں پر جو اپنے آپ کو ناقابلِ تسخیر طاقتیں سمجھتے تھے۔یہ لشکر آسمانی بجلیاں بن کر گرے۔پھر زمین و آسماں نے دیکھا کہ دنیا کی سب سے بڑی جنگی طاقتوں میں مٹھی بھر مجاہدین کے آگے ٹھہرنے کی تاب نہیں رہی تھی۔ان ہی مجاہدین کو ایرانیوں اور رومیوں نے عرب کے بدو کہا اور ہنس کر نظرانداز کر دیا تھا۔

عراق اور شام کے نصیب جاگے اور اللہ تعالیٰ کا پیغام ان خطوں میں پہنچ گیا۔عراق اور شام کے چھن جانے پر ہرقل بھاگا بھاگا پھر رہا تھا اور اسے کہیں پناہ نہ مل رہی تھی۔640ء اور 642ء کا دور تھا اور یہی ہرقل جو خود کو طاقت کا دیو کہلاتا تھا اور جو دہشت کا ایک نام تھا اس حال تک پہنچا دیا گیا تھا کہ وہ بحیرہ روم کے اس پار "بزنطیہ" میں جا بیٹھا تھا اور وہاں سے مصر میں اپنی فوج کو احکام بھیجتا رہا۔حتیٰ کہ وہ انتہائی مایوسی کے عالم میں انتقال کر گیا۔تاریخ دان آج بھی حیران ہیں آٹھ دس ہزار مجاہدین نے ہرقل رومی کی اتنی طاقتور فوج کہ جس کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ

تھی کس طرح ہر میدان اور قلعے میں شکست پہ شکست دے کر مصر سے بھگا دیا تھا۔

جس جگہ میں کھڑا تھا، یہاں سے ٹھیک پندرہ میل کے فاصلے پر وہ شہر تھا جسے کہ ناقابل تسخیر سمجھا جاتا تھا۔فرعونوں کے زمانے میں اسے ''پلوز'' کہا جاتا تھا۔زمانے گزرتے گئے، مصر قبطیوں کے زیر تسلط آتا گیا تو پلوز کا نام پرمون رکھ دیا گیا پھر آگے چل کر کسی دور میں اس کا نام فرما رکھ دیا گیا۔اب تو دریائے نیل بھی رستہ بدل چکا ہے اس وقت جس علاقے میں فرما واقع تھا وہاں دریائے نیل جا کر سات شاخوں میں تقسیم ہو جاتا تھا ایک کا نام جسے نہر کہا جاتا تھا پلوزی تھا اس لئے اس شہر کا نام پلوز رکھا گیا۔فرما کا یہ شہر ایک بلند پہاڑی پر آباد کیا گیا تھا اس کی حفاظت کے لئے شہر کے گرد ایک مضبوط فصیل تھی۔اس کے علاوہ متعدد قلعہ بندیوں سے محفوظ کیا گیا تھا۔یوں اس شہر کی تسخیر تقریباً ناممکن بنا دی گئی تھی۔ دوسرا یہ پہاڑی پر آباد تھا۔ یہ محاصرہ کرنے والوں کے لئے بڑی زبردست مشکل پیدا کر دی گئی تھی۔

اس شہر پر حملہ کرنے والے لشکر کے سپہ سالار ''عمرو بن عاص'' تھے۔شہر پر چڑھائی کرنے سے پہلے عمروؓ بن عاص نے لشکر سے خطاب کیا۔جو خاص طور پر تاریخ کا اہم حصہ ہے۔

انہوں نے کہا۔

''ہم مصر کو جانے والے اس راستے پر جا رہے ہیں جو ایک قدیم ترین راستہ ہے۔ہمارے پیغمبر دنیائے عرب سے اسی راستے مصر آئے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت یعقوب علیہ السلام، حضرت یوسف علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا پورا خاندان اسی راستے مصر پہنچا تھا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اسی راستے سے فرعون کے جادوگروں کے منہ پھیر کر اور ان کے دانت کھٹے کر کے مصر سے دنیائے عرب کو گئے تھے۔یہی دریائے نیل تھا جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کو راستہ دے دیا تھا اور جب ان کے تعاقب میں آنے والا فرعون ''رعمیس سوم'' نیل میں اترا تو نیل نے راستہ بند کر دیا اور فرعون ڈوب مرا تھا۔

یہ ایک مقدس راستہ ہے۔ یہ ہمارے پیغمبروں کا راستہ ہے۔ یہ نہ سمجھنا کہ ہم کوئی ملک فتح کرنے آئے ہیں، یہ ہماری اپنی سرزمین ہے۔ اس ملک میں صرف اللہ تعالیٰ کی حکمرانی چلے گی اور یہ حکمرانی تم قائم کرو گے انشاء اللہ...... اس راستے کے تقدس کا اندازہ اس سے کرو کہ مصر اور افریقہ سے حج کو جانے والے مسلمان اسی راستے سے جاتے ہیں۔ یہ راستہ مسلمانوں کے لئے ہی نہیں عیسائیوں کے لئے بھی مقدس ہے۔ عیسائی اس راستے سے بیت المقدس آتے اور جاتے ہیں۔

یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا راستہ ہے۔ لیکن مصر میں ایک بادشاہ نے عیسائیت کا چہرہ مسخ کر ڈالا ہے اور اس نے اپنی عیسائیت بنا دی ہے اور یہ عیسائیت منوانے کے لئے اس نے سچی عیسائیت کے ماننے والے ہزاروں لوگوں کو قتل کیا ہے۔ ہم ان عیسائیوں کو ہرقل کی عیسائیت، بربریت اور ظلم و تشدد سے نجات دلانے آئے ہیں۔ اور زمین و آسماں ان مسلمانوں کی جرات، بے جگری، بامردی اور بے خوفی و حوصلے دیکھ کر گنگ رہ گئے۔ جو قلعہ ناقابل تسخیر سمجھا جاتا تھا مسلمانوں نے اس کی بلندیوں کو اپنے قدموں تلے روند ڈالا۔ قلعے کے دیوار و در اور گلیاں خون میں یوں رنگین تھیں جیسے آسمانوں سے خون کا مینہ برسا ہو۔"

اور آج میں اس مقام کے پہلو میں کھڑا تھا تو مجھے اپنے اردگرد چیخ و پکار اور آہ و فغا کا طوفان سنائی دے رہا تھا۔ فضا میں ثقیل ثقیل سی کسل مندی طاری کرنے والی لہو کی بو رچی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ میں حیران حیران سا اردگرد کا ماحول دیکھ رہا تھا۔ دو اطراف چٹانیں تھیں تو بائیں جانب تقریباً ایک فرلانگ کے فاصلے پر جنگلی جھاڑیوں اور خودرو پودوں کے جھنڈ دکھائی دیتے تھے۔ جن کی حد بندی ایک خشک ندی کرتی تھی جو گھومتی گھماتی جانے کدھر سے آتی تھی اور کدھر جاتی تھی۔

کسی دورِ گزشتہ میں اس ویرانے میں یہ وسیع ندی بڑی سحر انگیز اہمیت کی حامل رہی ہوگی مگر اس وقت وہ خشک پڑی تھی۔ اس کے دامن میں خودرو گھاس اور جنگلی جھاڑیاں اگ آئی تھیں اور اس کے دامن میں دراڑیں پڑی ہوئی تھیں۔ خشک، سوختہ تہہ پپڑیوں میں تقسیم ہوئی پڑی تھی۔ ندی کا نظارہ کر کے میرے ذہن

میں خود بخود ایک خستہ حال بڑھیا کا چہرہ ابھر آیا تھا جو صدیوں سے ایک ہی جگہ بے یار و مددگار کسی کی محبت کے زیر اثر راہ گزر میں بیٹھی اپنے محبوب کا انتظار کر رہی ہو اور موسموں کے تھپیڑوں سے اس کی حالت اثر انگیز صورت اختیار کر گئی ہو جس کا وجود جھریوں میں اس طرح چھپ گیا ہو کہ اس کا تمام بدن باریک دراڑوں میں منقسم ہوا معلوم ہوتا ہے۔

جو ہماری مطلوبہ جگہ تھی وہاں جگہ جگہ پر گڑھے کھدے ہوئے تھے۔ مٹی اور پتھروں کے ڈھیر بکھرے ہوئے تھے اور اس مقام سے کچھ دوری پر کچھ کھنڈرات کے آثار نظر آتے تھے مگر انہیں دیکھنے کا ابھی مجھے وقت نہیں ملا تھا۔ کسی نے اس ویرانے کو آباد کرنے کی کوشش کی ہوگی مگر نہ جانے ایسے کیا حالات رہے ہوں گے کہ وہ بنے بنائے مکان چھوڑ کر چلے گئے؟ اب وہی مکانات کھنڈرات میں بدل چکے تھے۔

تمام سامان اور مشینیں ارینج کرنے میں مجھے تقریباً ایک ماہ کی مدت لگی تھی۔ خیمے لگ چکے تھے۔ جنریٹرز مناسب جگہوں پر فٹ کر لئے گئے تھے۔ مشینیں چالو تھیں اور کام شروع ہو چکا تھا۔ آج ہی کام کا افتتاح ہوا تھا۔

شاید میں اس علاقے کا کبھی رخ نہیں کرتا مگر یوساف نے کچھ ایسے ایسے واقعات کا ذکر کیا تھا کہ مجھے تجسس میں ڈال دیا تھا اور تجسس کیسی بلا ہے یہ سبھی جانتے ہیں اور جن حضرات کا محبت سے واسطہ پڑا ہو وہ تو بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ تجسس کی اصل حقیقت کیا ہے اور یہ کیونکر راتوں کی نیندیں حرام کر دیتا ہے؟

تقریباً پچاس فٹ تک کھدائی ہو چکی تھی مزید ابھی جاری تھی مگر صورت حال کچھ ایسی تھی کہ جو اس زمین کی کوکھ کے بانجھ ہونے کی گواہی دے رہی تھی۔

ان دنوں سخت گرمی کے دن تھے۔ سورج سے بھی آگ برستی تھی اور زمین بھی حبس اگلتی تھی۔ شام کا اندھیرا پھیلتے ہی مشینیں روک دی گئیں اور کام بند کر دیا گیا۔ تمام مزدور ایک جانب خس کی بنی ہوئی صفوں پر ہلکا ہلکا پانی چھڑک کر ان پر جا بیٹھے اور آپس میں محو گفتگو ہو گئے۔ کھانا وغیرہ ہسپتال سے ہی تیار ہو کر آتا تھا۔ رات تقریباً نو بجے کے قریب میرا ملازم ''عبدل'' کھانا لے کر آ گیا۔ میری ''آلسٹن

سپون'' لانگ باڈی جیپ ان دنوں اسی کے استعمال میں تھی اور خوب مزے کر رہا تھا۔

کھلی فضا میں دریاں بچھا لی گئیں اور کھانا لگا دیا گیا۔ تمام مزدور چار چار ٹولیوں میں بیٹھے کھا رہے تھے۔ میں یوساف اور عبدل ایک طرف بیٹھے کھانا کھانے میں مصروف تھے۔ چاند آہستہ آہستہ بلند ہو رہا تھا اور حبس زدہ ماحول پر ٹھنڈک برسنے لگی تھی۔ کھانے کے بعد مخصوص مصری قہوے کا دور چلا تو میں نے یوساف کو مخاطب کیا۔

''یوساف......! وہ جو اس طرف کھنڈرات نظر آتے ہیں وہ کیسے ہیں......؟''

''وہ...... ان کے بارے میں جی میرے پاس کوئی ٹھوس معلومات نہیں۔ روایت در روایت سنا ہے کہ یہاں کبھی ایک عالی شان محل ہوا کرتا تھا۔ انتہائی خوب صورت، سحر انگیز اور قابل رشک۔ وہ مکمل سنگ مرمر کا تھا اور ایسا شفاف کہ شیشے کی مانند...... اس کے قریب جانے کی کسی کو اجازت نہیں ہوا کرتی تھی۔ ایک حبشی کے علاوہ اس محل کے آس پاس یا محل میں آتے جاتے کبھی کسی کو نہ دیکھا گیا تھا۔ وہ حبشی محل کی حفاظت پر مامور تھا۔

کہتے ہیں کہ اسے چوبیس گھنٹے پوری طرح چوکس پایا جاتا۔ وہ کسی جانور کو بھی محل کے قریب نہیں بھٹکنے دیتا تھا اور کسی بھوت کی مانند محل کے اطراف میں چکراتا رہتا تھا۔ دن میں سورج کی روشنی سے اس محل میں سے اس قدر چمک منعکس ہوتی کہ آنکھیں تاب نہ لا پاتیں؟ اور کہا جاتا ہے کہ اس کی تعمیر بھی بہت ہی حیران کن انداز میں ہوئی تھی۔

شام کا اندھیرا پھیلا تو یہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ رات گزری، دن کا سورج طلوع ہوا تو یہاں ایک عالی شان محل کھڑا تھا۔ لوگ خوفزدہ تھے، کسی کی بھی ہمت ہی نہ ہوئی کہ وہ محل کی جانب جاتا۔ اور جس پراسرار انداز میں یہ ایک ہی رات میں تعمیر ہوا تھا ایک وقت آیا کہ ٹھیک اسی طرح ایک ہی رات میں صدیوں پرانے کھنڈرات میں تبدیل ہو گیا۔''

یوساف نے بات مکمل کر لی تو میرا دل چاہا کہ اس احمق انسان کا گلا گھونٹ دوں مگر میں برداشت کر گیا۔ یہ بکواس کہانی قطعی مہمل اور لغویات کا پٹارہ تھی۔ مگر میں نے کوئی تبصرہ نہیں کیا اور خاموش ہو رہا۔

رات کو سب اپنی جگہ لیٹ گئے۔ صرف ایک آدمی کی ڈیوٹی تھی کہ وہ تمام رات جاگ کر نگرانی کرے اور اگر کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آئے تو وہ اپنے ساتھیوں کو جگا دے۔ گو کہ اس کی ضرورت نہیں تھی مگر پھر بھی مصلحتاً ایسا کیا گیا تھا۔

مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ میں منتظر تھا کہ کوئی غیر معمولی واقعہ رونما ہو۔ ذرا ذرا سی آہٹ پر میں چونک اٹھتا، رات آدھی سے زیادہ گزر گئی مگر میری توقع کے مطابق کچھ بھی نہ ہوا اور آخر کو رات کے کسی پہر میری آنکھ لگ گئی۔

بخیر و عافیت صبح ہو گئی۔ مشینوں کے انجن گرج اٹھے، پتھر کٹ رہے تھے، ریزہ ریزہ ہو رہے تھے اور جہاں سے پہلے ہی کھدائی تھی وہاں مزدور گہرائیوں میں اتر کر بیلچوں کی مدد سے مٹی کھود رہے تھے۔ جمع ہو جانے والی مٹی کو کرین کی مدد سے باہر نکال لیا جاتا تھا۔ سات دن اور چھ راتیں گزر گئیں نہ تو کھدائی کا کوئی نتیجہ نکلا اور نہ ہی رات کو کوئی پراسرار یا غیر معمولی واقعہ پیش آیا۔ اب مجھے یقین ہو چلا تھا کہ یا تو یوساف نے مجھ سے جھوٹ کہا تھا اور حقیقت چھپائی تھی یا پھر یہ لوگ وہم کا شکار ہوئے تھے۔

میں نے سوچ لیا تھا کہ ایک دو روز میں یہ فضول کی کھدائی بند کراؤں اور واپس ہو جاؤں مگر آنے والی ساتویں رات کو ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ مجھے اپنی یہ سوچ ترک کرنا پڑی۔ اتوار کا روز تھا۔ سارا دن جسم کو جھلسا دینے والی سلگتی ہوئی ہوا چلتی رہی۔ آخر دہکتا ہوا سورج مغرب کی جانب جھکتے جھکتے نیلی چٹانوں کے عقب میں اتر گیا۔ چٹانوں کے سائے لمبے ہو گئے اور ہم سائے کی پناہ میں آ گئے مگر ابھی سورج غروب نہ ہوا تھا کہ شمالی سمت سے سیاہ بادلوں کے ٹکڑے بلند ہوئے اور تیرتے ہوئے آہستہ آہستہ فضا میں پھیلنے لگے۔ یوں جیسے بلندیوں سے ہمارے گرد گھیرا ڈال رہے ہوں۔

دن بھر جو ہوا عذابِ جان بنی ہوئی تھی اور کھال جھلساتی رہی تھی۔اب وہی ہوا ایک بے خود کر دینے والی طاقت کا احساس دلانے لگی تھی۔

ویران بے آب و گیاہ اور پتھریلا علاقہ،آسمانوں پر پھیلے ہوئے سیاہ بادل، شفاف اور دھلی دھلی سی فرحت بخش ہوا۔ماحول بڑے ہی روح پرور نظاروں میں ڈھل گیا تھا۔

سورج غروب ہوتے ہی کام بند کر دیا گیا اور تمام مزدور روزمرہ کے معمول کے مطابق گپ بازی میں مصروف ہوگئے۔روزانہ کی مناسبت آج سب کے چہرے قدرے کھلے کھلے سے تھے۔شاید موسم کی اس معمولی سی تبدیلی کے باعث ایسا تھا۔

اندھیرا پھیل چکا تھا سو لیمپ روشن کر لئے گئے۔ٹھنڈی ہوا بدستور چل رہی تھی۔رات کھانے وغیرہ اور دیگر مصروفیات سے فارغ ہو کر میں بھی اپنی مخصوص جگہ پر دراز ہوگیا۔

مزدوروں کے ہنسی مذاق اور قہقہوں کی آوازیں میں کافی دیر تک سنتا رہا پھر آہستہ آہستہ سب خاموش ہوتے گئے۔مگر میں جاگ رہا تھا۔سبھی بغیر قنات کے خیمے کے نیچے سوتے تھے تاکہ اطراف سے تازہ ہوا آتی رہے۔

آسمان پر سیاہ بادل پھیلے ہوئے تھے کبھی کبھار چاند بادلوں کی اوٹ سے چہرہ نکال کر ہم زمین نشین انسانوں کو ایک نظر دیکھتا پھر فوراً ہی بادلوں کی سیاہ چادر چہرے پر اوڑھ لیتا اور ماحول پر اندھیرا چھا جاتا۔رات آہستہ آہستہ رینگتی رہی اور میں تاریک آسمان پر نظریں چپکائے اپنی جگہ لیٹا رہا۔سبھی مزدور دن بھر کی تھکان کے باعث اب نیند کے زیرِ اثر بے سدھ پڑے تھے۔

عبدل معمول کے مطابق دونالی رائفل اٹھائے جاگ رہا تھا۔وہ مجھ سے دائیں طرف تھوڑے فاصلے پر ایک پتھر پر بیٹھا ہوا تھا،رائفل اس کی گود میں پڑی تھی اور وہ مزے سے بیٹھا سگریٹ پھونک رہا تھا۔

رات نصف سے زیادہ گزر گئی تو مجھ پر ہلکی ہلکی غنودگی طاری ہونے لگی میں نے گردن گھما کر عبدل کی جانب دیکھا وہ چاک و چوبند نظر آ رہا تھا۔میں نے مطمئن

ہوکر دائیں جانب کروٹ لی اورآنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرنے لگا اور میرے دماغ پر مسلط غنودگی کی تہہ مزید گہری ہوتی چلی گئی۔

مجھے آنکھیں بند کئے زیادہ سے زیادہ دس منٹ ہوئے ہوں گے کہ ایک تیز نوکیلی نسوانی چیخ پرُسکون فضا کا پیٹ چیرتی ہوئی تاریک وسعتوں میں کہیں گم ہوگئی۔مجھ پر مسلط نیند کی دیوی شدید گھبراہٹ کے باعث ہڑبڑا کر کسی جانب پرواز کرگئی اور میرے اعصاب نیند کی غفلت انگیز کیفیت کی گرفت سے آزاد ہوگئے۔

آواز اس قدر تیز اور بلند تھی کہ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔میں نے مزدوروں پر نگاہ ڈالی میری طرح دو افراد اور بیدار چکے تھے۔ایک یوساف اور دوسرا ''ایکیلاس'' یہ وہ مزدور تھا جس نے اپنے بھائی پرکدال سے وار کیا تھا۔

عبدل رائفل اٹھائے اپنی جگہ کھڑا حیرت بھرے انداز میں ادھرادھر دیکھ رہا تھا۔اس سے پہلے کہ ہم ایک دوسرے سے کچھ دریافت کرتے وہ کرب ناک چیخ دوبارہ بلند ہوئی اور ہماری سماعتوں پر خراشیں ڈالتی ہوئی گزر گئی۔ چیخ کس سمت سے بلند ہوئی تھی میں اس کا تعین نہیں کر سکا تھا۔ میں نے بستر چھوڑا اور لپک کر عبدل کے قریب پہنچ گیا۔ چیخ سہہ بارہ بلند ہوئی اور پھر تو جیسے ذرے ذرے پر موت اتر پڑی۔آہ وفغاں کا ایک ایسا شور بلند ہوا کہ الامان۔

تمام مزدوروں میں ہلچل سی مچ گئی۔

''صاحب جی......!یہ...... یہ کیا ہو رہا ہے......؟'' عبدل نے بوکھلائے ہوئے انداز میں کہا۔بھلا میں اسے کیا بتاتا کہ کیا ہورہا ہے......؟

چیخنے والی صرف ایک عورت تھی مگر آواز اس قدر بلند اور تیز تھی جیسے سینکڑوں بدروحیں کسی بھوت کی لاش پر نوحہ کناں ہوں۔ ان چیخوں میں کچھ ایسی شدت،ایسا ہیجان تھا...... کچھ ایسا سوز وکرب تھا کہ میں نے ایسی اثر انگیز آواز پہلے کبھی کہیں نہ سنی تھی۔ بلاوجہ ہی اعصاب ایک بوجھل سنسنی کا شکار ہوئے جارہے تھے۔یوساف اور ایکیلاس بھی ہمارے قریب آپہنچے۔

''ڈاکٹر صاحب......!یہ...... یہ چیخیں آپ کو سنائی دے رہی ہیں ناں......؟ یہ

اسی پُراسرار دوشیزہ کی ہیں اور...... اور میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ یقیناً کوئی بدروح ہے۔''

''مگر یہ آوازیں آ کدھر سے رہی ہیں......؟'' میں نے اطراف میں نگاہیں دوڑائیں۔چیخیں بدستور بلند ہو رہی تھیں مگر آواز کی سمت کا کوئی تعین نہ ہو رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے ذرہ ذرہ زمین و آسماں، سنگِ و پربت ہر چیز سے چیخیں بلند ہو رہی ہوں...... جیسے بذات خود فضا رو رہی ہو۔پھر اچانک خاموشی پیدا ہوگئی اور چند لمحوں بعد ایک پُرسوز نسوانی صدا بلند ہوئی۔یوں لگا جیسے کوئی عورت آسمانوں کی جانب منہ اٹھائے پکار رہی ہو۔

''اے مقدس خلوتوں کے مکین......!

اے آسمانوں اور بحر و بر کو قابو میں رکھنے والے......!

اے پانیوں سے روحیں کشید کرنے والے......!

ہائے...... ہائے میری بدنصیبی......!

تو میری سنتا کیوں نہیں......؟

اے ٹھوس پتھروں میں ہوا کو مقید رکھنے والے......!''

اور پھر اچانک ماحول پر خاموشی مسلط ہوگئی۔مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ آواز پہلے بھی سن چکا ہوں؟ مگر کہاں یہ مجھے یاد نہیں آ رہا تھا۔میرے کانوں میں ہلکی ہلکی سائیں سائیں ہو رہی تھی۔ہم سب دوبارہ کوئی آواز سننے کے منتظر تھے مگر چاروں طرف خاموشی چھائی رہی۔

تمام مزدور ہمارے گرد آ جمع ہوئے تھے۔

''ڈاکٹر صاحب......! اب تو آپ کو میرے کہنے پر یقین آ گیا ہوگا......؟'' یوسف نے کہا۔

''کیسا یقین......؟ کس بات پر یقین یوسف......؟''

''یہی کہ یہ پرانے بھوتوں اور بدروحوں کا مسکن ہے۔''

''یوسف......! تمہارا دماغ تو خراب نہیں......؟ چند نسوانی چیخیں سنائی دیں تو

تم انہیں بدروحوں سے منسوب کر بیٹھے...... بہت کمزور دل کے مالک نکلے تم تو یوساف......!''

''نن......نہیں ڈاکٹر صاحب......!میں کمزور دل یا بزدل نہیں ہوں۔اوراگر میں کمزور دل ہوتا تو اب مزید ایک منٹ بھی یہاں نہ رکتا مگر میں تو کہیں بھی نہیں بھاگ رہا۔اب آپ جب تک کہو گے ہم یہیں آپ کے ساتھ ہیں۔''

''تو پھر یہ بدروحوں کی کیوں اڑا رہے ہو......؟ کیا مزدوروں کو خوفزدہ کرنا چاہتے ہو......؟''

''ڈاکٹر صاحب......! آپ خود غور کریں بھلا اس ویرانے میں اتنی رات گئے وہ بھی کسی عورت کا موجود ہونا کچھ خلافِ عقل بات نہیں اور...... اور پھر کیا یہ جو چیخ و پکار کی آواز تھی کتنی غیر فطری سی تھی انسانی آواز تو لگتی نہیں تھی۔''

''ختم کرو یوساف......!''میں نے بےزاری سے کہا۔

''اگر کوئی ہمیں نقصان پہنچانے کی کوشش کرے گا تو ہم اس کا بخوبی بندوبست کرلیں گے۔ورنہ چاہے سینکڑوں بدروحیں اردگرد منڈلاتی رہیں ہمیں خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔'' میں نے مزدوروں کا ڈر دور کرنے کے لئے کہہ دیا تھا حالانکہ خود میری اپنی ذہنی حالت نہایت دگرگوں تھی۔

پھر ہم سب اپنی اپنی جگہ واپس آگئے۔تھوڑی دیر بعد ہی یوساف میرے قریب آ گیا۔

''اب کیا ہوا......؟''

''ڈاکٹر صاحب......!میرا خیال ہے کہ کسی قدیم زبانوں کے جاننے والے شخص کو اب چند روز ہمارے درمیان رہنا چاہئے۔کیونکہ یہ چیخیں دوبارہ پھر سنائی دیں گی۔اس طرح کم از کم ہمیں یہ تو معلوم ہو جائے گا کہ یہ عورت بہ بانگ بلند پکارتی کیا ہے......؟ شاید اس طرح یہ معاملہ سمجھ میں آجائے۔''

میں نے حیرت سے یوساف کی طرف دیکھا۔

''یوساف......! کیا تمہیں سمجھ نہیں آئی......؟''

وہ دانت نکال کر بولا۔

''ڈاکٹر صاحب......! یہ تو قدیم ترین زبان میں کسی کو پکار رہی تھی۔ بھلا کیسے سمجھ آتا......؟'' اور میں حیران نظروں سے اسے گھورنے لگا چند اور مزدوروں سے تصدیق کی گئی مگر وہ الفاظ کسی کی بھی سمجھ میں نہیں آئے تھے۔ یوساف اپنی جگہ واپس چلا گیا اور میں حیرت سے سوچنے لگا کہ میری سمجھ میں کس طرح آ گئے......؟

زبان تو واقعی ہی قدیم تھی۔ قدیم ترین مصری زبان اور جو وہ پکار رہی تھی وہ الفاظ میری سمجھ میں بھی نہ آئے تھے مگر ان کا مفہوم خود بخود میری سمجھ میں آ گیا تھا۔ بھلا یہ کیا کرشمہ تھا؟ میں بہت دیر تک انہی سوچوں میں غلطاں و پیچاں رہا مگر میری عقل میں کچھ نہیں آیا، آخر کو میں سو گیا۔

☆☆☆

سورج سروں کے عین اوپر معلق تھا۔ اس کے باوجود حدت میں کمی تھی کیونکہ کل سے بدستور سیاہ بادل چاروں طرف یوں منڈلاتے پھر رہے تھے جیسے اردگرد کے علاقے کا سروے کرتے پھر رہے ہوں۔

ہوا بھی بدستور جاری تھی۔ کبھی کوئی بادل کا ٹکڑا سینہ تان کر سورج کے سامنے ڈٹ جاتا تو ایک خوشگوار سایہ پورے علاقے کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا۔ مگر جلد ہی شاہ خاور اسے تھپکی دے کر ایک طرف ہٹا دیتا۔

تمام مزدور کھدائی میں لگے تھے۔ یوساف ان کے درمیان چکراتا پھر رہا تھا اور میں طمبو کے نیچے تنہا بیٹھا تھا۔ میں جانتا تھا یہ کھدائی بہت ہے یہاں سے کچھ برآمد ہونے والا نہیں، مزدور بھی عجیب بددلی سے اپنا کام مکمل کر رہے تھے۔ شاید انہیں بھی اندازہ تھا کہ یہ کھدائی فضول ہے۔ تقریباً سو فٹ تک کھدائی کی جا چکی تھی۔ اگر کچھ نکلنا ہوتا تو اب تک کچھ نہ کچھ تو ضرور نکل چکا ہوگا، مگر انہیں مزدوری کرنی تھی، انہیں آمدنی سے غرض تھی۔ سو وہ بلا چوں چراں حکم کی تعمیل میں لگے ہوئے تھے۔

تین دن مزید گزر گئے کوئی غیر معمولی واقعہ رونما نہیں ہوا اور نہ کھدائی کا کوئی

نتیجہ سامنے آیا۔ راتیں بھی پرسکون گزر رہی تھیں۔ دوبارہ وہ نسوانی چیخ و پکار بھی سنائی نہ دی تھی۔ مگر چوتھی رات ایک اور عجیب و غریب واقعہ پیش آیا۔

رات کھانے کے بعد میں نے یوساف سے کہہ دیا کہ صبح ہماری واپسی ہوگی۔ لہٰذا مزدوروں سے کہہ دو اور یوساف نے تمام مزدوروں کو آگاہ کر دیا کہ صبح سے کام ختم اور ہم واپس جائیں گے۔

رات کا آخری پہر تھا تمام مزدور خواب غفلت کی حالت میں اپنے آپ سے بھی غافل ہوئے پڑے تھے۔ میں بھی گہری نیند میں تھا کہ اپنے کندھے پر ایک سخت گرفت محسوس کرتے ہوئے میری آنکھ کھلی عبدل میرا کندھا ہلا رہا تھا اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔

"صاحب جی......! صاحب جی......! اٹھیں......!"

"کوئی خطرہ......؟" میرے ذہن میں جھماکا ہوا اور میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

"کیا ہوا......؟ کیا بات ہے......؟"

"صاحب جی......! ادھر...... ادھر دیکھیں......!" میں نے عبدل کے اشارے کا تعاقب کیا اور چونک پڑا۔ ایک انسانی ہیولہ......؟

جہاں کھدائی ہو رہی تھی وہاں سے تقریباً نصف فرلانگ شمال کی جانب ایک انسانی ہیولہ دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے ارد گرد نگاہ ڈالی میرے اور عبدل کے علاوہ سبھی سو رہے تھے۔ پانچ چھ روز سے مسلسل موسم ابر آلود ہو رہا تھا جس کے باعث چاروں طرف گاڑھا اندھیرا چھایا ہوا تھا مگر اس کے باوجود وہ ہیولہ واضح دکھائی دے رہا تھا، بلکہ یہ بھی معلوم ہو رہا تھا کہ وہ کوئی مرد نہیں بلکہ عورت ہے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ فاسفورس کے سیال سے وضو کر کے آ رہی ہو۔ وہ ایک مخصوص جگہ دائرے کی صورت چکرا رہی تھی اور اس کے اس انداز سے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ انتہائی اضطراب و کرب میں مبتلا ہو۔

"صاحب جی......! یہ کون ہے......؟"

"جو بھی ہے میری رشتہ دار نہیں ہے۔" عبدل کے اس فضول سوال نے مجھے

غصہ دلا دیا تھا۔ میرے جواب پر وہ جھینپ کر خاموش ہو گیا۔

وہ اپنی جگہ رک گئی۔ اس کا کھڑے ہونے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ اپنے قدموں کی جانب کسی چیز کو بغور دیکھ رہی ہے اور میں گہری نظروں سے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس دوران میرے ذہن میں بڑی شدت سے یہ خیال ابھر رہا تھا کہ مجھے واپس نہیں جانا چاہئے...... واپس نہیں جانا چاہئے۔

پھر یکا یک وہ جہاں کھڑی تھی وہیں بیٹھ گئی۔ پھر گھٹنوں کے بل جھک گئی اور یوں زمین تھپتھپانے لگی جیسے دستک دے رہی ہو۔ پھر وہ سجدے کی سی حالت میں چلی گئی اور میری سماعت سے بہت ہلکی ہلکی آواز ٹکرانے لگی۔ اور میں ہمہ تن گوش ہو گیا۔ وہی خلاف فہم زبان مگر قابل فہم مفہوم! اور وہی نسوانی آواز۔

''مریاقس...... !مریاقس...... مریاقس کیا تم میری آواز سن رہی ہو......؟''

''اے عالی مرتبت مریاقس مجھے جواب دو......!''

''صاحب جی...... !کیا یہ نماز پڑھ رہی ہے......؟'' عبدل کی آواز نے میری توجہ اپنی جانب مبذول کرا لی اور آواز کا وہ ہلکا ہلکا ارتعاش میری سماعت سے دور ہو گیا۔

''کیا تم اپنی چونچ کچھ دیر کے لئے بند نہیں رکھ سکتے......؟'' میں نے غضیلے لہجے میں کہا۔

''میں تو یہ سوچ رہا تھا کہ یہ مشرق کی سمت سجدہ کیوں کر رہی ہے......؟''

وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی میں عبدل کی سنی ان سنی کر کے دوبارہ اس کی جانب متوجہ ہو گیا وہ کچھ دیر مضطربانہ انداز میں کھڑی رہی پھر وہ ایک جانب جھکی اور میں نے دیکھا کہ اس نے کدال اٹھا لی ہے۔ ایک تیز ہوا کے جھونکے نے ہمارے عقب سے پرواز کی اور ہمیں چھوتا ہوا برق رفتار سے پُراسرار عورت کی جانب پرواز کر گیا۔

اس نے کدال سر سے بلند کی اور پہلی ضرب دھرتی کے سینے پر لگائی۔ ضرب اس قدر شدید اور وحشت بھری تھی کہ فضائیں چنگاڑ اٹھیں۔ چاروں طرف سے آسمانی بجلیاں بادلوں کے سینے فگار کرتی ہوئیں اس کی جانب لپکیں۔ مگر کسی انجانے خوف

کے زیرِ تحت اسی طرح چنگاڑتی واپس انہیں بلندیوں میں گم ہوگئیں۔ جدھر سے ظاہر ہوئی تھیں۔اور پوری زمین لرز کر رہ گئی۔

ایک تیز ہوا کے جھونکے نے اس کے کپڑوں کو جھنجوڑ ڈالا۔اس کے چہرے پر پڑا ہوا سفید باریک ریشمی نقاب کھل کر ایک جانب جھولنے لگا۔

دوسری ضرب پر تیز ہوا مزید تیز تر ہوگئی۔مٹی اڑنے لگی اور اڑ اڑ کر ہم پر برسنے لگی۔وہ جنونی انداز میں کدال چلا رہی تھی اور کچھ ایسی تیزی دکھا رہی تھی جیسے رات ہی رات میں پاتال کی گہرائیوں میں اتر جانے کا مصمم ارادہ کر چکی ہو۔رہ رہ کر بجلیاں کڑک رہی تھیں۔اسے منع کر رہی تھیں،مگر وہ موسم و ماحول کی غضب ناکیوں سے لاپرواہ کھدائی میں مگن تھی۔ایک ایک کر کے تمام مزدور بھی بیدار ہوتے جا رہے تھے۔

بادل بھی اپنی پُرجلال اور ہیبت ناک آواز میں اسے وارننگ دے رہے تھے، مگراس پر کسی چیز کا کوئی اثر نہ تھا۔میں نے عبدل کے بیلٹ سے ٹارچ کھینچی پھر اس کے ہاتھ سے رائفل جھپٹی اور اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

''صاحب جی......! صاحب جی......! کہاں جا رہے ہیں آپ......؟''

''یہیں رکو......! خبردار میرے پیچھے کوئی نہ آئے۔'' اور پھر میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اس شوریدہ سر عورت کی جانب بڑھنے لگا۔عبدل عقب سے مجھے آوازیں دے رہا تھا،مگر میں نے اپنی رفتار مزید تیز کر دی۔بات وہی تھی یہ تجسس کم بخت چیز ہی بڑی نامراد ہے۔

میں لحہ بہ لحہ اس کے قریب تر ہوتا گیا۔اور پھر اچانک وہ ٹھٹک کر رک گئی۔وارننگ دینے کے بعد اب بادل نے شاید حملے کی سوچی تھی جو ہلکی ہلکی بارش شروع ہوگئی تھی۔اس نے سر اٹھا کر آسمان کی جانب دیکھا چند لمحے قہر بار عالم میں دیکھتی رہی پھر میری جانب دیکھنے لگی۔میں مزید اس کے قریب پہنچ چکا تھا۔پھر جب وہ میری جانب گھومی تو گویا دستِ حیرت نے میرے پورے وجود کو اپنی قوی گرفت میں جکڑ لیا۔میں جہاں تھا وہیں ٹھٹک کر رک گیا اور شدید حیرت سے پھٹی پھٹی

آنکھوں سے ایک ٹک اس کے دہکتے ہوئے چہرے کو دیکھے گیا۔

وہ سراپا...... وہ صورت میرے لئے اجنبی تو نہ تھی۔اسے پہچانتے ہی جیسے میری سانس میرے حلق میں اٹک کر رہ گئی۔ پھراچانک ہی وہ پلٹی، کدال اس نے کندھے پر رکھی اور ڈری ہوئی ہرنی کے مصداق چوکڑیاں بھرتی ہوئی مخالف سمت دوڑ پڑی۔

''اے......اے......اے سنو......!''

اس کے دوڑتے ہی اچانک بارش میں بھی تیزی آگئی۔ میں نے ٹارچ روشن کر لی۔میرے دائیں ہاتھ میں لوؤڈ رائفل تھی اور بائیں میں ٹارچ اور میں اندھا دھند اس پری جمال دوشیزہ کے پیچھے دوڑ رہا تھا۔بجلی چمکتی تو دور دور تک روشنی پھیل جاتی۔

اس کا رخ منہدم محل کے کھنڈرات کی جانب تھا۔جدھر دن کی روشنی میں بھی کوئی جانا پسند نہیں کرتا تھا۔رہ رہ کر بادل گرج رہے تھے، بارش مزید تیز ہوگئی تھی۔گہری تاریکی، طوفانی بارش کی مخصوص آواز بادلوں کی دل دہلا دینے والی گرج، اور بجلی کی اعصاب چٹخا دینے والی چنگاڑیں؟ان سب چیزوں نے مل کر ماحول کو بڑی ہی ہیبت اور دہشت ناک صورت دے دی تھی۔مگر میں خوف زدہ ہوکررکا نہیں بلکہ اس کے تعاقب میں دوڑتا رہا۔مگر وہ نازک اندام سی دوشیزہ لحہ بہ لحہ مجھ سے دورہوتی جا رہی تھی۔میں مسلسل اسے رک جانے کے لئے کہہ رہا تھا مگر میری آوازوں کا اس پرکوئی اثر نہ ہو رہا تھا۔

اورتو اور وہ کھنڈرات جو دیکھنے میں بالکل نزدیک ہی دکھائی دیتے تھے،وہ آنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ہم کافی دیر تک دوڑتے رہے، میں اس کے کافی پیچھے رہ گیا اوروہ کھنڈرات کی حدود میں داخل ہوگئی۔بجلی پوری قوت سے چمکی۔ ہر طرف تیز سفید روشنی پھیل گئی۔اوراس تیز روشنی میں ہی میں نے اسے ایک دیوار کے شگاف میں غائب ہوتے دیکھا تھا۔

میری سانس بری طرح پھول چکی تھی اور میرا سینہ اس قدر شدت سے دھا.

پچک رہا تھا جیسے ایک زوردار دھماکے سے چیتھڑوں میں بدل جائے گا۔ میں لڑکھڑاتے قدموں سے اس دیوار کے ساتھ جا لگا۔ دیوار کا سہارا لے کر میں نے چند لمبے سانس درست کی پھر میں بھی اس شگاف کے ذریعے اندر داخل ہوگیا۔

چند قدم کے فاصلے پر اصل عمارت کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔ غالباً جس جگہ میں کھڑا تھا کسی وقت یہ اس محل کا عقبی حصہ رہا ہوگا جبکہ اب تو اس کی کوئی شناخت ہی نہ رہ گئی تھی۔ وہ ان کھنڈرات میں کہیں گم ہوگئی تھی اور اب موسم کی غضب ناکیوں میں بھی کمی واقع ہوگئی تھی، بارش بھی تقریباً تھم چکی تھی۔

میں ٹارچ کی زرد بیمار، روشنی میں آگے بڑھنے لگا۔ ساتھ کے ساتھ بلند آواز میں اسے پکار رہا تھا۔

''اے معزز خاتون......! میرے سامنے آیئے......!'' مگر کوئی جواب نہیں مل رہا تھا۔

''دیکھئے...... گھبرایئے مت...... میں آپ سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ ہو سکتا ہے میں آپ کے کام آسکوں...... آپ کو میری مدد کی ضرورت ہے۔'' مگر صد ابصحرا ہنوز خاموشی رہی تو میں بھی خاموشی سے آگے بڑھنے لگا۔

یقیناً کسی وقت یہ محل بہت عالی شان اور خوبصورت رہا ہوگا، مگر اس وقت تو اس کے در و دیوار خود آپ اپنی حالت پر نوحہ کناں تھے۔ دیواریں منہدم، چھتیں غائب، فرش میں دراڑیں، جگہ جگہ پتھروں، سنگ مرمر کی اینٹوں اور ملبے کے ڈھیر، دیواروں میں جگہ جگہ شگاف، راہ داریوں سے چھتیں آ گری تھیں۔

مجھے تو یوں لگ رہا تھا اگر میں نے زور سے سانس بھی لی تو دیواریں میرے اوپر آگریں گی۔ پاؤں زور سے کہیں پڑ گیا تو پاؤں کی آہٹ کی دھمک سے دیواریں جھک کر مجھ سمیت میرے پاؤں بھی چوم لیں گی اور میں چرمر ہو کر رہ جاؤں گا۔

علاوہ ازیں ایک بے نام سا احساس میرے لاشعور کے اندھیروں میں کسمسا رہا تھا۔ میں ایک عجیب سی بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ میں نے اپنے ذہن کو کریدا تو چونک پڑا یہ کھنڈرات، یہ جگہ میں پہلی بار تو نہ دیکھ رہا تھا...... یہ تو...... یہ تو...... میں

تو پہلے بھی یہاں آچکا تھا...... یہ تو...... عدلان پاشا کا محل تھا۔

وہی محل جہاں کہ تھوڑا عرصہ ہی پہلے میں عدلان پاشا کے پہلو بہ پہلو بیٹھ کر ایک دعوت کے مزے اڑا چکا تھا......اور...... اور شاید وہ دوشیزہ بھی اسی لئے دوڑ کر یہاں آئی تھی کہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ یہیں اسی محل میں تو قیام پذیر تھی۔اور اسے پہچاننے میں بھی مجھ سے کوئی غلطی نہ ہوئی تھی، وہ وہی کمسن دوشیزہ آنا آطو تھی جس سے ہسپتال میں میری ایک ملاقات ہو چکی تھی۔مگر بقول یوساف کے یہ کھنڈرات جانے کب سے یونہی کھنڈرات تھے۔

''یاالٰہی......! یہ کیا گورکھ دھندہ ہے......؟''میں بری طرح الجھ کر رہ گیا تھا۔اور حقیقتاً اب مجھے خوف محسوس ہونے لگا تھا۔

میں جہاں کھڑا تھا ایک بغیر چھت اور دروازے کا کمرہ تھا۔جس کی عقبی دیوار میں دو بڑے بڑے شگاف پڑے ہوئے تھے، بغلی دیوار تھی ہی نہیں۔ٹارچ میرے ہاتھ میں تھی اور رائفل میرے کندھے کے ساتھ جھول رہی تھی۔اب میں جلد سے جلد اس شیطان نگری سے نکل جانا چاہتا تھا کہ اچانک ایک تیز پھڑ پھڑاہٹ کی آواز پر میں اچھل پڑا۔میں نے ٹارچ کی روشنی چاروں طرف پھینکی مگر کچھ دکھائی نہ دیا۔

اور پھر بالکل اچانک ہی ایک بھاری اور گونج دار آواز ابھری۔

''ڈاکٹر شکیل ظفر......!شکیل ظفر......!شکیل ظفر......!''

''کک...... کک...... کون......؟''

''تم فوراً واپس چلے جاؤ ڈاکٹر...... ڈاکٹر...... ڈاکٹر......!''

میں نے فوراً آواز پہچان لی۔

''عدلان پاشا......!یہ تم ہو......؟''

''تم نے ٹھیک پہچانا ڈاکٹر...... ڈاکٹر......ڈاکٹر......!مگر میرا اصل نام عدلان پاشا نہیں بلکہ وتمیرا طوس ہے۔''

''وتمیرا طوس......!''میں زیر لب بڑبڑایا۔

''چلو تمیرا طوس ہی سہی مگر میرے سامنے آؤ...... کہاں چھپے ہوئے ہو......؟

مجھے بتاؤ یہ سب طلسم کیا ہے......؟''

''ڈاکٹر......!میں موت کی تاریکیوں میں چھپا ہوں،مجھ سے ملاقات کے لئے تمہیں بھی تاریکیوں میں آنا پڑے گا۔بہتر یہی ہے کہ فوراً واپس لوٹ جاؤ۔تمہاری زندگی بہت اہمیت کی حامل ہے۔''

''آں...... ہاں ہاں......! میں جا رہا ہوں......مم...... میں جا رہا ہوں۔''

یہاں کا ماحول میرے اعصاب پر کچھ ایسا اثر انداز ہوا کہ میں حواس باختہ ہو کر بھاگ نکلا۔باہر کا موسم ایک دم بدل چکا تھا۔چاند نکلا ہوا تھا اور آسمان کی آغوش میں لاکھوں کروڑوں ستارے مسکرا رہے تھے،کھنڈرات سے کچھ دور جاتے ہی مجھے کچھ حوصلہ ہوا کیونکہ تقریباً پندرہ بیس مزدور، یوساف اور عبدل میری تلاش میں ادھر ہی آ رہے تھے۔

''ڈاکٹر صاحب......! سب خیریت تو ہے ناں......؟'' یوساف نے فوراً آگے بڑھ کر کہا۔

میں کافی حد تک اپنے بکھرے ہوئے حواس پر قابو پا چکا تھا۔

''ہاں......نکل گئی، نامعلوم کہاں گم ہوگئی۔'' میں نے گھمبیر لہجے میں کہا اور یوساف مجھے عجیب سی نظروں سے گھورتے ہوئے خاموش ہو رہا۔اب اصل حقیقت کیا تھی یہ بتا کر میں اپنا مذاق بنوانا تو پسند نہیں کر سکتا تھا۔کیونکہ ظاہر ہے کسی نے میری بات کا یقین ہی نہیں کرنا تھا۔واپس پہنچتے پہنچتے صبح کی سفیدی نمودار ہونے لگی اور صبح کا موسم بڑا دلکش ہوگیا تھا۔کچھ بارش کا اثر تھا کچھ شمیم صبح۔صاف اور دھلی ہوا۔

واپس پہنچتے ہی میں نے عبدل کو کھانا لانے کے لئے بھیج دیا۔میں نے اس جگہ کا جائزہ بھی لیا جہاں رات وہ کھدائی کرتی رہی تھی وہاں ایک چھوٹا سا گڑھا نظر آ رہا تھا۔جو بارش کے پانی سے لبالب بھرا ہوا تھا۔

میرا ذہن بری طرح الجھ کر رہ گیا تھا۔اس تمام کہانی کا کوئی سرا ہاتھ نہ آ رہا تھا،کوئی کڑی بھی آپس میں نہ ملتی تھی۔اور میں جتنا اس کو سلجھانے کی کوشش کر رہا تھا یہ سارا معاملہ اتنا ہی الجھ رہا تھا۔میرا حال شاعر کے اس شعر کے جیسا ہو رہا تھا۔

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں
ڈور کو سلجھا رہا ہے اور سرا ملتا نہیں

یہ بات بھی بری طرح ذہن میں کھٹک رہی تھی کہ یہاں کھدائی کیوں کر رہی تھی؟

یہاں سے کھدائی بند کر دی گئی۔تمام اوزار اور ضرورت کا سامان اورتمام مشینری نصف فرلانگ شمال کی جانب منتقل کر دی گئی اور جس مقام پر رات وہ کھدائی کر رہی تھی ٹھیک اس مقام پرکھدائی شروع کر دی گئی۔تھوڑے فاصلے پر ہی خیمے لگا دیئے گئے کھانا وغیرہ کھا کرعبدل تو جا سویا اورتمام مزدورکھدائی میں مصروف ہو گئے۔

دن رات یوں گزرنے لگے کہ پتہ ہی نہ چلا۔نہ کوئی پُراسرار غیرمعمولی واقعہ پیش آیا۔جدید ترین مشینری کی مدد سے کھدائی اور مسلسل ایک محدود مقام پر تقریباً گیارہ دن کی محنت سے مزدورزمین سے ستر فٹ کی گہرائی تک جا اترے۔

نہ جانے مجھے ایک یقین سا کیوں تھا کہ یہاں کی زمین کے شکم سے لازمی طور پر کچھ نہ کچھ برآمد ضرور ہوگا۔

وہ ایک جلتی ہوئی دوپہرتھی۔زمین بھی تپ رہی تھی،ہوا بالکل بند تھی۔تمام مزدوراس قہربار عالم میں بھی کھدائی میں مگن تھے۔یوساف میرے قریب ہی طنبو میں بیٹھا تھا،کہنے لگا۔

''ڈاکٹر صاحب......! کھدائی کا ابھی تک کوئی نتیجہ نہیں نکلا مگر جانے کیوں دل کہتا ہے یہاں سے یقیناً کوئی حوصلہ افزا نتیجہ ہی نکلے گا۔''

''اس کی کیا کوئی خاص وجہ......؟''

''ڈاکٹر صاحب......! جہاں ہم پہلے کھدائی کر رہے تھے، وہاں بہت عجیب عجیب واقعات ہوئے آپ کے آنے کے بعد بھی۔مگرآپ کے آنے سے پہلے تو انتہا ہوگئی تھی۔رات کو اکثر ہمیں آواز آتی،کوئی عورت کہتی تھی کہ تم یہ غلط کر رہے ہو، یہ کھدائی عبث ہے تمہاری کوشش رائیگاں جائے گی۔اور جب ہم نے کوئی نوٹس نہ لیا تو عجیب وغریب واقعات رونما ہونے شروع ہوگئے۔یہاں تک کہ ایکیلااس نے بے

خود ہو کر اپنے بھائی کو جان سے مار ڈالنے کی کوشش کی۔

اس وقت تو ان لفظوں کا مفہوم میں نہ سمجھ پاتا تھا مگر اب کچھ کچھ سمجھ میں آتا ہے۔''

''مثلاً.....؟''

''مثلاً یہ کہ ان الفاظ کا مطلب یہ تھا کہ ہم غلط جگہ کھدائی کر رہے ہیں اس لئے ہماری کوشش رائیگاں جائے گی۔ ہماری یہ کھدائی بیکار ہے۔اصل میں یہ ہماری رہنمائی کی جا رہی تھی مگر ہم سمجھ ہی نہ پائے اور دیکھ لیں جس روز سے ہم نے یہاں کھدائی شروع کی کتنا سکون ہے،کوئی بھی پریشان کن واقعہ پیش نہیں آیا۔''

''اس سے پہلے کہ میں اسے کوئی جواب دیتا پسینے اور مٹی میں ملفوف اکیلا اس ہماری جانب دوڑتا ہوا آیا۔

''صاحب جی.....!صاحب جی.....! اور..... او..... ادھر کچھ ہے صاحب جی.....!''

اور ہم دونوں تڑپ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔پھر ہم تیزی سے اس کے ساتھ چلتے ہوئے اس جگہ پہنچ گئے جہاں دائرے کی صورت میں تقریباً پچاس فٹ قطر کا پچھتر فٹ گہرا کنواں کھدا ہوا تھا، اس کنوئیں میں پینتالیس مزدور موجود تھے گہرائی اس قدر تھی کہ عموماً سارا دن گہرائی تک سورج کی دھوپ نہ پہنچ پاتی تھی۔اس وقت چونکہ سورج بالکل سر پر تھا اس لئے کنوئیں میں دھوپ سیدھی اتر رہی تھی۔اس کے باوجود آدھے کنوئیں میں چھاؤں تھی۔

''کیا بات ہے.....؟ کیا کچھ ہے یہاں.....؟''یوساف کنوئیں میں جھانکتے ہوئے بآواز بلند بولا۔

''صاحب.....!نیچے پتھریلی زمین آگئی ہے۔یوں لگتا ہے جیسے نیچے پختہ فرش یا کوئی بڑی چٹان ہو۔''

''ایسا کرو دریشی کر کے نرم مٹی کی تہہ اوپر سے ہٹا لو اور اس پتھریلی سطح کو ابھار لو۔''یوساف کی ہدایت کے مطابق تمام مزدور حرکت میں آگئے اور ہم پلٹ کر

واپس خیمے کی جانب آگئے۔ ایکیلاس کو ہم نے وہیں کھڑا رہنے کے لئے کہہ دیا تھا۔ایک ہیجان خیز تجسس رگ و پے میں کھلبلی مچائے ہوئے تھا کہ جانے نیچے کیا پُراسرار چیز نکلے گی۔تقریباً دو گھنٹے کے بعد ایکیلاس پلٹ کر ہماری جانب آنے لگا تو ہم خود ہی اٹھ کھڑے ہوگئے۔ ہیٹ ہم نے سروں پر جمائے اور آگے بڑھ گئے۔

''صاحب جی......! پتھر سا ہے۔'' ہمارے قریب پہنچتے ہی ایکیلاس بولا۔

ہم نے آگے بڑھ کر کنوئیں میں جھانکا۔کنوئیں کے عین وسط میں ایک سیاہ گنبد نما گول چٹان نظر آ رہی تھی جس کی اونچائی دس فٹ اور حجم میں بھی وہ تقریباً اتنی ہی رہی ہوگی۔ ہم نے سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کی جانب دیکھا تو نیچے سے ایک مزدور بآواز بلند بولا۔

''صاحب......! یہ تو ٹھوس چٹان ہے۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے ایک وسیع پہاڑی سلسلہ نیچے ہی نیچے پھیلا ہوا ہو......؟'' اور ہمارے چہرے اتر گئے۔

''ساری محنت لاحاصل...... کھودا کنواں...... نکلے پہاڑ۔'' یوساف نے بددلی سے کہا۔

''ایسا کرو اس چٹان کے گرداگرد خندق کھودو اور اسے ابھارتے رہو۔'' اور پھر ہم واپس طنبو کے نیچے آ بیٹھے۔

طبیعت پر سوگواریت سی طاری ہوگئی تھی مگر یہ سوگواریت ہماری حماقت تھی۔اس کا اندازہ ہمیں اس وقت ہوا جب تقریباً تین گھنٹے بعد ایکیلاس دوبارہ آیا۔

''کیا بات ہے......؟ کیا ایک چٹان اور نمودار ہوگئی......؟'' یوساف نے کہا۔

''نہیں صاحب جی......! چٹان تو وہی ہے مگر...... اس پر بکرے بیٹھے ہوئے ہیں۔''

''ایں...... بکرے...... زمین کے نیچے کہاں سے آگئے......؟''

''نن...... نن...... نہیں صاحب جی......! وہ بکرے نہیں...... بکروں کی تصویریں ہیں چٹان پر۔''

اور میں چونک پڑا۔ میں نے یوساف کی طرف دیکھا اور پھر ہم دونوں ہی

تیزی سے کنوئیں کی جانب بڑھ گئے۔

چٹان اب بہت واضح ہو چکی تھی۔وہ اونچائی اور حجم میں اب تقریباً بیس فٹ ہو چکی تھی۔ کچھ مزدور مزید کھدائی کر رہے تھے اور کچھ آہنی برشز کے ذریعے بااحتیاط چٹان پر جمی ہوئی مٹی اتار رہے تھے۔ہم کنکریٹ لفٹ کے ذریعے کنویں میں اتر گئے۔اب کنوئیں میں مکمل چھاؤں تھی۔ مگر کنوئیں میں وسیع تر وسعت کے باعث اندھیرا بالکل نہ تھا۔ہم چٹان کے بالکل سامنے جا پہنچے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے دفن کرنے کی غرض سے یہ سیاہ فام چٹان ازخود اتار کر اس کنوئیں کے وسط میں سجا دی گئی ہو۔

اس چٹان کا جو حصہ اب زمین سے برآمد ہونے لگا تھا وہ اوپری حصہ سے قطعی مختلف تھا۔اس چٹان کے پتھریلے وجود میں بھی نمایاں فرق نظر آ رہا تھا۔یوں معلوم ہوتا تھا جیسے نچلے حصے کے اوپر ایک قدرتی چٹان رکھ کر اسے چھپانے کی کوشش کی گئی ہو۔کھدائی کے بعد نیچے والی چٹان کا جو حصہ اب واضح ہوا تھا اس پر واقعی کچھ واضح شکلیں بنی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔میں گھٹنوں کے بل بیٹھ کر انہیں بغور دیکھنے لگا،یوساف بھی میرے قریب ہی تھا۔

اس چٹان کو تراش کر مختلف النوع جانوروں کی تصویریں بنائی گئی تھیں۔جن میں پرندے بھی شامل تھے۔اور ان میں زیادہ تعداد اُلوؤں،کوؤں اور چغدوں کی تھی۔باقی کچھ ایسے پرندے تھے جو آج تک کم از کم میری نظروں سے تو نہیں گزرے تھے۔یہ عجیب وغریب سی تصویریں اس چٹان کے چاروں اطراف کھدی ہوئی تھیں۔ان تصویروں اور نقش و نگار کو دیکھ کر ذہن میں قدیم مصری سنگ تراشوں اور مصوروں کا خیال اجاگر ہوتا تھا۔

''ڈاکٹر صاحب......!یہ تو...... یہ تو کوئی اہرام معلوم ہوتا ہے۔'' فرط انبساط اور حیرت سے یوساف کی آواز کپکپا رہی تھی۔میں نے چونک کر اس کی جانب دیکھا اس کے چہرے کے خدوخال نہایت سنسنی خیز کیفیت کا شکار تھے اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے نچلی چٹان کو دیکھ رہا تھا۔

میں نے حیران کن لہجے میں کہا۔

''ذرا غور تو کریں اس نچلی چٹان کو تو دیکھیں۔میری ساری زندگی ویرانوں، پہاڑوں میں کھدائی کرتے کرواتے گزر گئی ہے۔میرا تجربہ ہے ڈاکٹر صاحب......! یہ اوپر کی اور نچلی چٹان بالکل مختلف ہیں۔اور...... اور اگر میں غلط فہمی کا شکار نہیں...... میرا دماغ صحیح کام کر رہا ہے تو میں دعوے سے کہتا ہوں کہ یہ نچلی چٹان وہی ہے، یہ وہی پتھر ہیں جو ہزاروں سال قبل اہراموں کی تعمیر میں استعمال کئے گئے ہیں۔''

''تم یہ بات اتنے دعوے سے کیسے کہہ سکتے ہو......؟''

''ڈاکٹر صاحب......!میری ساری زندگی انہی پہاڑوں، پتھروں میں بھٹکتے ہوئے گزری ہے۔اور پھر یہ تصویریں دیکھیں۔ یہ بالکل ہوبہو وہی ہیں جیسی کہ اہراموں پر اور فراعنہ کے تابوتوں پر ان کے عہد میں کندہ کی جاتی تھیں۔ اسے تصویری زبان کہتے ہیں اور اصل میں یہ تصویریں جو ہمیں بے مقصد اور فضول نظر آ رہی ہیں ناں...... ان میں بھی ایک تاریخ پوشیدہ ہے۔اب اگر میں یا آپ اس کو سمجھ سکتے ہوتے تو ہمیں اس کی یہاں موجودگی کی وجہ بھی معلوم ہو جاتی۔ اور یہ بھی معلوم ہو جاتا کہ یہ کس فرعون کے زمانے میں تعمیر کیا گیا تھا۔''

میری نظریں نچلی چٹان پر جمی ہوئی تھیں اور میں لاشعوری طور پر دانتوں سے اپنے نچلے ہونٹ کو چبا رہا تھا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہاں اہرام......!

میں عجیب سے شش و پنج میں مبتلا تھا کہ یوساف مزدوروں سے مخاطب ہوا۔

''ایسا کرو تم کھدائی جاری رکھو۔'' اور مزدور دوبارہ کھدائی میں مصروف ہو گئے۔مزید ایک دن کی کھدائی میں تقریباً تمام چٹان نکال لی گئی۔ اور اب یہ حقیقت جھٹلائی نہیں جا سکتی تھی کہ یہ واقعی ایک چھوٹا سا اہرام تھا۔وہی پتھر وہی اہراموں کا مخصوص انداز تعمیر مگر یہ بات ناقابل یقین حد تک حیران کن تھی کہ اس علاقے میں اہرام......

اب کنوئیں میں کھڑے ہونے کے لئے اہرام کے اطراف بہ اطراف کچی دیواروں کے ساتھ ساتھ تقریبا چھ فٹ کی چوڑائی میں جگہ بچی تھی باقی کنوئیں میں یہ

اہرام پھیل چکا تھا۔ تمام مزدور بھی شدید حیرت زدگی کے عالم میں اہرام کے گرد طواف کر کر کے اس کا جائزہ لے رہے تھے۔

ہم چاروں طرف سے بغور باریک بینی سے اس کا جائزہ لے چکے تھے مگر ہماری سمجھ میں یہ بات نہ آ رہی تھی کہ اس کا دروازہ کس جانب ہے اور کس طرح اس کے اندر جایا جا سکتا ہے۔ اور تجسس بری طرح اکسا رہا تھا کہ جلد از جلد اس کے اندر اتر کر اندرونی ماحول کا جائزہ لیا جائے۔ یہ اہرام کی مثلث عمارت تقریباً 44 فٹ مربع کے حجم میں تھی اور چاروں طرف سے نہایت عمدہ نقش و نگار سے مزین تھی۔

یوساف پیشانی مسلتے ہوئے نہایت فکرمندی کے انداز میں بولا۔

"ڈاکٹر صاحب......! اس اہرام کا دروازہ ڈھونڈنا تقریباً ناممکن ہے۔ اگر اس تصویری زبان پر ہمیں عبور ہوتا، ہم اسے سمجھ سکتے تو یقیناً پھر ہمیں کسی پریشانی کا سامنا نہ ہوتا اور ہم نہایت آسانی سے دروازہ ڈھونڈ بھی لیتے اور اسے کھولنے میں کامیاب بھی ہو جاتے۔ مگر یوں دروازہ ڈھونڈنا ممکن نہیں۔"

"تو پھر یوساف......! اب کیا کیا جائے......؟"

"اب کسی قدیم زبانوں پر تحقیقات کرنے والے اور قدیم مصری زبانوں کو پڑھنے سمجھنے والے کو ڈھونڈنا ہوگا۔ جو تاریخی زبانوں پر مکمل عبور رکھتا ہو......؟"

اور میرے ذہن میں فوراً ایک نام گونجا۔ پروفیسر فاضل بصاری......!

پروفیسر فاضل بصاری کو میں ذاتی طور پر جانتا تھا۔ وہ جامعۃ الازھر میں تاریخ مصر کے پروفیسر تھے اور میری ان سے بڑی گہری واقفیت تھی۔

وہ علم فلولوجی "تحقیق زبان کا علم) پر بھی مکمل عبور رکھتے تھے۔ یہ مسئلہ تو حل ہوتا نظر آ رہا تھا۔ میری خاطر وہ یقیناً اس دریافت شدہ اہرام کا کسی سے ذکر نہ کرتے اور میری ہر ممکن مدد بھی کرتے۔ مگر ان سے ملاقات کے لئے مجھے قاہرہ جانا پڑتا اور میں اہرام سے ایک منٹ کے لئے بھی دور نہیں ہونا چاہتا تھا۔

ہم تقریباً پچاس آدمی یہاں موجود تھے مگر اس کے باوجود اکیلے پن کا احساس ہوتا تھا۔ اہراموں اور فراعنہ کا نام سنتے ہی ذہن میں لاتعداد پراسرار واقعات، ظلم ا

ستم اور عجیب عجیب کہانیاں چکرانے لگتی ہیں۔اور اس وقت تو ہمارے سامنے ایک بلند و بالا اور وسیع الجثم اہرام بڑی شان وشوکت سے خاموش سینہ تانے اور سر اٹھائے ایستادہ تھا۔ جس کے سامنے ہم سب ہی خود کو بونے ، ناسمجھ بچے اور کمزور محسوس کر رہے تھے کہ یہ اہرام صدیوں سے یوں ہی آغوش لحد میں خاموش و ساکت کھڑا تھا۔اس کی عمر صدیوں پر محیط تھی اور یہ اپنے تاریک اور وسیع سینے میں صدیوں سے جانے کیسی کیسی کرب ناک و پُراسرار کہانیاں چھپائے ہوئے تھا اور جانے اس کے سینے میں ایسا کیا پوشیدہ تھا کہ جسے انسانوں کی نظروں سے بچائے رکھنے کی خاطر یہ تاریک زمین کی گہرائیوں میں آچھپا تھا۔مگر اب شاید صدیاں گزر جانے کے باعث اس پر بڑھاپا غالب آچکا تھا جو چند انسان تعاقب کرتے کرتے اسے کھوجتے ہوئے اس کے سر پر آ پہنچے۔"

مگر اب بھی یہ اہرام جو کئی ہزار سال کی عمر کو پہنچ چکا تھا۔ جسمانی طور پر نہایت مضبوط دکھائی دے رہا تھا۔ اور بڑے طمطراق سے ہمارے مقابل سینہ تانے کھڑا تھا۔ جیسے خاموش زبان سے کہہ رہا ہو کہ مجھے اتنی آسانی سے زیر کر کے میرے سینے میں مدفون رازوں کو نہ پا سکو گے ناسمجھ بچو......! کہ میں صدیوں سے انہیں اپنی محافظت میں لئے ہوئے ہوں۔

ہمیں اپنے اردگرد عجیب پرہول ویرانہ اور سناٹا معلوم ہو رہا تھا۔ سبھی افراد ایک نامعلوم سی سنسنی کا شکار نظر آ رہے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے کچھ نادیدہ وجود اس اہرام کے پتھریلے وجود سے نکل کر ہمارے گرد پھیلتے جا رہے ہوں...... جیسے سینکڑوں نگاہیں ہمیں گھور رہی ہوں۔میں نے یوساف کو مخاطب کیا تو میری آواز نے سب کو چونکا دیا۔

"یوساف......! ذرا کوشش دوبارہ کرو۔ اہراموں کی تعمیر کو سامنے رکھتے ہوئے پھر سے دروازہ ڈھونڈنے کی کوشش کرو، شاید کہ کچھ کامیابی ہو جائے۔"

اور یوساف دوبارہ آگے بڑھ کر اہرام کا جائزہ لینے لگا۔ وہ نہایت غور سے اس پر کھدی ہوئی جانوروں کی تصویروں کا جائزہ لے رہا تھا۔ کافی دیر تک وہ یہ

تصویریں دیکھتا رہا۔اور پھر مختلف تصویروں کو زور دے دے کر دبانے کی کوشش کرنے لگا۔کافی دیر گزر گئی مگر کچھ حاصل نہ ہوا۔

وہ آستین سے پیشانی کا پسینہ پونچھتے ہوئے دوسرا ہاتھ کمر پر رکھ کر کھڑا ہوگیا۔اس کی نظریں اب بھی تصویروں پر جمی ہوئی تھیں اور وہ پوری طرح ان میں مگن تھا۔پھر وہ سامنے کی جانب چل پڑا، سیدھا چلتا گیا اور پھر اہرام کے آخری کونے سے اہرام کی دوسری جانب گھوم کر نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ غالباً وہ چاروں اطراف کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔اکیلا اس میرے قریب ہی کھڑا تھا۔تمام مزدور بھی آج حیرت انگیز طور پر خاموش خاموش تھے،شاید اہرام کی ہیبت ان کے اعصاب پراثرانداز تھی۔

میں نے سر اٹھا کر اوپر کی جانب دیکھا بلندی پر تیز روشنی کی چمک تھی اور اوپر آسمان کا معمولی سا ٹکڑا دکھائی دے رہا تھا۔

اچانک کنویں میں ایسی ہیبت ناک گونج بلند ہوئی کہ جیسے آسمان پھٹ گیا ہو۔سورج شق ہوگیا ہو یا پھر دھرتی میں شرقاً غرباً دراڑ پڑ گئی ہو۔گونج سے واضح طور پر زمین لرز اٹھی تھی۔ کتنے ہی مزدور اس اچانک شور سے لرز اٹھے، میں خود ہڑبڑا گیا۔

عجیب دل دہلا دینے والی سماعت فگار گڑگڑاہٹ تھی جیسے کوئی بہت بڑی چٹان کسی بلند و بالا سنگلاخ پہاڑ کی چوٹی سے نیچے کی جانب لڑھکتی چلی آ رہی ہو۔پھر اچانک یہ گڑگڑاہٹ فضا میں منجمد ہوگئی۔ خاموشی...... سناٹا...... دلدوز سکوت......

سمت کا تعین ہوا تو میں چونک پڑا۔یہ آواز تو اسی جانب سے بلند ہوئی تھی جدھر کہ کچھ دیر پہلے یوساف گیا تھا۔

پھر یکبارگی وہی گڑگڑاہٹ بشمول ایک انسانی چیخ دوبارہ بلند ہوئی۔ چیخ یقیناً یوساف کی تھی۔مگر زمین کو لرزا دینے والی گڑگڑاہٹ میں دب کر رہ گئی تھی۔

اچانک جیسے میرے حواس لوٹ آئے اور میں بے اختیار یوساف کو پکارتے ہوئے دوڑ پڑا۔اور میرے حرکت کرتے ہی جیسے تمام مزدور ہوش وخرد کی وادی میں

لوٹ آئے اور پھر وہ سب بھی میرے عقب میں دوڑ پڑے۔

میں کونے کے قریب تر ہوا جا رہا تھا۔ صاف محسوس ہو رہا تھا کہ اہرام کی نکڑ مڑتے ہی......نکڑ کے دائیں جانب سے یہ شور بلند ہو رہا ہے۔ میں گڑگڑاہٹ کے مقام کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا......موڑ چند قدم کے فاصلے پر تھا......گڑگڑاہٹ کی آواز دائیں جانب سے بلند ہو رہی تھی۔ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر...... چار قدم......تین قدم......دو قدم......ایک قدم......اور یکا یک گڑگڑاہٹ تھم گئی۔

میں سامنے کی کچی دیوار سے ہاتھ ٹیکتے ہوئے دائیں جانب گھوم آیا۔ مگر یہاں تو کچھ بھی نہ تھا۔ کوئی ایسی چیز نہ تھی جس سے کہ یہ اندازہ کیا جاتا کہ گڑگڑاہٹ کا مرکز یہی تھی......اور نہ ہی کوئی ایسی غیر معمولی تبدیلی نظر آ رہی تھی جو کہ قابل توجہ ہوتی......سب نارمل تھا۔ اب البتہ 44 فٹ دو اہرام کے دوسرے کونے تک یوساف دکھائی نہ دے رہا تھا۔ غالباً وہ دیوار کا جائزہ لیتے ہوئے دوسری سمت چلا گیا تھا۔ تمام مزدور حیرت بھری نظروں سے کبھی اہرام کی دیوار دیکھتے کبھی بلندی کی جانب اور کبھی میری جانب۔ ان کی تو کیا خود میری سمجھ سے باہر تھا کہ گڑگڑاہٹ کا یہ شور کیسا تھا؟

ایکیلا اس آگے بڑھا۔

''صاحب......! یہ آواز کیسی تھی......؟''

میں بھلا کیا بتاتا......؟ میں نے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔

''آؤ یوساف اس جانب دیکھیں۔''

پھر میں دوڑنے کے سے انداز میں آگے بڑھ گیا۔ اور اس کچی دیوار، زمین کی راہداری میں وہ سب میرے پیچھے پیچھے آنے لگے۔

ہم سب اہرام کے گرد گھوم کر دوسری جانب آئے تو چونک پڑے۔ یوساف ادھر بھی موجود نہ تھا۔ پریشان تو میں پہلے ہی ہو چکا تھا۔ میری چھٹی حس مجھے کسی انہونی کا یقین دلا رہی تھی اور اب تو مجھے یقین ہوگیا تھا کہ کوئی زبردست گڑبڑ ہے......اور یوساف کسی مصیبت کا شکار ہوگیا ہے۔ پھر میں یوساف کو پکارنے لگا۔ مگر مجھے صرف اپنی آواز کی بازگشت سنائی دیتی رہی۔

اہرام کے گرد ہم نے کئی چکر لگا ڈالے مگر یوساف کا کچھ پتہ نہ چلا…… یوں لگتا تھا جیسے وہ زمین کی گہرائیوں میں کہیں غرق ہوگیا ہو یا پھر اہرام کا نوالہ بن کر اس کے تاریک شکم میں اتر گیا ہو۔میں دوبارہ اسی جانب آگیا جدھر سے گڑگڑاہٹ بلند ہوئی تھی۔میں بغور اہرام کی اس دیوار کا جائزہ لینے لگا۔ایک ایک انچ معائنے کے بعد بھی مجھے کوئی خاص بات نظر نہ آئی۔دماغ عجیب الجھاؤ کا شکار ہوگیا تھا، کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کیا جائے اور کیا نہیں……؟

آخرکار میں نے حتمی فیصلہ کرتے ہوئے ایکیلاس کو مخاطب کیا۔اب اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا کہ ادھر سے یہ چٹان کاٹنے یا توڑنے کی کوشش کی جائے۔ایکیلاس کو بھی میں نے یہی حکم دیا اور وہ فوراً عمل پیرا ہوگئے۔ڈرل مشین میں لسٹون ڈرل فٹ کیا گیا اور تین مزدور مشین سنبھالے آگے بڑھ آئے۔اور پھر مشین کی مخصوص آواز گونج اٹھی۔باقی کے مزدور چند قدم ہٹ کر کھڑے ہوگئے۔

تینوں مزدور ڈرل سنبھالے دیوار پرزور آزمائی کرنے لگے۔ڈرل انتہائی تیزی سے گردش میں تھا۔پتھر نہایت آہستہ آہستہ ریت کی طرح نیچے گرنے لگا۔تقریباً پندرہ منٹ گزر گئے۔ڈرل اور پتھر سے دھواں اٹھنے لگا۔آخر مشین بند کر دی گئی۔ایکیلاس نے ڈرل چیک کیا اور پھر پتھر کی جانب دیکھنے لگا۔وہاں ابھی ایک انچ بھی سوراخ نہ ہوا تھا۔

''صاحب……! پتھر بہت سخت ہے۔ڈرل کی نوک جواب دے گئی ہے۔''

اور میری پریشانی اور بڑھ گئی۔

''ڈرل چینج کرلو۔ہارڈ ڈرل فٹ کرو۔''

اور پھر ڈرل تبدیل کرلیا گیا اور مشین دوبارہ اسٹارٹ ہوگئی۔تقریباً پانچ منٹ ہی گزرے ہوں کے ایک زبردست کڑاکے کے ساتھ ڈرل ٹوٹ گیا۔

مشین آف کر دی گئی اور مزدور سوالیہ طلب نظروں سے میری جانب دیکھنے لگے۔میں نے نچلا ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔

''ایکیلاس……! مجبوری ہے۔یونہی کٹر مشین چلا کر دیکھو۔'' اور وہ سر ہلا کر رہ

گیا۔

گوکہ بغیر سنٹر ہول کے کسی سخت چٹان کو کٹر مشین سے کاٹنا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔مگر اب اس کے سوا چارہ نہ تھا۔

آخر مشین میں تین بائی چار کا کٹر فٹ کیا گیا۔ماؤتھ کلوز کرنے کے بعد مشین اسٹارٹ کر دی گئی اور مزدور نہایت احتیاط سے دوبارہ اپنی کوشش میں مصروف ہوگئے۔کٹر آہستہ آہستہ اہرام کی اس سخت دیوار پر لکیر نما نشان لگاتا جا رہا تھا چونکہ سنٹرل ہول نہ تھا اس لئے انتہائی احتیاط سے کام لیا جا رہا تھا اور پھر آہستہ آہستہ دیوار پر لکیر نما نشان گہرا ہوتا چلا گیا۔ٹھوس سخت پتھریلی چٹان کٹنا شروع ہوگئی تھی۔ اور کٹنے والی جگہ پر سے پتھر مٹی کی طرح اڑنے لگا تھا۔

ایک بے چینی رگ و پے میں ترتھلی مچائے ہوئے تھی۔سبھی دم سادھے خاموش کھڑے تھے۔اور میری نظریں کٹر پر جمی ہوئی تھیں جو لحظہ بہ لحظہ دیوار میں اترتا جا رہا تھا۔گہرائی میں...... مزید گہرائی میں اور پھر اچانک برق رفتار سے گھومتے ہوئے کٹر کی رفتار میں کمی ہونے لگی؟ اس کی رفتار سلو (Slow) ہونے لگی تھی۔ مزدوروں کی گرفت ہینڈل پر مضبوط تر ہوتی چلی اور پھر اچانک ایکیلاس چلا اٹھا۔

”کٹر سیز ہو رہا ہے...... کھینچو واپس......“ پاس کھڑے تمام مزدور ہڑبڑا کر دور ہٹ گئے۔ میں بھی لاشعوری طور پر چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔ایکیلاس باقی دونوں مزدوروں کے ساتھ مشین واپس کھینچنے کی کوشش کر رہا تھا اور کٹر کی رفتار دھیمی پڑتی جا رہی تھی شین کی موٹر اور گراریوں کی آواز بھاری ہو چکی تھی۔

ڈبل موٹر، ہارڈ گراریاں، ہیوی رولر، تھری ریس رولر، پھر پیچھے سے فل الیکٹرک پاور، بھلا تین افراد سے کہاں مشین سنبھالی جاتی۔نتیجہ یہ رہا کہ کٹر تو پتھریلی دیوار میں تھا۔مشین تین آدمیوں کی گرفت میں ہونے کے باوجود گھوم گئی اور اس نے تینوں کو پٹخ دیا ایک زور کی آواز کے ساتھ کٹر ٹوٹ گیا۔

تینوں مزدور برق رفتاری سے پیچھے ہٹے۔اس کے باوجود ٹوٹا ہوا کٹر ایک کی ران کا اچھا خاصا گوشت کا لوتھڑا کپڑے سمیت اڑا گیا اور وہ کرب ناک انداز میں

چیخ اٹھا۔

ایکیلاس اور دوسرا مزدور بجلی کی سی تیزی سے پلٹنیاں کھاتے ہوئے دور ہو گئے۔ مشین بھی از خود آف ہو گئی۔ میں نے جلدی جلدی زخمی مزدور کو مزید تین مزدوروں کے ساتھ وہاں سے بھیج دیا۔ باہر خیمے میں فرسٹ ایڈ کا سامان بھی موجود تھا اور عبدل بھی وہیں تھا اس لئے مجھے زیادہ پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ ایکیلاس دوسرے مزدور پر برہم ہو رہا تھا۔

''پش بٹن تمہارے ہاتھ کے نیچے تھا...... تم ہاتھ ہٹا کر مشین آف نہ کر سکتے تھے......؟''

''ایکیلاس......! میں کہہ تو رہا ہوں کہ میں ہاتھ ہٹا چکا تھا۔ بٹن نہ جانے کیسے از خود دبا رہا، میں خود سخت حیران ہوں...... اور کیا تم نے محسوس نہیں کیا کہ مشین ہمارے استعمال سے باہر ہو گئی تھی۔ ہم اپنی جانب کھینچ رہے تھے اور کٹر از خود دیوار میں دھنسا جا رہا تھا۔ جیسے دیوار کے اندر سے کوئی اسے اپنی جانب کھینچ رہا ہو۔''

اور ایکیلاس خاموشی اور پریشانی کے عالم میں ہونٹ چبانے لگا۔ میں اپنی جگہ پریشانی کے عالم میں کھڑا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ کیا کیا جائے......؟ کٹر کا ٹوٹا ہوا آدھا حصہ دیوار میں دھنسا ہوا تھا۔ ایکیلاس پلٹ کر اسے نکالنے کی کوشش کرنے لگا مگر وہ ہل بھی نہ رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر گزری ہو گی کہ عبدل بھی وہیں آ پہنچا۔

''کیا ہوا ڈاکٹر صاحب......! کیا کوئی کامیابی ہوئی......؟''

''تم نیچے کیوں آئے ہو......؟'' میں نے الٹا سوال کیا۔

''وہ جی...... زخمی مزدور کی بینڈیج میں نے کر دی ہے اور ان چاروں کو وہاں بٹھا کر خود یہاں آ گیا کہ دیکھوں تو سہی کہ آپ کا کام کہاں تک پہنچا ہے......؟''

اور میں خاموش ہو رہا۔ کٹر نکالنے کے لئے ایکیلاس نے کدال اٹھا لی۔ اور کٹر کی جڑ میں ترچھی ضربیں لگانے لگا۔

تھوڑی دیر بعد عبدل بولا۔

''سر......! آپ ایسا کریں تو سٹون بائیٹ لیزر گن (Stone Bite

Lazer Gun) سے اس دیوار کو کاٹ لیں۔'' اس سے پہلے کہ میں اس کو کوئی جواب دیتا ایکیلاس کا ہاتھ تھوڑا اٹھا اور فولادی کدال کی بھرپور ضرب کنڑ سے چار پانچ انچ دائیں جانب پڑی اور اچانک ایک ہولناک گڑگڑاہٹ پیدا ہوئی، جیسے ضرب کی تکلیف محسوس کرتے ہوئے اہرام دھاڑ اٹھا ہو۔زمین لرز اٹھی اور پھر ایک حیران کن منظر نظر آیا۔

ہمارے بالکل سامنے سے تقریباً دس فٹ کی دیوار کا ٹکڑا کسی دروازے کی طرح ازخود اندرونی جانب کھلتا چلا گیا۔

ایکیلاس گھبرا کر چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اہرام کے اندر گہری تاریکی تھی۔سب کے منہ فرط حیرت سے کھلے کے کھلے رہ گئے۔چند لمحوں کے لئے جیسے میرے اعصاب بھی حیرت کے طلسم کے زیراثر پتھرا کر رہ گئے ہوں۔پھر تمام مزدور دروازے کی جانب امنڈتے چلے آئے۔سب کے چہروں پر تجسس تھا،ایک عجیب سی بے چینی تھی۔

☆☆☆

اس کھلے ہوئے حصے سے ایک نامانوس سی مہک کے بھبکے خارج ہو رہے تھے۔ ایک عجیب سی کیف آور مدہوش کن خوشبو جو طبیعت کو ناگوار نہ گزر رہی تھی، مگر قوت تمام کو بے حس کیئے دے رہی تھی۔ اہرام کا اندرونی حصہ اس قدر تاریک تھا کہ اندر داخل ہونا کسی طور بھی مناسب نہ تھا۔ میں نے ایکیلاس کو مخاطب کیا۔

''ایکیلاس......! فوراً لائٹوں کا انتظام کرو۔ اہرام کے اندر دن کا سا سماں ہونا چاہیئے۔ جلدی کرو......فوراً جلدی......'' اور وہ آٹھ دس مزدوروں کو ہمراہ لے کر ایک جانب بڑھ گیا۔ چار جنگ ٹیوب لائٹس، سرچ لائٹیں، ٹارچیں بہت تعداد میں، میں نے اکٹھی کر لیں تھیں۔ باقی مزدوروں کو میں نے اب وہاں روکنا مناسب نہ سمجھا۔ اسی خیال کے تحت میں نے تین مزدوروں کو روک لیا، باقی کو کہا کہ تم باہر اوپر خیموں میں ہمارا انتظار کرو۔ اور وہ سب چلے گئے۔

اب میرے اور عبدل کے علاوہ وہاں تین مزدور اور کھڑے تھے جلد ہی ایکیلاس واپس آگیا۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر دو اطراف میں جنریٹر آن کر دیئے گئے۔ دس چھوٹی چھوٹی ٹرالیوں میں 500 واٹ کی سرچ لائٹس فٹ تھیں، ہر سرچ لائٹ کے ساتھ آٹو میٹک خودکار دو دو بیٹریاں منسلک تھیں کہ ایک آن رہتی اور دوسری خودبخود چارج ہوتی رہتی۔

چند مزدور جنریٹر سے اہرام کے گرد روشنی کا بندوبست کرنے لگے۔ ایکیلاس

نے ایک ٹرالی اہرام کے دروازہ کے سامنے روکی۔ سرچ لائٹ کا رخ اہرام کی اندرونی جانب فکس کیا اور لائٹ آن کر دی۔ تیز روشنی تاریکی کا کھوکھلا سینہ چیرتی ہوئی اہرام میں داخل ہوئی اور برق رفتاری سے اندھیرے چاک کرتی ہوئی اہرام کی آخری حد سے جا ٹکرائی۔ تمام اہرام منور ہوگیا اور اندرونی منظر واضح ہو گئے۔ یہ ایک سیدھی راہ داری نظر آ رہی تھی جس کا اختتام چوالیس فٹ دور سامنے والی دیوار پر ہوتا تھا۔

باقی کی تمام سرچ لائٹس بھی روشن کر لی گئیں سب نے احتیاطاً گیس ماسک چڑھائے اور پھر میں بشمول عبدل اور ایکیلاس نو مزدوروں کے ہمراہ اللہ کا نام لے کر اہرام میں داخل ہوگیا۔ سبھی ایک ایک ٹرالی دھکیلتے ہوئے اہرام میں داخل ہوئے تھے۔ اور اندر اس قدر روشنی پھیل گئی تھی کہ اگر دس قدم کے فاصلے پر سوئی بھی پڑی ہوتی تو صاف دکھائی دیتی۔

ایک عجیب سا سکوت...... گھمبیر خاموشی...... بڑا ہی پُراسرار ماحول تھا اندر کا۔ ہم آہستہ روی سے آگے بڑھتے چلے گئے۔ اس ایک راہ داری میں سے بیسیوں راہ داریاں دائیں بائیں نکل رہی تھیں جن کا اختتام نہ جانے کہاں ہوتا ہوگا، ہم تو ناک کی سیدھ میں بڑھتے چلے گئے۔ جگہ جگہ دیواروں پر سورج کی تصویریں کھدی ہوئی تھیں۔ ہر راہ داری، ہر کونے پر عجیب و غریب فوق الفہم نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ در و دیوار کے تمام پتھر عجیب سی حالت میں تھے کہ میری سمجھ میں نہیں آتا ان کا حلیہ کس انداز میں بیان کروں۔

ہلکے بھورے سبزی مائل، خشک تر، سنگلاخ، سوختہ رو......

آخر ہم راہ داری کی آخری حد تک آ گئے۔ سامنے ایک مضبوط ٹھوس دیوار تھی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا دور دروازے کے بیچوں بیچ ٹرالی پر سرچ لائٹ روشن نظر آ رہی تھی۔ جس کی تیز روشنی اتنی دوری کے باوجود آنکھیں چندھیا رہی تھیں۔

''کون ہے......؟'' اچانک اس پُراسرار خاموشی میں ایک کانپتی لرزتی ہوئی آواز بلند ہوئی اور سحر انگیز سکوت کرچی کرچی ہو کر بکھر گیا۔

ہم سب ہی چونک پڑے، دل ایک خوف و دہشت کی لذت سے ملے جلے

احساس نے سے دھڑکنے لگا۔ بھلا صدیوں سے بند اس اہرام میں کون ہوسکتا ہے......؟ کم از کم کوئی انسان تو نہیں ہوسکتا پھر......؟

آواز ایک بار پھر بلند ہوئی۔

''ارے بھائی......! کون ہے...... جواب کیوں نہیں دیتے...... خدارا میرے پاس آؤ......!'' آواز میں ایسا عجیب غم انگیز کرب تھا کہ میرے وجود کا رواں رواں جھنجنا اٹھا۔ آواز میں ایسی کپکپاہٹ اور لرزش تھی جیسے بولنے والے کی زبان میں رعشہ ہو۔

ہم سب کی نظریں اپنے سے چند قدم پیچھے اس راہ داری کے کونے پر جمی ہوئی تھیں جو کہ اس آواز کا اصل منبع تھی۔ تمام مزدوروں کے چہروں پر موت کے سائے منڈلا رہے تھے اور ان کی رنگت زرد پڑی ہوئی تھی۔ عبدل اور ایکیلا س کے چہرے پر بھی ہوائیاں اڑ رہی تھیں اس وقت تو میں اپنی کیفیت کے متعلق سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کھو بیٹھا تھا ہاں آج سوچتا ہوں کہ اس وقت میری اپنی حالت بھی دگرگوں تھی۔ میری رگیں ایسے تناؤ کا شکار تھیں جیسے ابھی کے ابھی سینکڑوں ٹکڑوں میں بٹ جائیں گی۔

واقعہ ہی کچھ ایسا رونما ہوگیا تھا کہ تیز سنسنی خیز لہریں میرے پورے وجود کو ڈسنے لگی تھیں ہم سب اپنی اپنی جگہ مبہوت، خاموش کھڑے تھے کہ پھر عجیب سی ہلکی ہلکی سرسراہٹیں ابھرنے لگیں یا کچھ گھسیٹنے رگڑنے کی آوازیں۔

ہم سب کی نظریں بدستور اسی راہ داری کی نکڑ پر گڑی ہوئی تھیں جس میں سے یہ آوازیں ابھر ابھر کر معدوم ہو رہی تھیں اور پھر ہم نے وہاں سے ایک عجیب الخلقت چیز نمودار ہوتے دیکھی، وہ ایک گوشت کا طویل تر لوتھڑا سا تھا جو سانپ کی طرح راہ داری میں پتھریلے فرش پر رینگتا ہوا اس جانب سے نمودار ہوا تھا۔ عجیب لجلجا سا، خون میں تر...... جیسے...... جیسے کسی ٹھوس وزنی پتھر سے اسے بری طرح کچل دیا گیا ہو۔ گوشت کے چھوٹے چھوٹے ذرے خون کے ساتھ فرش پر پھیل رہے تھے۔ پھر ویسا ہی ایک اور سانپ سا نمودار ہوا۔ ملون برابر آہستہ روی سے رک رک کر

گھسٹ گھسٹ کر سامنے آ رہے تھے۔

تمام سرچ لائٹوں کا رخ اسی جانب تھا اور میں تیز روشنی کے باوجود یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ یہ کیا بلا ہے اور اگر یہ عجیب الخلقت بلا بیرونی راستے میں حائل نہ ہوتی تو یقیناً اب تک ہم سبھی چھلانگیں مارتے ہوئے اہرام سے باہر نکل چکے ہوتے۔وہ مقامی مزدور لرزتی آوازوں میں دعائیہ کلمات بڑبڑانے لگے تھے۔ ان سانپوں کے عقب میں ایک بھاری بھرکم گوشت کا تقریباً چھ فٹ لمبا ڈھیر گھسٹتا ہوا راہداری میں آ گیا تھا جس کے اندر سے سرخ سرخ خون ابلا پڑ رہا تھا۔اور اس خون کے ساتھ گوشت کے باریک باریک ریزے بہتے ہوئے راہ داری کے فرش پر پھیلتے جا رہے تھے۔ اور اب وہ پورا وجود ہمارے سامنے سرچ لائٹوں کی زد میں تھا۔ ایسا قبیح صورت منظر اس سے پہلے میری نظروں سے نہ گزرا تھا میرے اعصاب شل ہوئے جا رہے تھے۔ جانے یہ کون سی مخلوق تھی جس کا کہ کوئی سر پیر ہی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ اس کی ابتداء کدھر سے ہوتی ہے اور اختتام کدھر ہوتا ہے؟ بس گوشت اور ہڈیوں کے ملغوبے کا ایک چھ فٹ لمبا ڈھیر سا تھا۔

اس وجود کی حالت کذائی کچھ ایسی تھی کہ ہم اس کی حقیقت کبھی نہ جان پاتے اگر وہ ازخود بول نہ پڑتا۔

پہل عبدل کی خوفزدہ آواز نے کی تھی۔

''صص...... صاحب......! یہ...... یہ کیا ہے......؟''

پھر اس گوشت کے ڈھیر سے ایک کانپتی لرزتی آواز خارج ہوئی۔

''کون ہے......؟ ڈاکٹر صاحب ......! کیا یہ آپ ہی ہیں......؟ کیا آپ اندر آ چکے ہیں......؟'' پہلے تو مجھے اس بات پر شدید جھٹکا لگا کہ مجھے ڈاکٹر صاحب کہہ کر پکارا گیا تھا۔ آواز میرے لئے بالکل نامانوس تھی۔ مگر ڈاکٹر صاحب کہنے کا انداز میرے لئے قطعی اجنبی نہ تھا اور ایک قیامت خیز خیال نے مجھے بے اختیار بولنے پر مجبور کر دیا۔

''یوساف...... کیا...... یہ تم ہو......؟''

میرے لب و لہجے میں نا قابل یقین حد تک حیرت کا انداز رچا ہوا تھا۔

''ہاں ڈاکٹر صاحب......! یہ...... میں ہی ہوں۔ ساڑھے چار ہزار سال سے انسانی وجود کے انتظار میں بے قرار و مضطرب شیطانی روحوں کے عذاب کا شکار ہونے والا میں ہی ہوں...... آپ کا خادم...... یو......ساف......!''

فرط حیرت سے میری زبان گنگ ہو کر رہ گئی تھی...... وہاں موجود سبھی افراد کی آنکھیں شدت حیرت سے پیالہ ہوگئی تھیں اور سبھی نا قابل یقین نظروں سے یوساف کے وجود کو دیکھے جا رہے تھے۔ یوساف دوبارہ کپکپاتی نیند زدہ آواز میں بڑبڑایا۔

''ڈاکٹر صاحب......! فوراً واپس لوٹ جائیں ورنہ آپ بھی کسی درد ناک عذاب کا شکار ہو جائیں گے...... واپس لوٹ جائیں...... واپس لوٹ جائیں...... واپس لو......ٹ...... جا......'' یوساف کی آواز خاموش ہوگئی اس کے گوشت کے لوتھڑوں میں چھپے ہوئے ہونٹوں پر ''اجل نواز'' نے ہمیشہ کے لئے خاموشی کے قفل ڈال دیئے تھے۔ سبھی کی آنکھوں میں کچھ دیر پہلے خوف سمٹا ہوا تھا اور اب یوساف کی درد ناک موت پر سبھی کی آنکھیں نم تھیں۔ میں ایک ڈاکٹر تھا، انسانی وجود کی چیر پھاڑ، گوشت، لاشیں، خون یہ سب میرے لئے نئی چیزیں نہ تھیں مگر یوساف کی لاش ایسی اثر انگیز حالت میں تھی کہ مجھے کراہت محسوس ہو رہی تھی۔ اور جی بری طرح متلا رہا تھا۔ خون حیرت انگیز طور پر جاری تھا اور یوساف کی لاش سے گوشت کے لوتھڑے اور ریزے اس طرح خون میں بہہ رہے تھے جیسے ابھی کے ابھی اس کا پورا وجود خون میں حل ہو کر رہ جائے گا۔ اس کی کھال جھلی نما چندھیوں کی صورت اختیار کر چکی تھی۔ ہمیں فوراً یہاں سے نکل جانا چاہئے تھا مگر اس نظر سوز نظارے نے تو ہمارے حواس ہی منجمد کر کے رکھ چھوڑے تھے۔ ہم سب کافی دیر تک اپنی اپنی جگہ جامد و ساکت کھڑے رہے اور ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے یوساف کا پورا وجود خون میں حل ہو کر ایک گاڑھے محلول کی صورت میں راہ داری کے فرش پر پھیل گیا۔

''صاحب......! اب ہمیں فوراً نکل جانا چاہئے۔''

''ہاں...... چلو...... آؤ......!''

اور پھر ہم احتیاط سے راہ داری کے خون آلود حصے سے گزر کر بیرونی دروازے کی جانب بڑھ گئے۔ خوف و دہشت کا سایہ عفریت ہمارے دماغوں میں پنجے گاڑھے خاموش...... ہمارے اعصاب پر مسلط تھا۔

راہ داری میں ہمارے قدموں کی آواز گونج رہی تھی یا پھر ٹرالیوں کے پہیوں کی چرچراہٹیں گونج رہی تھیں اور ہم تیز رفتاری سے بیرونی دروازے کے قریب تر ہوئے جا رہے تھے کہ اب ہم جلد از جلد اس دہشت کدے سے نکل جانا چاہتے تھے۔ بیرونی دروازہ ہم سے صرف چند قدم کے فاصلے پر تھا کہ دفعتہً ایک دھماکے سے دروازے کے بیچوں بیچ پڑی ہوئی سرچ لائٹ ٹوٹ گئی۔ سرچ لائٹ کے شیشے ہمارے قدموں تک اڑ کر آئے اور تمام راہ داری میں بکھر گئے۔ بے اختیار ہم ٹھٹک کر رک گئے۔ سرچ لائٹ سے سفید دھوئیں کے کثیف مرغولے جھومتے ہوئے بلند ہو رہے تھے۔ اور پھر ایک اور حیرت انگیز بات ہوئی۔ اہرام کا کھلا ہوا دروازہ از خود ایک تیز گڑگڑاہٹ سے بند ہوتا چلا گیا ہم آگے کی جانب دوڑے کہ بند ہوتی ہوئی دیوار کو پکڑ سکیں مگر راستہ مکمل طور پر بند ہو چکا تھا۔

ہم چوہوں کی طرح اس اہرام میں محبوس ہو کر رہ گئے تھے۔ گھبراہٹ اور خوف سے ہمارے حواس معطل ہو کر رہ گئے تھے۔ ہم خوف نشین نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔ یوساف کی لاش ہماری بصارت کے ریکارڈ سیکشن میں سفید اسکرین پر بار بار دکھائی دینے لگی اور ہمیں بھی اپنا انجام ویسا ہی ہوتا نظر آنے لگا۔

ہم منتظر تھے کہ ابھی کسی اور سے ہم پر بدروحیں جھپٹیں گی اور ہمارا انجام بد خیر ہو جائے گا۔

میں تیزی سے آگے بڑھ کر دروازے کو ٹٹولنے لگا۔ ایک ٹھوس پتھریلی دیوار میرا منہ چڑھا رہی تھی۔ کوئی ہلکا سا رستہ یا نشان تک ایسا نہیں تھا جس سے یہ اندازہ ہوتا کہ کچھ دیر پہلے یہاں ایک دروازہ تھا۔ میری دیکھا دیکھی عبدل اور ایکیلاس اور دوسرے ملازم بھی آگے بڑھ کر دروازے کی جگہ موجود اس چٹان سے زور آزمائی کرنے لگے کہ شاید یہ اپنی جگہ سے سرک جائے اور ہم موت کے منہ سے نکل کر

زندگی کی آغوش میں پہنچ سکیں، مگر ہر کوشش ناکام رہی۔ ہم ایک چوہے دان میں پھنس چکے تھے اور اب فضول میں دروازے کی جگہ زور صرف کر رہے تھے حالانکہ یقین تھا کہ پوری فوج بھی اسے سرکانے میں ناکام رہے گی۔

آخر کچھ دیر کوشش کے بعد تمام مزدور پیچھے ہٹ گئے۔ان کے چہروں پر وحشت برس رہی تھی۔

''ڈاکٹر صاحب......! اب کیا کریں......؟ ہم باہر کیسے نکلیں گے......؟'' ایکیلاس نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔

''کچھ نہیں کہا جا سکتا ایکیلاس......! ہوسکتا ہے ہماری لاشیں یہیں گل سڑ کر ختم ہو جائیں اور کسی کو کبھی علم بھی نہ ہو سکے۔'' میں نے دل گرفتگی سے جواب دیا۔ یہاں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے کے خیال سے میرا دل ڈوبنے لگا تھا۔ ناامیدی، مایوسی نے فوراً ہی میرے دل و دماغ پر تسلط جما لیا۔

''صاحب......!'' عبدل نے کچھ سوچتے ہوئے مجھے مخاطب کیا۔

''کیا اس دروازے کو کھولنے کے لئے اندرونی جانب کوئی میکنزم نہیں ہوگا۔ جیسے یہ باہر سے کھلا ہے ہوسکتا ہے ویسے ہی اسے اندرونی جانب سے کھولنے کا بھی کوئی طریقہ کار ہو......؟''

''نہیں اہراموں کے دروازے صرف باہر سے ہی کھولے جا سکتے ہیں کیونکہ ممیوں کو باہر نکلنے کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی سو اندرونی جانب ایسا کوئی میکنزم نہیں رکھا جاتا تھا۔''

''کیا کوئی اور راستہ بھی نہیں ہوگا باہر جانے کا......؟''

''مجھے کیا پتہ...... میں ساری زندگی اہرام نہیں کھنگالتا رہا۔'' میری بات پر ایک اور مزدور مجھ سے مخاطب ہوا۔

''پر صاحب جی......! اب آپ کوئی حل تو نکالیں...... ہم یہاں سے باہر کیسے نکل سکتے ہیں۔ آپ کوئی راستہ ڈھونڈنے کی کوشش کریں یوں یہاں کھڑے رہے تو مایوسی کے بوجھ سے ہی سب مر جائیں گے۔'' مجھ سے کوئی جواب نہ بن سکا میں

پریشانی سے اپنا نچلا ہونٹ کاٹنے لگا۔

کچھ دیر پریشانی کے عالم میں کھڑے رہنے کے بعد ایک بار پھر بند دروازہ کا جائزہ لینے لگا۔ ایک طویل مغز ماری کے بعد پوری طرح مایوس ہوگیا۔ اعصاب سن ہوگئے، عقل جواب دے گئی، تمام حواس گویا سلب ہو کر رہ گئے تھے۔

''اب یہ دروازہ نہیں کھل سکتا۔'' میں نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا تو مزدوروں کی حالت متغیر ہوگئی۔

''کک...... کیا مطلب......؟ کیا اب ہم باہر نہیں نکل سکیں گے......؟'' عبدل ہکلایا۔

''ہاں......! اب تو کوئی معجزہ ہی ہوا تو ہم زندہ سلامت باہر نکل سکیں گے ورنہ اور تو کوئی صورت نہیں۔ ہم بری طرح پھنس چکے ہیں عبدل......! اور میں تم لوگوں کو کوئی جھوٹی آس امید نہیں دلانا چاہتا۔ شاید یہ اہرام ہی ہم سب کی قبر بنے گا۔'' میری آواز نے کچھ دیر کے لئے سب پر سکتہ طاری کر دیا۔ مزدوروں کی آنکھیں پھیل گئیں اور چہروں پر موت کی زردی کھنڈ گئی سب اپنی اپنی جگہ بے حس و حرکت کھڑے رہ گئے۔

میں اس راہ داری کی دیوار سے ٹیک لگا کر فرش پر ہی بیٹھ گیا۔ چند لمحوں تک اہرام کی بوجھل اور پُراسرار خاموشی میں موت سی سرسراتی رہی پھر اچانک جیسے مزدوروں پر ایک جنون طاری ہوگیا۔ سب دیوانہ وار دروازے کی چٹان پر ٹوٹ پڑے۔ وہ دروازے کی جگہ ٹھوکریں مار رہے تھے چٹان کو دھکے دے رہے تھے مگر بھلا اس سے کیا حاصل ہونے والا تھا؟ میں اپنی جگہ سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا۔ شاید کتاب زیست میں یہی رقم تھا۔

دنیا کے نامور ہارٹ اسپیشلسٹ ڈاکٹر شکیل ظفر کی زندگی اتنی ہی تھی اور انجام یہی تھا۔ اہرام کا قید خانہ، بے بسی کی اذیت ناک موت، کسی کے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہیں ہوگی کہ پاتال کے اندر پوشیدہ ایک اہرام ڈاکٹر شکیل ظفر کی آخری آرام گاہ بنے گا۔

کچھ ہی دیر میں مزدوروں کے کپڑے پسینے سے تر بتر ہو گئے۔ تمام مزدور راہ داری میں بے سدھ گر کر ہانپنے لگے۔ عبدل بھی تھکے ہوئے انداز میں میرے قریب ہی گھٹنوں کے بل گر پڑا۔ میں نے سر اٹھا کر اس کی سمت دیکھا اس کی رنگت سرخ ہو رہی تھی اور چہرے پر پسینے کے قطرے جھلملا رہے تھے، سانس بری طرح پھول رہی تھی۔ میں نے زاویہ نگاہ بدلا۔ دوسرے مزدوروں کی حالت بھی اس سے کچھ مختلف نہ تھی سبھی منہ کھولے سانس لے رہے تھے۔ اور ان کے نتھنے پھڑ پھڑا رہے تھے۔

اچانک ایک اور روح فرسا خیال سے میری ریڑھ کی ہڈی میں برف کا کنکھجورا سا رینگ اٹھا۔ میں نے چونک کر عبدل کی طرف دیکھا اس کی آنکھوں کے شیشوں پر پانی جھلملا رہا تھا، نتھنے پھول پچک رہے تھے۔ گردن کی رگیں رہ رہ کر ابھرتی تھیں۔

''عبدل......! عبدل......! کیا ہو رہا ہے تمہیں......؟ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے......؟''

''صص...... صاحب جی......! حلق...... حلق اور ناک میں جلن سی ہونے لگی ہے اور اچانک پتا نہیں کیوں......؟'' عبدل نے گلا کھنکارتے ہوئے کہا، تو تشویش کی زیادتی سے میری آنکھیں سکڑ گئیں۔ میں فکرمندی سے دوسرے مزدوروں کی جانب دیکھنے لگا ان کی حالت اب سنبھل چکی تھی۔ وہ سب اٹھ کر دوبارہ دروازے کی سمت متوجہ ہوئے تو مجھ سے خاموش نہیں رہا گیا۔

''ٹھہرو......! رک جاؤ...... تمہاری یہ کوشش فضول ثابت ہوگی یہ دروازہ نہیں کھلے گا، بے کار میں قوت صرف نہیں کرو۔''

''تو کیا ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ رہنا ہمارے لئے کارآمد ثابت ہوگا......؟'' ایک مزدور نے ترش لہجے میں مجھے مخاطب کیا۔

''یوں بیٹھ کر موت کا انتظار کرنے سے بہتر ہے کہ ہم زندگی کے لئے تگ و دو کرتے ہوئے مریں۔''

''تگ و دو اور حماقت میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ بچھو کے اطراف اگر آگ جلا

دی جائے تو وہ بھی چاروں طرف بھاگتا دوڑتا ہے،ٹکریں مارتا ہے اور آخر کار خود ہی کو ڈنگ مار کر مر جاتا ہے۔ حالانکہ اگر وہ آگ کے ٹھنڈا ہونے کا انتظار کرنا جانتا ہو تو زندگی کو محفوظ رکھ سکتا ہے مگر اس کے پاس عقل نہیں ہوتی اور تم لوگ بھی اسی طرح خود کو ڈنگ مار رہے ہو، حماقت کا ثبوت دے رہے ہو، جو بے وقوفوں کی طرح اس دروازے پر زور آزمائی کر رہے ہو۔''

''یہاں زندگی اور موت کی مصیبت پڑی ہوئی ہے اور آپ آگ بچھو کی پہیلیاں بیان کر رہے ہیں۔''

''میں پہیلیاں نہیں بیان کر رہا، تمہاری عقلیں پہیلیاں بن گئی ہیں۔ اہرام کی چار دیواری اس وقت آگ ہے اور اس آگ سے باہر نکلنے کے لئے تم لوگ بچھو والی حماقت ہی کر رہے ہو۔''

''صاحب جی......! صاف صاف بات کریں۔ آپ کیا چاہتے ہیں......؟'' ایکیلاس نے پریشان کن لہجے میں کہا۔اور گلا کھنکارنے لگا۔

''دیکھو ایکیلاس......!'' میں نے گھمبیر لہجے میں کہنا شروع کیا۔

''پہلے تو ہمیں اس بات کا پورا احساس ہونا چاہئے کہ اس وقت ہم کہاں موجود ہیں اور کیا صورت حال ہے......؟ ہم بیسیوں فٹ زمین کے اندر ایک ایسے اہرام میں محبوس ہیں جو غالباً ساڑھے چار ہزار سال سے مکمل طور پر بند تھا اور اب کچھ دیر دروازہ کھلا رہنے کے بعد دوبارہ بند ہو چکا ہے۔ اور ہم اندر قید ہو کر رہ گئے ہیں۔ یہاں آکسیجن برائے نام ہے اور وہ بھی مسموم۔ ہم زیادہ دیر زندہ نہیں رہ سکتے اور جس طرح تم لوگ فضول میں دروازے پر زور آزمائی کر رہے ہو گویا خود کو موت کی اندھی کھائیوں کی سمت دھکیل رہے ہو اگر یہاں کی زہریلی ہوا میں ہم دس گھنٹے زندہ رہ سکتے ہیں تو یوں قوت صرف کرنے سے وہ دس گھنٹے کی زندگی کے امکان سمٹ کر دو گھنٹے رہ جائیں گے۔ اب اس بات کا فیصلہ تم لوگ خود کر لو کہ دس گھنٹے زندہ رہنا چاہو گے یا دو گھنٹے؟ اسّی فیصد یقینی موت ہے اور بیس فیصد زندگی کے امکان ہیں کہ شاید کوئی معجزہ رونما ہو جائے۔ اب اگر تم لوگ معجزات پر یقین نہیں رکھتے تو اس

ٹھوس چٹان پر اپنا زور ضائع کر سکتے ہو مجھے کوئی اعتراض نہیں! ہاں البتہ میں دو گھنٹے کی بجائے دس گھنٹے کی زندگی کو ترجیح دوں گا۔" میری بات سن کر مزدور بھی گنگ رہ گئے ان کی حالت مزید دگرگوں ہوگئی کہ کاٹو تو لہو نہیں۔

سب اپنی اپنی جگہ کھڑے رہ گئے، کوئی دروازے کی سمت نہیں بڑھا۔

"کیا میری بات تم لوگوں کی سمجھ میں نہیں آئی...... دروازہ ہٹا سکتے ہو تو ہٹا لو......!"

"نہیں...... ہم دس گھنٹے زندہ رہنا چاہتے ہیں۔" یہ وہی مزدور تھا جو کچھ دیر پہلے مجھ سے ترش لہجے میں بول رہا تھا۔

"ہاں ڈاکٹر صاحب......! جب موت ہر صورت میں ہے تو کیوں نہ زندگی کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارنے کی کوشش کی جائے۔" ایکیلاس بھی دروازے سے ہٹ کر میرے قریب آ بیٹھا تو اس کی تقلید میں باقی مزدور بھی پیچھے ہٹ آئے۔زندگی چیز ہی ایسی ہے انسان کو پتا بھی ہے کہ زندگی کا ہر راستہ آخر کار موت کی سرحد پر جا کر رک جاتا ہے اس کے باوجود وہ زندگی سے چمٹے رہنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔ ایک دن، ایک رات، ایک گھنٹہ، ایک منٹ، ایک سانس ہی سہی، چھوڑ دینے کی ہمت نہیں ہوتی۔

"ڈاکٹر صاحب......! حلق اور ناک میں عجیب...... خارش اور جلن سی ہونے لگی ہے۔کہیں...... کہیں یہ......"

"ہاں ایکیلاس......! اگر تم کچھ دیر اور دروازے کے ساتھ کشتی کرتے تو شاید یہ سوال تمہارے حلق سے باہر نہیں نکل پاتا۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔پھر عبدل سے مخاطب ہوا۔

"عبدل......! پانچ لائٹیں آف کر دو، چار آن رہنے دو۔" میری بات سن کر عبدل خاموشی سے اٹھ کر ٹرالیوں کی طرف بڑھ گیا۔مزدور راہ داری کے فرش پر خاموش بیٹھے تھے نگران کے ہونٹ مرتعش تھے یقیناً وہ دُعائیں بڑبڑا رہے تھے۔خدا کے حضور گڑگڑا رہے تھے کہ کوئی معجزہ رونما ہو اور ان کی زندگیاں بچ جائیں یا پھر وہ

مغفرت کی دعائیں مانگ رہے ہوں گے کہ الٰہی! ہمیں بخش دے۔ہمارے گناہ، ہماری خطائیں معاف فرما۔ یہی انسانی فطرت ہے جس نے زندگی میں کبھی بھولے سے بھی خدا کو یاد نہیں کیا ہوتا۔

ایسے مشکل وقت میں جب اس کے سامنے کوئی راستہ باقی نہیں رہتا تب وہ خدا کو یاد کرنے لگتا ہے، اسے یاد آجاتا ہے کہ ہاں کوئی خدا بھی ہے جس نے تمام عالم تخلیق کئے ہیں...... جو ہمارا خالق ہے، جو بچانے، مارنے، سننے، معاف کرنے اور ہر چیز پر قادر ہے۔ سو ان لمحات میں انہیں بھی خدا کی یاد نے آلیا تھا کیونکہ ان کے پاس بھی کوئی راستہ نہیں بچا تھا اگر کوئی راستہ تھا تو وہ تھا موت کا، کربناک موت کا۔

کافی دیر تک ہم سب اپنی اپنی جگہ سر جھکائے افسردہ اور خاموش بیٹھے رہے سب نے منہ سے ماسک ہٹا رکھے تھے۔

''یہاں کی آکسیجن زہر لتھڑی ہے، لہٰذا ماسک چڑھا لو ورنہ حلق اور نتھنوں سے خون ابل پڑے گا۔'' میں نے ماسک پہنتے ہوئے ان سب کو مخاطب کیا تو سب نے مالک چڑھا لئے۔

''صاحب......! کیا کسی طریقے سے ہم باہر والوں کو خبر نہیں کر سکتے......؟'' عبدل نے کہا۔

''تم کر سکتے ہو...... ایسا کرو جا کر ان سب لو بتاؤ اور جلدی سے واپس آجاؤ۔'' میرے جواب پر عبدل خاموش ہو گیا۔

سبھی کے چہرے مرجھائے ہوئے تھے۔ شعور میں موت کا یقین بیٹھا ہوا تھا جبکہ لاشعور آسیں، امیدیں بندھا رہا تھا مگر کسی کا ذہن بھی ان امیدوں پر مطمئن نہیں ہو رہا تھا کیونکہ تمام ذہنوں پر بے کسی کی اذیت ناک موت کا یقین کسی ناگ کی طرح پھن گاڑھے بیٹھا تھا۔

ہم سب اہرام کی مرکزی راہ داری کے فرش پر کسی سینکڑوں میل کی مسافت کے بعد تھک کر پڑاؤ کرنے والے صحرائی قافلے کی طرح بیٹھے ہوئے تھے۔ اور راہ داری کے دونوں اطراف میں کئی اور راہ داریاں موجود تھیں جو اہرام کو کھنگالنے والوں

کو گمراہ کرنے کی غرض سے بنائی جاتی تھیں۔

کافی دیر تک ہم سب خاموش بیٹھے رہے کسی نے کوئی بات نہیں کی ان ہزاروں سال پرانے پتھروں سے سحر انگیز لہریں نکل نکل کر ہمارے اعصاب پر بوجھ نداز ہو رہی تھیں۔ پھر ایکیلاس کی آواز نے ہی فضا میں تنی خاموشی کو مرتعش کیا۔

''صاحب جی......! کیا اب ہم یونہی بیٹھے رہیں گے......؟'' میں نے ستفہامیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔

''کیا مطلب......؟''

''مطلب یہ کہ وقت تو دھیرے دھیرے گزرتا رہے گا اور ہر گزرتے لمحے کے ساتھ ہماری سانسیں گھٹتی جائیں گی اور آخر کار ہم یہاں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر دم توڑ دیں گے اور یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔''

''تم کیا چاہتے ہو......؟''

''ڈاکٹر صاحب......! ہم نے اس مقبرے کے اسرار جاننے کے لئے اپنی ندگیاں داؤ پر لگائی ہیں اور موت ہم سے زیادہ دور نہیں۔ ملک الموت ہمارے آس اس ہی کہیں منڈلا رہا ہوگا کہ کب اسے اشارہ ملے اور وہ ہماری گردنیں مار لے۔ یہاں یوں اداس وملول بیٹھے رہے تو موت کی ہیبت بڑھتی چلی جائے گی اور زندگی کا دامن چھوڑتے ہوئے ہماری روح میں اذیت کے بھنور بیدار ہو جائیں گے۔ جب مرنا ہی ٹھہرا تو کیوں نا بے کسی اور مایوسی کی گرد کو ذہن سے جھاڑ دیں اور موت کا خیال ذہنوں سے جھٹک کر اس مقبرے میں دفن اسرار کھوج نکالیں...... جس مقصد کی تکمیل میں ہم موت کا شکار ہونے والے ہیں کم از کم اس مقصد کو مکمل تو کر جائیں، یوں پل پل موت کا اندازہ تو ہمیں موت آنے سے پہلے ہی مار ڈالے گا۔'' ایکیلاس کے لہجے سے ایک عزم جھلکنے لگا تھا۔

''ایکیلاس تمہاری بات بالکل درست ہے، اگر ہم دلوں میں موت کا یقین لے کر بیٹھ گئے تو موت کا خوف اور مایوسی، ہمارے خون میں گھل کر ہماری دھڑکنوں کا گلا گھونٹ دے گی۔ ابھی ہمارے سینوں میں سانسیں موجود ہیں۔ اعضاء میں

زندگی کی توانائیاں بھری ہوئی ہیں اور اگر ہم مردوں کی طرح یہاں پڑے رہیں تو یہ ہماری بزدلی اور ہمارے انسان ہونے کی توہین ہوگی، زندگی کی تذلیل ہوگی اور موت کا تو ایک وقت مقرر ہے جس میں کہ ایک لمحے کی بھی رد و بدل ہونا ممکن نہیں...... ہم موت پر یقین رکھتے ہیں پھر موت سے خوف کیا......؟ موت سے تو ہمیں تب خوف کھانا چاہئے کہ جب ہمیں موت پر یقین نہ ہو۔'' میں نے مضبوط لہجے میں ایکیلاس کی بات کی تجدید کی اور اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

''اٹھو عبدل......! اٹھو ایکیلاس......! یہ اہرام اپنے اسرار چھپائے رکھنے کی خاطر ہماری زندگی نگل لینا چاہتا ہے مگر ہم مرتے مرتے بھی اس میں دفن تمام اسرار کھوج کر بے حجاب کر دیں گے۔'' میں نے مزدوروں کو مخاطب کیا۔

''اگر تم لوگ ہمارا ساتھ دینا چاہو تو ہمیں خوشی ہوگی اور اگر یہاں بیٹھ کر سانسوں کا شمار کرنا چاہو تو اس پر بھی ہم اعتراض نہیں کریں گے۔'' میری بات پر مزدوروں نے ایک دوسرے کی صورتوں کا جائزہ لیا اور پھر وہ بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔

''ہم ہر صورتِ حال اور ہر کام کے لئے تیار ہیں۔'' ایک مزدور نے پُر جوش انداز میں کہا۔

''تو آؤ پھر یہ پانچ ٹرالیاں یہیں رہنے دو اور یہ چار دھکیل لاؤ۔'' میں نے روشن سرچ لائٹوں والی چاروں ٹرالیوں کی جانب اشارہ کیا تو چار مزدوروں نے آگے بڑھ کر ٹرالیاں سنبھال لیں۔ اہرام کے مہیب سناٹے میں ٹرالیوں کے ویلوں کی چرچراہٹیں گونج اٹھیں۔

ہم دائیں ہاتھ موجود ایک راہ داری میں داخل ہوگئے۔ تقریباً بیس قدم کے فاصلے پر یہ راہ داری بائیں ہاتھ رخ بدلتی تھی۔ اس سے پہلے بائیں ہاتھ ہی ایک محرابی دروازہ آتا تھا ہم سب اس دروازے کی طرف بڑھ گئے۔

راہ داری کی بوڑھی دیواروں پر گویا ہزاروں آنکھیں اگ آئی تھیں جن کی سنسنی خیز لہریں میرے جسم پر سرسرا رہی تھیں۔ ہر قدم پر یوں لگتا جیسے ابھی کوئی دیوار پھٹے گی اور ایک صدیوں پرانی لاش ہمارے سامنے آ کھڑی ہوگی۔ یقیناً باقی سب کی

کیفیت بھی مجھ سے مختلف نہیں تھی۔

اس دروازے سے گزر کر ہم ایک گنبد نما چھت کے کمرے میں آ گئے جس کی سنگی دیواروں پر سنگ تراشوں کی صناعی کے شاہکار بکھرے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ کمرے کی دائیں اور سامنے کی سمت ایک ایک دروازے کی وضع کا خلا موجود تھا باقی کمرہ خالی تھا۔

ہم نے دائیں طرف کے خلا کا رخ کیا۔ یہ تقریباً پانچ فٹ عرض اور بیس فٹ طول کی راہ داری تھی جو آگے جا کر بائیں طرف کو رخ بدلتی تھی۔ ہم سب اسی سمت آگے بڑھ گئے۔

تقریباً دو گھنٹے ہم اسی طرح ان راہ داریوں میں چکراتے رہے۔ ہر راہ داری میں ایک کمرہ تھا اور ہر کمرے میں دو دروازے تھے جو راہ داریوں میں نکلتے تھے۔ دائیں طرف کی راہ داری گھوم کر سامنے کی سمت موجود دروازے کی طرف آ نکلتی تھی۔ اور وہاں سے گھومتی ہوئی آئندہ دروازہ کی بائیں سمت جاتی تھی اور اہرام کی مرکزی راہ داری سے متصل نکلتی۔

ان دو گھنٹوں کی تگ و دو نے مجھے قدیم مصریوں کی ذہانت اور فن تعمیر کا معترف کر دیا تھا۔ یہ کم حیران کن بات نہیں تھی کہ اس قدیم مصری دور میں جبکہ ریاضی کے اصول بھی وضع نہیں ہوئے تھے، اس کے باوجود تعمیر کا یہ کام اس خوب صورتی اور تکنیکی اصولوں کے مطابق ہوا تھا کہ اگر آج کے ریاضی دان غور کریں تو ان کی عقل کی گتھیاں الجھ کر رہ جائیں۔

راہ داریوں اور کمروں کو کچھ اس انداز میں آپس میں الجھایا گیا تھا کہ ہمارے ذہن بھی چکرا کر رہ گئے تھے۔ ہر راہ داری اور ہر کمرہ ایک ہی حجم اور ایک ہی بناوٹ کا تھا، ہر کمرے اور راہ داری میں سنگ تراشی بھی ایک ہی نوعیت کی تھی۔ یہ فیصلہ کرنا ناممکن تھا کہ ہم ابھی تک پہلے کمرے کے گرد ہی چکراتے پھر رہے ہیں یا کہ کہیں آگے پہنچ چکے ہیں۔

یونہی راہ داریوں میں چکراتے ہوئے ہم ایک ایسے دروازے نما خلا تک پہنچ

گئے جو پہلے دروازوں کی نسبت خاصا کشادہ تھا اور جس کے دائیں بائیں سنگی دیواروں پر کھدے ہوئے نقش و نگار میں ایک مخصوص ترتیب تھی۔ ہم بغیر کسی تاثر کے اس کمرے میں داخل ہو گئے مگر پھر جیسے ہی سرچ لائٹوں کی روشنی میں اندر کا ماحول روشن ہوا تو بے اختیارانہ طور پر مزدوروں کے حلق سے دہشت گزیدہ آوازیں خارج ہو گئیں۔ مجھے خود اپنے سینے کے اندر ایک دھچکا سا محسوس ہوا، دل ایک جھٹکے کے ساتھ حلق میں آ پھنسا اور شہ رگ دھڑک اٹھی۔

ہمارے سامنے کمرے کے فرش پر چند استخوانی ڈھانچے پڑے تھے۔ جن میں چار تو انسانی تھے، دو یقیناً پالتو جانوروں کے تھے۔ جو اپنی زندگی میں یہاں دفن ہستی کی تحویل و خدمت پر مامور رہے ہوں گے۔ وقت کی ودیعت کی ہوئی شکستگی نے ان کے جوڑ الگ الگ کر دیئے تھے۔

یہ کمرہ نسبتاً کشادہ تھا۔ کمرے کے وسط میں بنے چبوترے پر ایک جہازی سائز سونے کا پلنگ پڑا تھا جس کے اوپر سیاہ آبنوس کی لکڑی کا ایک تابوت رکھا تھا، جو قیمتی اور نایاب پتھروں سے مرصع تھا۔ لائٹوں کی تیز روشنی میں وہ پتھر قوت و قزح کے دامن میں رکھے ہوئے چراغوں کی مانند جگمگا اٹھے۔ پلنگ سے بھی سنہری لہریں چھچما اٹھیں۔ یوں لگا جیسے بے شمار رنگیں پروں والے پرندے پروں سے رنگ بکھیرتے ہوئے چھت کی جانب اڑے ہوں، ایک طرف چھ فٹ اونچے پتھر کے چبوترے پر راع دیوتا (سورج دیوتا...... قدیم مصری سورج کی عبادت کرتے تھے) کا ایک نادر روزگار مجسمہ نظر آ رہا تھا۔ بائیں طرف کی دیوار کے ساتھ فرعون مصر، اخناتون، کا برنجی مجسمہ ایستادہ تھا۔ (گزشتہ صدی کے شروع میں کھدائی کے دوران اخناتون کی ممی ملی تھی۔ اس کا مجسمہ (Louvre) کے عجائب گھر میں محفوظ ہے)۔ اس مجسمے کے دائیں ہاتھ اس کی ماں ''طیہ'' کا مجسمہ تھا۔ اور بائیں ہاتھ اس کی خوب صورت بیوی ''نوقرتیت'' کا۔

یہ وہی نوقرتیت تھی جو ''راع دیوتا'' کے بڑے پجاری ''آئی'' کی بیٹی تھی۔ (نوقرتیت کا مجسمہ برلن کے عجائب گھر میں محفوظ ہے۔ حال ہی میں قدیم

آفارنہ شہر کی کھدائی کے دوران بھی اس کا ایک مجسمہ ملا ہے اور یہ دنیا کا حسین ترین مجسمہ مانا گیا ہے)۔

دوسری جانب کی دیوار کے ساتھ نہایت حسین تراش کے اصفہانی خنجر لٹک رہے تھے جن کے دستوں پر ہیرے جگمگا رہے تھے۔ قدیم مصری معبودوں میں عبادت کے کام آنے والے پُراسرار ظروف جن پر قیمتی پتھر جڑے ہوئے تھے اور جانے کیا کیا یہاں موجود تھا۔ دیواروں پر قدیم مصری زبان میں ایک تاریخ کندہ تھی۔

اگر میں یہ زبان سمجھتا ہوتا تو نہ جانے کتنے اسرار میرے سامنے فاش ہو جاتے۔ مگر یہ بے ربط تصویریں میری سمجھ سے بالا تھیں۔ مگر یہ ماحول کچھ ایسا پُراسرار، اثر انگیز تھا کہ میرے اعصاب پر سحر انگیز کیفیت اتر پڑی۔ ہمارے اطراف عجیب سرسراہٹیں بیدار ہوگئی تھیں گویا صدیوں پرانی روحیں ہماری آمد پر مضطرب ہوگئی ہوں۔ اور مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں لمحوں کے سفر سے صدیوں کا فاصلہ طے کرتے ہوئے ماضی کے ان دھندلکوں میں آ پہنچا ہوں...... جہاں ''اخناتون'' زندہ تھا۔ جہاں اس کی ماں ''طیبہ'' تھی۔ جہاں اس کی بیوی ''نوفرتیت'' تھی۔

اخناتون کا اصل نام ''آمون ہوتپ چہارم'' تھا۔ اسے آمون سے اخناتون بنانے والی اس کی ماں ''طیبہ'' تھی اور طیبہ، رع دیوتا کے پہلے بڑے پجاری ''اتریکا'' کی بیٹی تھی اور کبھی خود بھی رع دیوتا کے معبد میں ایک پجارن رہی تھی۔

میں نے مشہور مورخ جوزف وارڈ کی ایک تصنیف میں پڑھ رکھا تھا کہ طیبہ شروع میں پجارن تھی اور اس کا بڑا بھائی بھی رع کے معبد میں پجاری تھا۔ لہٰذا طیبہ شروع ہی سے ''آمون دیوتا'' کے بجائے رع دیوتا کی طرف مائل تھی اور اس کی ساری ہمدردیاں رع دیوتا کے نام تھیں۔

طیبہ کی شادی کے کچھ ہی عرصہ بعد اس کا باپ مر گیا لہٰذا رع دیوتا کے معبد کا بڑا پجاری ''اتریکا'' کے بیٹے اور طیبہ کے بڑے بھائی کو بنا دیا گیا۔

طیبہ رع دیوتا سے ایسی رغبت اور محبت رکھتی تھی کہ جب اس کے ہاں اس کا

بیٹا آمون ہوتپ چہارم پیدا ہوا تو اس نے اسے رع دیوتا کے معبد میں اپنے بھائی کے پاس بھیج دیا تا کہ اس کی پرورش رع دیوتا کے پجاریوں کی نگرانی میں ہو۔اور وہ رع دیوتا کا معتقد بن کر رہے لیکن جلد ہی طیہ کا بڑا بھائی اور رع دیوتا کے معبد کا بڑا پجاری مر گیا اور اس کی جگہ ''آئی'' نام کے پجاری کو رع دیوتا کا بڑا پجاری بنایا گیا۔لہٰذا طیہ نے آمون ہوتپ چہارم کو آئی کے حوالے کر دیا۔آمون ہوتپ چہارم اکثر آئی کے ہاں ہی رہتا تھا۔آئی کی ایک بیٹی تھی ''نوفرتیت'' اکٹھے رہنے کی وجہ سے یہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے۔لہٰذا کمسنی میں ہی ان کی شادی کر دی گئی۔ جب آمون ہوتپ چہارم اپنے باپ آمون ہوتپ سوئم کی موت کے بعد بادشاہ بنا تو اس کی ماں نے اسے ایک روز بلا کر کہا۔

''اے میرے بیٹے......! رع دیوتا کا پرانا نام ''آتون'' ہے۔

جس کے معنی ہیں ''سورج'' قدیم دور میں رع کی پرستش آتون کے نام سے ہی کی جاتی تھی اب لوگ رع کے اس پرانے نام کو بھولتے جا رہے ہیں لیکن میں اس کے اس پرانے نام کو دوبارہ شہرت دے کر زندہ کروں گی۔ لہٰذا اے میرے بیٹے......! آج سے تیرا نام آمون ہوتپ نہیں بلکہ ''اخناتون'' ہے۔اے میرے بیٹے......! اخناتون کے معنی ہیں ''آتون دیوتا کی روح۔''

اور یوں آمون ہوتپ چہارم اخناتون بن گیا۔

میری سحر زدہ نظریں دوبارہ کمرے کے وسط میں موجود سونے کے پلنگ پر رکھے سیاہ آبنوسی تابوت پر مرتکز ہو گئیں۔ اس خیال سے ہی نظام تنفس گڑبڑا گیا تھا کہ اس سیاہ تابوت میں ایک صدیوں پرانی لاش پڑی ہے، ہم سب آہستہ آہستہ قدموں سے آگے بڑھے،سب عجیب سنسنی خیز کیفیت کا شکار تھے اور یوں قدم اٹھا رہے تھے کہ اگر ہلکی سی آہٹ بھی پیدا ہوئی تو تابوت کے اندر موجود ہستی ڈھکن اٹھا کر باہر نکل آئے گی۔

مزدور پھٹی پھٹی آنکھوں سے کمرے میں موجود ساز و سامان کو دیکھ رہے تھے۔ایک ایک چیز سے ہیبت ٹپک رہی تھی۔مزدور سونے کے پلنگ کو چھو چھو کر محسوس

کر رہے تھے۔ تابوت کے ڈھکن پر ہیروں کو ترتیب وار انداز میں جوڑ کر کوئی نام لکھا گیا تھا۔ یقیناً اس کا، جس کی لاش اس تابوت میں موجود تھی۔

''صاحب جی......!اب کیا کرنا چاہئے......؟ کیا اس تابوت کو کھولا جائے......؟'' ایکیلاس کا لب ولہجہ جانے کن احساسات کی وجہ سے بدلا ہوا تھا۔

میں نے ایک طائرانہ نظر سے کمرے میں موجود تمام اشیاء کا جائزہ لیا پھر جواب دیا۔

''ایکیلاس......! ایسا کرو اس تابوت کو اٹھوا کر مرکزی راہ داری میں لے چلو اسے وہیں چل کر کھولیں گے۔ اور عبدل......! تم باقی کا تمام سامان سمیٹ لو......!''

میری بات پر تمام مزدور حرکت میں آ گئے۔ چند مزدور ایکیلاس کے ساتھ تابوت پلنگ سے نیچے اتارنے لگے اور چند مزدور عبدل کے ساتھ دیگر ساز و سامان سمیٹنے لگے۔

کمرے سے نکلنے کے بعد اندیشہ تو تھا کہ مرکزی راہ داری تک پہنچنے کے لئے بڑی مغز ماری کرنا پڑے گی مگر ایسا نہیں ہوا۔ ہم بآسانی راہ داری میں نکل آئے۔ یہ راہ داری کا آخری حصہ تھا جہاں کہ فرش پر یوساف کا خون جما ہوا تھا۔ حیرت، سنسنی اور خوف کے ملے جلے احساسات خون میں گھل گئے مگر ہم بغیر رکے اہرام کے بند دروازے کی سمت بڑھ گئے۔ تابوت اچھا خاصا وزنی تھا۔ یوں جیسے اس کے اندر ایک بے جان وجود نہیں بلکہ پتھر بھرے ہوئے ہوں۔

مردہ صدیاں بیدار ہو اٹھی تھیں۔ ہزاروں سال سے ساکت وقت کی نبضیں پھر سے چل پڑیں۔ صدیوں پہلے وقت کا رک جانا والا دل پھر سے دھڑک اٹھا تھا۔ ہزاروں سال کے درمیان حائل اسرار کی دیواریں گویا تحلیل ہو گئیں، رگ و جاں میں ایک عجیب کیفیت طاری تھی۔ ہزاروں سال پرانا ماضی اور حال سمٹ کر آپس میں مدغم ہو رہے تھے اور اس سچویشن نے میرے دل و دماغ پر ایک ایسی انوکھی کیفیت طاری کر دی تھی کہ جو بیان کی حدود و قیود سے ماورا ہے...... ایک...... ایک انجانی سی خوشی تھی، ایک خوف، اضطراب، سنسنی، حیرت، تجسس، پریشانی، یہ سب کیفیتیں مل کر ان کے یکجاں ہونے کے بعد جو کیفیت جنم لیتی ہو گی ان لمحوں میں اسی کیفیت کے زیر اثر

تھا۔

تمام مزدور بھی خاموش چل رہے تھے۔ سب کی زبانیں گنگ تھیں۔ ہونی ہی تھیں؟

فرعونوں کا جاہ وحشم ...... ظلم وستم ...... سحر واسرار ...... طمطراق۔

اہرام کے بند دروازے کے پاس پہنچ کر تابوت فرش پر رکھ دیا گیا۔ برنجی مجسمے اور دیگر نوادرات بھی ایک طرف ڈھیر کر دیئے گئے۔

''صاحب جی ......! کیا اس میں کسی فرعون کی ممی ہے ......؟ کیا اب اسے کھولیں گے ......؟ یا یوں ہی یہ یہاں پڑا رہے گا ......؟'' عبدل نے مجھے مخاطب کیا۔

''اسے یہاں تک اٹھا کر لائے ہیں تو اس کے اندر بھی جھانک کر ضرور دیکھیں گے کہ اس میں استراحت فرمانے والی ہستی ہے کیسی ......؟ اسی کے باعث تو ہم موت کے بھیانک جبڑوں میں پھنسے ہیں۔''

میں نے کہا اور تابوت پر جھک گیا۔ تابوت کو بند کرنے کے لئے ڈھکن میں بارہ پیتل کے کیل ٹھونکے گئے تھے۔ میں نے نوادرات میں سے ایک خوفناک شکل کا بھاری خنجر اٹھایا اور کیل نکالنے کی کوششیں کرنے لگا۔ میری دیکھا دیکھی عبدل، ایکیلاس اور مزید مزدور بھی اس کوشش میں مصروف ہو گئے۔

خنجروں کی دھار سے کیلوں کے آس پاس سے تابوت کی لکڑی تھوڑی چھیلنا پڑ رہی تھی اس کے بعد ابھر آنے والی کیل کی کیپ کے نیچے خنجر پھنسا کر کیل کو لکڑی سے کھینچنا بڑا دقت طلب کام تھا۔ مگر ہم نے ہمت نہیں ہاری اور اپنی کوششوں میں لگے رہے۔

مزدور کھانس رہے تھے، کھنکار رہے تھے مگر صورت حال کی سنگینی کو وہ پوری طرح محسوس نہیں کر رہے تھے۔ مگر میری تشویش بڑھتی جا رہی تھی۔ ان کی یہ کھانسی میرے دماغ میں خطرے کے الارم بجا رہی تھی۔ زندگی کی روشنی بڑی برق رفتاری سے ان سے دور ہو رہی تھی اور موت کے اندھیرے بڑی سرعت سے بڑھتے آ رہے تھے اور اب تو میرے اپنے حلق اور نتھنوں میں جلن شروع ہو گئی تھی یوں لگ رہا تھا

جیسے ناک کی اندرونی جلد سلگنے لگی ہو۔

ہم پانچ افراد تابوت میں سے کیل نکالنے میں مصروف تھ جبکہ باقی کے مزدور قریب خاموش کھڑے تھے۔ پھر سب سے پہلے ایکیلاس کیل نکالنے میں کامیاب ہوا۔اس کے حلق سے مسرت انگیز آواز خارج ہوئی اور آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی۔

پیتل کا وہ کیل تقریباً چھ انچ لمبا تھا۔ دوسرا کیل عبدل نے نکالا۔ تیسرا میں نے اور پھر ایک ایک کر کے کیل نکلنے لگے۔ انگلیاں دکھنے لگی تھیں، بازوؤں میں اینٹھن ہونے لگی اور آخرکار کوئی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کی مشقت کے بعد ہم تمام کیل تابوت سے نکال لینے میں کامیاب ہو گئے۔اب تابوت کا ڈھکن بجز کسی دقت کے اٹھایا جا سکتا تھا۔

مزدوروں کے چہروں پر سراسیمگی کے تاثرات امنڈ آئے۔ سب کی نظریں کبھی میری جانب اٹھتیں اور کبھی تابوت پر جم جاتیں جیسے اس میں سے ملک الموت آزاد ہونے والا ہو۔

میں پسینہ صاف کرتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

''عبدل......! ایکیلاس......! ڈھکن ہٹا دو۔'' میری بات پر ایک لمحے کو دونوں ہچکچائے پھر تابوت پر جھک گئے۔

اس سے پہلے کہ وہ ڈھکن ہٹاتے ایک مزدور تقریباً چیخ اٹھا اور ہم سب ہی ہڑبڑا گئے۔

''نن...... نہیں...... یہ...... یہ ڈھکن نہیں ہٹانا...... تابوت مت کھولنا۔ ایکیلاس اس سندر لاش کو ننگا نہیں کرو، ورنہ ہم کسی مصیبت کا شکار ہو جائیں گے۔''

اس کے اس طرح اچانک چیخنے ہم بوکھلا کر رہ گئے کہ یہ کیا افتاد آن پڑی ہے مگر پھر اس کی بات سن کر ایکیلاس ناگوار لہجے میں اس سے مخاطب ہوا۔

''یافان......! یہ کیا حماقت ہے......؟ کیا ہم پہلے مصیبت کا شکار نہیں ہیں۔ اب اور بھلا کیا مصیبت ہمیں شکار بنائے گی......؟''

''نہیں...... خدا کے لئے تم یہ تابوت مت کھولو ایکیلاس......! ورنہ اور کوئی بڑی مصیبت نازل ہو جائے گی...... ہم...... ہم کسی عذاب میں مبتلا ہو جائیں گے......تم یہ ڈھکن مت ہٹاؤ۔''

''ہو لینے دو عذاب نازل...... بھگت لیں گے۔ ویسے بھی اب ہم یہاں سے زندہ سلامت تو باہر نکل نہیں پائیں گے۔ مرنے سے پہلے کسی عذاب سے بھی دل لگی ہو جائے تو یہ بھی زندگی کا بخشا اعزاز ہوگا...... پکڑو عبدل......! اٹھاؤ ڈھکن۔'' آخری الفاظ اس نے عبدل کو مخاطب کر کے کہے۔

''نہیں ایکیلاس......!'' یافان حلق کے بل چیخا تو اسے کھانسی کا دورہ پڑ گیا اور کھانستا ہوا ایک طرف راہ داری کی دیوار کے ساتھ گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔

ایکیلاس اور عبدل نے تابوت کا ڈھکن تھام لیا۔

میں تابوت کے قریب ہی کھڑا تھا اور میرا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اندر صرف ایک مردہ وجود، ایک لاش ہوگی اس کے باوجود مجھے ایک انجانا سا خوف محسوس ہو رہا تھا اور یوں لگ رہا تھا جیسے راہ داری میں ہمارے اردگرد نادیدہ وجود منڈلانے لگے ہوں۔

ایکیلاس اور عبدل نے ایک جھٹکے سے تختہ اٹھا کر ایک طرف پھینک دیا۔ صندل اور کافور کی تیز خوشبو آزادی ملتے ہی راہ داری میں پھیل گئی۔ سب کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے اور ایک دوسرے کی صورت دیکھنے لگے، ہمارا تو خیال تھا کہ اندر سرتا پا سفید پٹیوں میں ملفوف ایک دہشت ناک لاش لیٹی استراحت فرما رہی ہوگی مگر اندر کوئی لاش تو نہ تھی...... تابوت میں کسی ممی کی بجائے ایک مجسمہ لیٹا ہماری شکلیں دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا جیسے ہمارا مذاق اڑا رہا ہو۔ کسی حسین ترین دوشیزہ کا خالص سونے کا بنا ہوا مجسمہ سرچ لائٹوں کی روشنی میں چمک رہا تھا۔ بنانے والے نے غضب کی چیز بنائی تھی۔ جیسے کہ اپنی تمام زندگی اس ایک مجسمے پر ہی خرچ کر گیا تھا۔

ایک نظر میں تو یہی لگتا تھا جیسے جیتی جاگتی کسی دوشیزہ پر سونے کی پالش کر کے اسے تابوت میں لٹا دیا گیا ہو۔ ایک ایک عضو کو اس دلجمعی اور محبت سے ڈھالا گیا

تھا کہ یقین نہ آئے، وہ مجسمہ خواب وصل جیسا نشہ انگیز تھا۔اس کے چہرے پر طلسمات جہاں کا سا صیقل پن اور جلا تھی...... اس کی ساکت بے جان آنکھوں میں شمع شبستان اور اسرار خمستان جیسی رعنائی اور کشش تھی۔ تابوت کا ڈھکنا ہٹتے ہی یوں لگا جیسے راہ داری میں حسن کا سیلاب، روح کی شادمانی اور صولت وسطوت پھیل گیا ہو۔ایک نشہ پرور...... حواس سلب...... ایک پاگل کر دینے والی مسکراہٹ اس دوشیزہ کے ہونٹوں پر ثبت کر دی گئی تھی۔ان لمحات میں ایک نظم پوری شدت کے ساتھ میرے دماغ میں گردش کر رہی تھی۔

اے سیہ فام حسینہ تیرا عریاں پیکر
کتنی پتھرائی ہوئی آنکھوں میں غلطیدہ ہے
جانے کس دور المناک سے لے کر اب تک
تو کڑے وقت کے زندانوں میں خوابیدہ ہے
تیرے شبرنگ ہیولے کے یہ بے جان نقوش
جیسے مربوط خیالات کے تانے بانے
یہ تیری سانولی رنگت یہ پریشان خطوط
بارہا جیسے مٹایا ہو انہیں دنیا نے
ریشۂ سنگ سے کھینچی ہوئی زلفیں جیسے
راستے سینۂ کہسار پہ بل کھاتے ہوں
ابروؤں کی جھکی محرابوں میں جامد پلکیں
جس طرح تیر کمانوں میں الجھ جاتے ہیں
منجمد ہونٹوں پہ سناٹوں کا سنگین طلسم
جیسے نایاب خزانوں پہ کڑے پہرے ہوں
تند جذبات سے بھرپور برہنہ سینہ
جیسے ستانے کو طوفان ذرا ٹھہرے ہوں
جیسے یونان کے مغرور خداوندوں نے

ریگزاران حبش کی کسی شہزادی کو
تشنہ روحوں کے ہوسناک تعیش کے لئے
حجلۂ سنگ میں پابند بنا رکھا ہو

فرق صرف سنگ اور دھات کا تھا۔ ہم سب بے خودی کے عالم میں یک ٹک اسے دیکھے جا رہے تھے۔ کتنی مضحکہ خیز بات تھی مگر وہ مجسمہ اپنے اندر اتنا ہی حسن اور اتنی ہی دلکشی سمیٹے ہوئے تھا کہ دیکھنے والی ہر آنکھ پر از خود بے خودی طاری ہوگئی تھی۔

میں سوچ رہا تھا کہ یہ مجسمہ ہے، اگر یہی دوشیزہ خود روبرو آجائے تو کیا دل پھٹ نہ جائے گا؟

''صاحب......! اس پر بھی کوئی قدیم تحریر کندہ ہے۔'' ایکیلاس تابوت پر جھک کر مجسمے کو بغور دیکھتے ہوئے گویا ہوا، تو میں بھی جھک گیا۔ واقعی مجسمے کے پورے وجود پر باریک نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔

''صص...... صاحب......! صاحب جی......!'' ایک دہشت زدہ آواز پر میں چونک پڑا اور پھر جو منظر میں نے دیکھا اس نے میرے رونگٹے کھڑے کر دیئے۔ راہ داری کی دیوار کے ساتھ یافان آڑا ترچھا سا بے حس و حرکت پڑا تھا اس کی پھٹی ہوئی آنکھیں چھت کی جانب مرتکز تھیں اور ناک منہ سے باریک باریک سرخ لکیروں کی صورت خون رس رہا تھا۔ وہ دم توڑ چکا تھا۔

موت کی دیوی نے اپنے کھیل کا آغاز کر دیا تھا۔ ایک جام زندگی کی شراب سے خالی ہوگیا تھا اور باقی اپنی باری کے منتظر تھے۔

بے بسی کی کربناک موت کے تصور سے ہی ہم سب کے چہروں پر زردیاں کھنڈ گئیں۔ اجسام کے زندانوں میں مقید روحیں کسمسانے لگیں اور کسمساہٹ کے اس ارتعاش نے ہمارے تمام حوصلے، اور بے فکری کے تمام نقوش کھرچ کر رکھ ڈالے، اسرار کھوج نکالنے کا تمام تجسس جیسے پل بھر کہیں تحلیل ہوگیا اور ہمیں اپنی زندگی کی بقا کی فکر نے دبوچ لیا۔

ہم میں سے کسی کو بھی اپنے ایک ساتھی کی موت کا کوئی تاسف نہیں تھا بلکہ

اپنی اپنی فکر تھی کیونکہ وہ ایک ساتھ ہمارے لئے آئینہ بن گیا تھا اور ہم اس آئینے میں اپنا انجام دیکھ رہے تھے۔

''صاحب جی.....! انسان کوشش کرے تو کیا نہیں ہو سکتا؟ ہمیں اس اہرام میں مدفن نوادرات کو بھول کر اپنی زندگیوں کے لئے تگ و دو کرنا چاہیئے۔ زندگی ہے تو ایسے سینکڑوں اہرام کھنگالے جا سکتے ہیں اور اگر زندگی نہ رہے تو ان تابوتوں اور مجسموں سے کیا حاصل.....؟'' عبدل کا لہجہ بہت بجھا بجھا سا تھا۔

میں خاموشی سے ہونٹ کاٹتا رہا تو عبدل دوبارہ گویا ہوا۔

''صاحب جی.....! مایوسی گناہ ہے، ناامیدی کفر ہے۔ ہمیں کوشش کرنا چاہیئے شاید خلاصی کی کوئی راہ سجھائی دے جائے۔''

''کدھر سے راہ سجھائی دے گی عبدل.....! تم ہی بتا دو میری عقل تو کام نہیں کر رہی۔''

''صاحب جی.....! آپ دروازے کا معائنہ کریں پتا نہیں کیوں میرا دل کہتا ہے کہ یہ اندر سے بھی کھل سکتا ہے اور اس کا کوئی نہ کوئی طریقہ کار ضرور ہوگا۔''

میں نے ایک ذرا عبدل کی جانب دیکھا۔

''عبدل ٹھیک کہہ رہا ہے صاحب جی.....! کوشش کرنے میں کیا حرج ہے.....؟'' ایکیلاس نے بھی عبدل کے خیال کی تائید کی تو میں اہرام کے بند دروازے کی سمت بڑھ گیا۔ عبدل، ایکیلاس اور تمام مزدور بھی میرے ساتھ ہی دروازے کی سمت بڑھے۔ مجھے یقین تھا کہ یہ دروازہ کسی صورت نہیں کھلے گا، دروازے کی جگہ موجود چٹان کسی طرح بھی اپنی جگہ سے نہیں ہٹے گی۔ اس کے باوجود میں دروازے کی جگہ موجود اس ٹھوس چٹان کا جائزہ لینے لگا جس نے ہم پر زندگی کے راستے بند کر دیئے تھے۔

کہیں کوئی درز، کوئی ہلکا سا رخنہ تک نہیں تھا۔ ایک سپاٹ پتھریلی دیوار تھی۔ میں نے اس دیوار کے مختلف حصے ٹٹولنے اور دبانے شروع کر دیئے۔ کافی دیر کی کوشش کے باوجود کوئی نتیجہ نہیں نکلا تو میں اضطراری طور پر ٹہلنے لگا۔ تمام مزدور

آنکھوں میں امید بیم کی تصویریں سمیٹے میری جانب دیکھ رہے تھے۔

گھٹن اور حبس کا احساس ہر لحظہ قوی ہوا جا رہا تھا۔ سینے میں جیسے درد بوجھ بن کر بیٹھا جا رہا تھا اور سانسوں میں کسی نے گندھک کا تیزاب پھونک دیا تھا۔

حلق میں خارش، نتھنوں میں ایک عجیب سی جلن شروع ہوگئی تھی۔ روحیں گویا اجسام کی صلیبوں پر مصلوب ہوکر رہ گئی تھیں۔اطراف میں بھی موت کے نادیدہ سائے رقصاں تھے اور وجود کے اندر بھی موت کی دیوی جیسے نقب لگا کر بیٹھ گئی تھی جو اعصاب میں دوڑتی ہوئی زندگی کو دیمک کی مانند چاٹ رہی تھی۔

بار بار حلق میں خارش سی ابھرتی اور کھانسی کا دورہ پڑ جاتا مزدور بھی گلے کھنکار رہے تھے،کھانس رہے تھے۔ میرا دماغ تھا کہ جمناسٹک میں مصروف تھا مگر سوچ کے خانے ماؤف تھے کچھ سمجھ نہ آرہی تھی کہ کیا کیا جائے؟

وقت یونہی گزرتا گیا اور مزدوروں کا ضبط جواب دے گیا۔میرے ہزار منع کرنے کے باوجود وہ دروازے کی جگہ موجود پتھریلی چٹان پر ٹوٹ پڑے۔ پہلے تو محض زور آزمائی کرتے رہے مگر لحظہ بہ لحظہ ان پر وحشت سوار ہوتی گئی۔ وہ ہذیان بکنے لگے، چیخنے چلانے لگے پھر راہ داری میں پڑے نوادرات پر جھپٹے۔خنجر، تلوار، مجسمے، جس کے ہاتھ جو لگا وہ اٹھا کر اس ٹھوس چٹان پر حملہ آور ہوگیا۔اہرام کا گہرا سکوت نہ جانے کس کھائی میں جا گرا، تمام ہیبت جیسے اچانک کرچی کرچی ہوگئی۔اہرام کے اندر ایک شور تسخیر بپا ہوگیا۔

میں اپنا آپ بچاتے ہوئے دروازے کے قریب سے ہٹا اور راہ داری میں پڑے تابوت کی جانب بڑھ گیا۔اچانک کھانسی کا شدید دورہ بیدار ہوا اور میں تابوت میں پڑے سنہرے مجسمے پر جھکتا چلا گیا۔

کھانسی کا جیسے سیلاب اٹھا تھا جو حلق کے درمیان کہیں الجھ کر رہ گیا تھا۔میں بری طرح کھانستا رہا مگر کھانسی رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی، آنکھوں میں پانی بھر آیا، حلق جیسے اندر سے کٹنے لگا، سینے کی گہرائیوں میں کہیں دھماکے سے شروع ہوگئے۔ سب سے پہلے میرے مواصلاتی حواس معطل ہوئے۔ راہداری میں گونجنے والا شور

دھیرے دھیرے مدھم پڑتا گیا اور میرے کھانسنے کی آواز ہر آواز پر حاوی ہوتی گئی اور کچھ ہی دیر بعد صرف میرے کھانسنے کی آواز زندہ رہ گئی یا پھر ایک گھن گرج...... گرج......؟ یا دھماکے......؟ دھماکے......! گرج......؟ جو میرے سینے کی گہرائیوں سے جنم لے رہے تھے۔ پھر شاید ان دھاکوں نے میرے پھیپھڑے...... دل...... کلیجہ...... سینہ سب کچھ پھاڑ کر رکھ ڈالا اور میں خلا میں ہاتھ پاؤں مارتا ہوا کہیں سمندر کی اتھاہ تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔ اندھیرا...... سناٹا...... مہیب سکوت......!

☆☆☆

حواس غارت ہونے سے قبل جس اذیت نے میری روح کو رگیدا تھا اس کے زیر اثر میں نے آخری نتیجہ جو اخذ کیا تھا وہ یہی تھا کہ مسلسل کھانسنے اور آکسیجن کی کمی کے باعث میرے پھیپھڑے پھٹ گئے ہیں، منہ سے خون کا فوارہ ابل پڑا ہے۔ زندگی کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا ہے اور میں موت کے تاریک سمندر کی اتھاہ گہرائیوں میں کہیں ڈوبتا جا رہا ہوں۔

اس کے بعد تو مجھے اپنی کوئی خبر رہی اور نہ اپنے ساتھ اہرام میں مقید دوسرے افراد کی۔ بے حسی اور لاعلمی کے یہ سیاہ پردے جانے کتنی مدت تک مجھے لپیٹے رہے پھر جب مجھے ان پردوں سے نجات ملی یہ سیاہیاں چھٹی تو میں نے خود کو اپنے ہی ہاسپٹل کے آئی۔سی۔یو میں پایا۔

میرے منہ پر گیس ماسک لگا ہوا تھا پھر ایک پُرمسرت آواز میرے کانوں سے ٹکرائی جو میری نسوں میں زندگی کا پیغام لے کر سرائیت کر گئی۔ میرے خوابیدہ سے حواس برق رفتاری سے بیداری کی جانب لپکے۔

''شکیل صاحب ہوش میں آ رہے ہیں۔'' آواز نوجوان ڈاکٹر اختر انصاری کی تھی۔ غالباً کسی کو مخاطب کیا گیا تھا۔ میں نے زاویہ نگاہ بدلا۔ چند متفکر چہرے لپک کر میرے قریب آ گئے ان میں خوب صورت جوان اختر انصاری تھا۔ سینئر ڈاکٹر عقیل بن عاص تھے۔ دوسرے ڈاکٹر ''عارب وقاص'' تھے اور چوتھی جو شخصیت تھی ان پر نظر پڑتے ہی میں چونکے بغیر نہ رہ سکا، وہ پروفیسر فاضل بصاری تھے۔

ڈاکٹر عقیل، عارب اور اختر انصاری تینوں کے چہروں پر مسکراہٹ رینگ گئی البتہ پروفیسر کی گہری آنکھوں سے تشویش کے سائے تو ہٹ گئے مگر چہرے پر سنجیدگی چھائی رہی۔

میں نے خود کو پوری طرح فریش محسوس کرتے ہوئے منہ سے ماسک ہٹا دیا۔

''تھینکس گاڈ......! آپ ہوش میں تو آئے۔'' ڈاکٹر عقیل نے گہری سانس لی۔

''اب آپ کیسا محسوس کر رہے ہیں......؟'' اختر انصاری میرے مزید قریب آ گیا۔ میں نے حلق اور نتھنوں کی جلن کو محسوس کیا مگر ایسا کوئی احساس نہیں تھا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''بالکل پرفیکٹ......مگر...... میں...... یہاں تک کیسے پہنچا......؟'' حیرت میرا انداز تھی۔

''اور پروفیسر صاحب......! آپ......؟'' میں اپنا جملہ مکمل نہیں کر سکا۔

''یہ آپ کی خوش بختی تھی شکیل صاحب......! جو پروفیسر یہاں چلے آئے، وگرنہ شاید جب تک ہم آپ تک پہنچتے آپ کہیں اور پہنچے ہوئے ہوتے......؟'' ڈاکٹر عارب نے اپنے مخصوص گھمبیر لہجے میں کہا تو ان کا اشارہ سمجھتے ہوئے میرے حرام مغز میں کہیں برف کی ڈلی سی چٹخی۔

''عارب صاحب......! آپ اسے پروفیسر اور شکیل صاحب کی محبت کا نام بھی دے سکتے ہیں۔''

''وہ کہتے ہیں نا کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ ادھر شکیل صاحب مصیبت میں پھنسے اور ادھر پروفیسر مضطرب ہو کر یہاں ان سے ملنے کی غرض سے چلے آئے۔ ہے کہ نہیں کمال کی بات......؟'' اختر انصاری کی عادت ہی کچھ ایسی تھی۔ وہ ہر وقت ہنسنے ہنسانے والا بندہ تھا۔

''اور وہ مزدور ...... عبدل...... ایکیلاس...... وہ سامان...... اس کا کیا بنا......؟'' میری بات پر سب سنجیدہ ہو گئے پھر کسی اور کے بولنے سے پہلے پروفیسر

صاحب بول پڑے۔

''پہلے تو تم یہاں سے اٹھو..... کوئی اور سوال نہ کرنا، باہر پولیس اور انٹیلی جنس کے کچھ آفیسر موجود ہیں۔ تمہیں ان کے سامنے بھی جوابدہ ہونا ہے۔'' پروفیسر صاحب کی بات سن کر میں بری طرح چونک پڑا۔

''پولیس..... انٹیلی جنس.....؟''

''ہاں.....! تم نے بہت بڑی حماقت کا ثبوت دیا ہے۔ ساڑھے چار ہزار سال پرانا اہرام دریافت کر لیا اور کسی کو خبر تک نہیں کی، کم از کم مجھے تو آگاہ کر دیتے۔'' پروفیسر صاحب نے خفگی کا اظہار کیا۔

''پروفیسر صاحب.....! میں آپ کی طرف آنے ہی والا تھا کہ صورت حال کچھ اس تیزی سے تبدیل ہوئی کہ ہم اہرام کے اندر محبوس ہو کر رہ گئے۔ اس کے بعد اب آپ کے سامنے ہی ہوش آ رہا ہے۔''

''تم نے جب کھدائی کا ارادہ کیا تھا، تمہیں اس وقت چاہیے تھا کہ تم میرے پاس آتے یقیناً میں تمہیں اچھا مشورہ دیتا۔''

''پروفیسر صاحب.....! میرے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہاں کوئی اہرام مدفن ہوگا۔ وہ تو پہلے کھدائی کرنے والوں کا ایک مزدور زخمی حالت میں یہاں آیا تھا تو ان کے سپروائزر نے کچھ ایسے ناقابل یقین واقعات کا تذکرہ کیا کہ میں تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہاں جا پہنچا۔ یہ کھدائی تو محض ایک بہانہ تھا، حقیقت تو یہ تھی کہ میں وہاں کچھ عرصہ گزارنا چاہتا تھا۔ اور ان واقعات کا مشاہدہ کرنا چاہتا تھا جو اس نے میرے سامنے بیان کیے تھے۔

اب یہ اتفاق رہا کہ یہاں سے اہرام برآمد ہو گیا اور ہم نے اہرام کے اندر سے ایک تابوت اور کچھ نوادرات بھی حاصل کر لیے تھے۔ اہرام کا اکلوتا دروازہ بند ہو چکا تھا۔ اہرام کے اندر ایک تو آکسیجن کی کمی دوسرا زہریلی فضا جس کے باعث میں بے ہوش ہو گیا۔ اس کے بعد مجھے اب آپ کے سامنے ہوش آ رہا ہے۔'' میں نے مختصراً حال کہہ سنایا۔

''آپ چار گھنٹے کی طویل بے ہوشی کے بعد ہوش میں آ رہے ہیں۔اس دوران وہ سونے کے مجسمے والا تابوت اور نوادرات ہم پوری راز داری کے ساتھ آپ کی خواب گاہ تک پہنچا چکے ہیں۔'' ڈاکٹر عقیل نے مجھے مخاطب کیا تو میں ان کی جانب متوجہ ہوگیا۔

''ان نوادرات کے متعلق کسی کو علم نہیں اس بات کا خیال کیجئے گا۔''

''مگر یہ پولیس...... انٹیلی جنس کیوں......؟ ان کو کیسے خبر ہوگئی......؟'' میں نے متفکر لہجے میں سوال کیا۔

''انہیں میں نے خبر کی ہے۔'' پروفیسر صاحب کی بات پر میں حیرت زدہ ہوگیا۔

''آپ نے......؟''

''ہاں......میں نے...... اور ایسا میں نے تمہارے بھلے کے لئے کیا ہے۔''

پروفیسر صاحب کی بات پر میں محض سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھتا رہ گیا۔

''ایک اہرام کا دریافت ہو جانا کوئی معمولی بات نہیں ہے شکیل صاحب......!اور ایسی باتیں چھپائے نہیں چھپتیں۔ آج نہیں تو کل یہ خبر پھیلنی ہی تھی اب انتظامیہ اور آثارِ قدیمہ والوں تک یہ اطلاع تمہاری طرف سے پہنچی ہے۔کل اگر یہی اطلاع ان تک کسی اور ذریعے سے پہنچتی تو تمہارے لئے سخت مشکلات پیدا ہو جاتیں۔کہیں سے کچھ بھی برآمد ہو تو وہ حکومت کی ملکیت ہے اور اگر حکومت سے چوری خفیہ طور پر کہیں کھدائی کر کے کوئی خزانہ یا نوادرات کوئی شخص حاصل کرتا ہے اور حکومت کو اس سے بے خبر رکھتا تو یہ قانونی طور پر جرم ہے اور ایسا کرنے والے کے خلاف حکومت کوئی بھی سخت قدم اٹھا سکتی ہے۔ بات عقل میں آئی یا نہیں......؟''

''میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں پروفیسر صاحب......! مگر مسئلہ تو اب بھی کھڑا ہو جائے گا......؟'' میں نے پریشانی سے کہا۔

''کیا مسئلہ کھڑا ہو جائے گا......؟''

''وہ...... وہ تابوت اور نوادرات جو میری خواب گاہ تک پہنچائے گئے ہیں۔''

''تو پھر ...... کیا ہے ان کو ......؟''

''پروفیسر صاحب ......! جب انتظامیہ والوں کو اہرام کے اندر کچھ ملے گا ہی نہیں تو وہ تو پھر مجھ پر چڑھ دوڑیں گے۔''

''نہیں ...... ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ اس بات سے تم بے فکر رہو۔ انہیں اہرام کے اندر سے مزید نوادرات بھی مل جائیں گے فی الوقت تو تم اپنے ذہن کو صرف اس بات پر تیار کر لو کہ جو آفیسرز تمہارے منتظر ہیں ان کو تم نے کس طرح مطمئن کرنا ہے، اور ایک بات سے میں تمہیں اور آگاہ کر دوں کہ ......'' پروفیسر اچانک خاموش ہوئے تو میرا دل ایک انجانے سے خوف سے دھڑک اٹھا۔ ان کے چہرے پر گہری سنجیدگی سمٹ آئی۔

''کیا بات ہے پروفیسر صاحب ......! آپ اس طرح خاموش کیوں ہو گئے ......؟'' میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھا۔

چند لمحوں کے توقف کے بعد پروفیسر صاحب گھمبیر لہجے میں گویا ہوئے۔

''شکیل ......! تمہارے ساتھ جو مزدور اہرام کے اندر پھنس گئے تھے ان میں سے صرف تین زندہ بچے ہیں۔ عبدل اور ایکیلاس کو بھی اہرام نے نگل لیا ہے۔'' پروفیسر صاحب کے کہے ہوئے الفاظ پگھلے ہوئے لوہے کی طرح میرے کانوں میں اترے۔ کنپٹیوں کے اندر دھماکے سے ہونے لگے اور میں اپنی جگہ ساکت رہ گیا۔ عبدل ...... ایکیلاس اور دوسرے مزدوروں کے چہرے میری نظروں کے سامنے نمودار ہو گئے۔ زندگی کے لئے زندہ رہنے کے لئے کتنا مچل رہے تھے وہ۔ موت کا کیسا خوف جما ہوا تھا ان کے چہروں پر۔ کتنی حسرتیں اور امیدیں ان کی آنکھوں میں کرلا رہی تھیں زندگی کے لئے۔

مجھے اپنے دل پر کسی گدھ کے بھدے، مکروہ اور کرخت پنجوں کی گرفت محسوس ہوئی اور اذیت کے تاثرات میرے چہرے پر امنڈ آئے۔

ڈاکٹر عقیل اور علاب دونوں میرے دائیں بائیں کندھوں پر ہاتھ رکھ کر مجھے اپنے سہارے کا احساس دلانے لگے۔

''شکیل صاحب.....! خود پر کنٹرول رکھیں۔ خدا کا شکر ادا کریں کہ آپ زندہ بچ گئے۔ ان بے چاروں کی موت یونہی لکھی ہوگی اور..... اور بھی تو تین مزدور زندہ بچ گئے ہیں جن کی زندگیاں ابھی باقی تھیں وہ صاف موت کے منہ سے بچ کر نکل آئے ہیں اور جن کا وقت پورا ہو چکا تھا وہ اپنے خالق حقیقی کے سامنے جا پیش ہوئے ہیں۔ آپ پلیز..... سریس نہیں لیں۔''

''اب تم ذہن کو مرنے والوں میں نہیں الجھاؤ جنہیں مرنا تھا وہ مر گئے۔ اب اپنے متعلق سوچو، باہر جو تمہارے منتظر ہیں ان سے کیا کہنا ہے..... یہ سوچو.....!'' پروفیسر صاحب نے نرم لہجے میں کہا۔ اور میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ اور کر بھی کیا سکتا تھا۔

''آئیں دیکھتے ہیں۔'' میں نے کہا اور بیڈ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر ہم سب اکٹھے ہی باہر نکلے۔ کچھ دیر بعد میں اپنے آفس میں تھا۔

ڈاکٹر عقیل، عارب، اختر اور پروفیسر فاضل بصاری صاحب کے علاوہ اس وقت آفس میں ایک انسپکٹر، سپرنٹنڈنٹ اور محکمہ آثار قدیمہ کے چند آفیسرز موجود تھے۔

میں نے انہیں یہی بیان دیا تھا کہ

''میرے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ اس مقام پر کوئی اہرام مدفن ہوگا۔ مجھ سے پہلے کوئی خبطی بوڑھا یہاں کھدائی کر رہا تھا اس کا خیال تھا کہ اس جگہ کوئی صدیوں پرانا مقبرہ دفن ہے۔ اور اس بات کا علم مجھے تب ہوا جب ایک روز کھدائی کرنے والے مزدوروں میں سے ایک مزدور اتفاقی طور پر شدید زخمی ہوا اور اس کے ساتھی بروقت میڈیکل ٹریٹمنٹ کے لئے یہاں لے آئے۔

پھر جب میری ملاقات ان کے سپروائزر سے ہوئی تو اس نے یہی تفصیل بتائی مگر میں نے کوئی تاثر نہیں لیا نہ ہی میرے نزدیک یہ کوئی ایسی اہم بات تھی۔ کچھ عرصہ مزید گزر گیا۔ زخمی مزدور اس دوران یہیں ایڈمٹ رہا۔ میری ایک بار پھر سپروائزر سے ملاقات ہوئی تو اس نے بتایا کہ ہمارا کھدائی کا کام بند ہو چکا ہے۔

میرے استفسار پر اس نے ایسے عجیب وغریب اور ناقابل یقین واقعات کا ذکر کیا کہ مجھے دلچسپی محسوس ہوئی۔ حالانکہ اس نے بھوتوں، بدروحوں کا ذکر کیا تھا اور مجھے ان باتوں پر قطعی یقین نہیں۔

مگر اس نے تمام واقعات کچھ ایسے وثوق سے بیان کئے کہ میں تذبذب کا شکار ہوگیا۔ اور اسی تذبذب کی ہوا نے میری آتش اشتیاق کو بھڑکا دیا اور میں نے چند راتیں اس مقام پر بتانے کا ارادہ کرلیا۔

کھدائی کے کام کو بہانہ بنایا اور کھدائی بھی شروع ہوگئی۔ سپروائزر کے کہے کے بموجب کوئی واقعہ وقوع پذیر نہیں ہوا البتہ مسلسل کھدائی کے بعد ایک چٹان دریافت ہوگئی اور پھر جب مزید کھدائی کرائی گئی تو اس چٹان کے نیچے سے اہرام برآمد ہوا۔ پھر اتفاقیہ طور پر ہی اہرام کا دروازہ کھل گیا اور ہم اندر کا حال جاننے کے لئے بغیر سوچے سمجھے بے اختیار اہرام میں داخل ہوگئے اور ہمارے اندر داخل ہوتے ہی اہرام کا دروازہ نامعلوم کیسے بند ہوگیا اور ہم اندر پھنس کر رہ گئے۔ میں اس وقت آخری سانسوں پر تھا جب دروازہ دوبارہ کھلا اور پروفیسر صاحب اندر داخل ہوآئے۔ بے ہوش ہونے سے قبل میں نے پروفیسر صاحب سے درخواست کی تھی کہ اس اہرام کی دریافتگی کے متعلق محکمہ والوں اور انتظامیہ کو مطلع کیا جائے۔"

میں نے بیان میں کانٹ چھانٹ اور کمی بیشی سے کام لیتے ہوئے انہیں تفصیل بتا دی۔ جاں بحق ہونے والے مزدوروں کے متعلق سوال پر میں نے ایک غیر متوقع حادثے کا بیان دیا۔ اور یہی دونوں بیان میں نے تحریری طور پر سپرنٹنڈنٹ اور آثار قدیمہ کے ڈائریکٹر کو دیئے اور میری بچت ہوگئی۔ میں نے ہزاروں سال پرانی تہذیب اور اس تہذیب کے متعلق ایک دارالاسرار دریافت کر کے حکومت کے محققین کے حوالے کیا تھا۔ سو وہ الٹا میرے شکرگزار ہو کر واپس لوٹے اور ان کے چلے جانے کے بعد میں نے اطمینان کی ایک طویل سانس لی۔ پھیپھڑوں پر دھری ایک بھاری اور گرم سل جیسے سرک گئی تھی۔ دل و دماغ جیسے ایک مکروہ اور کرخت گرفت سے آزاد ہوگئے۔ میں نے خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ اعصاب پر مسلط تناؤ گویا یک دم

تحلیل ہو گیا تھا۔

''شکیل صاحب......! اب خدا کا شکر ادا کیجئے کہ آپ ہر بات سے بری الذمہ ہو گئے ہیں۔ نہ تو مزدوروں کی موت کی ذمہ داری آپ پر عائد ہوئی اور نہ ہی حکومت سے اجازت لئے بغیر اس وسیع پیمانے پر کھدائی کرانے کے باعث آپ کو مجرم ٹھہرایا گیا۔ حالانکہ قانون کی رو سے یہ بھی اچھا خاصا جرم ہے۔'' ڈاکٹر عقیل مسکرائے۔

میں نے انٹرکام پر ملازم کو پانچ کپ کافی کا کہا اور دوبارہ ان کی جانب متوجہ ہو گیا۔

''شکیل صاحب نے صدق و دروغ کا آمیزہ بڑی روانی سے بہایا ہے۔ اگر ذرا بھی گڑبڑا جاتے تو اچھی خاصی جھنجھٹوں میں پھنس جاتے۔' اختر اپنے مخصوص انداز سخن میں گویا ہوا تو ہم سب کے چہروں پر بھی ہلکی سی مسکراہٹ بہہ گئی۔

''زندگی ہے تو یہ جھنجھٹیں ہیں اور ان سے بچ جانا میرے لئے اہم بات نہیں۔ میرے لئے یہ اہم بات ہے کہ میں موت کے منہ سے زندہ سلامت بچ آیا ہوں اور یقیناً میری یہ زندگی پروفیسر صاحب کی مرہونِ منت ہے کیونکہ مجھے صدفی صد یقین ہے کہ اگر پروفیسر صاحب نہیں ہوتے تو وہ دروازہ کوئی انسان نہ تو ڈھونڈ پاتا اور نہ ہی اسے کھولنے میں کامیاب ہوتا...... کیوں پروفیسر صاحب......! میں درست کہہ رہا ہوں ناں......؟''

''کہہ تو تم درست رہے ہو مگر اس میں میرا کوئی کمال نہیں۔ ابھی تمہاری زندگی بھی باقی تھی اور شاید کچھ ادھورے کام بھی تمہاری سانسوں سے منسوب کر رکھے ہیں۔ خدائے لم یزل نے جو تم زندہ بچ گئے۔ کیونکہ میرا ادھر آنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ بالکل اچانک ہمارا پروگرام بن گیا یہاں پہنچ کر اس نئی کہانی کا علم ہوا کہ موصوف ڈاکٹری چھوڑ کر آرکیالوجی کے امتحان دینے میں مصروف ہیں۔''

انہیں باتوں کے دوران سلام کافی کے برتن رکھ کر چلا گیا اور اختر نے ایک ایک کپ سب کے سامنے رکھ دیا۔

''پروفیسر......! اگر ایسی بات ہے تو یقیناً ڈاکٹر کے بیڈروم میں پڑے تابوت میں جو لاش استراحت فرما رہی ہے وہ مکمل ''ممی'' نہیں ہوگی۔ اسے پوری طرح حنوط نہیں کیا گیا ہوگا اور اس کے ڈاکٹر کی خواب گاہ تک پہنچ جانے میں خدا کی یہی مصلحت پوشیدہ ہوگی کہ ڈاکٹر اسے حنوط کر کے مکمل ممی بنا دے۔ ہے نا......؟''

ڈاکٹر عارب نے کافی کا کپ اٹھاتے ہوئے کہا۔ تو میرے ذہن میں فوراً وہ سونے کا مجسمہ آ گیا جو میں نے اہرام کے اندر تابوت میں دیکھا تھا۔

''پروفیسر صاحب......! کیا آپ نے وہ تابوت چیک کیا تھا......؟''

''ہاں......!''

''کیا آپ کو حیرت نہیں ہوئی......؟'' میرے لہجے میں سوال سے زیادہ حیرت تھی۔

''کس بات پر......؟''

''میرا تو خیال تھا کہ اس میں صدیوں پرانی کوئی لاش ہوگی...... اور ہونا بھی یہی چاہئے تھا مگر حیرت کی بات ہے کہ تابوت میں کسی لاش کی بجائے ایک سونے کا مجسمہ موجود تھا......؟'' میں نے شدید حیرت سے کہا۔

میری بات پر پروفیسر کے چہرے پر گہری سنجیدگی چھا گئی اور آنکھوں میں جیسے سوچ کے بھنور نمودار ہو آئے۔ پھر وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں گویا ہوئے۔

''شکیل......! میں کوئی توہم پرست، ضعیف الاعتقاد شخص نہیں ہوں مگر نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگتا ہے جیسے قدرت تم سے کوئی بہت ہی عظیم کام لینے والی ہے...... تمہیں کسی امتحان میں ڈالنے والی ہے۔''

''پروفیسر صاحب......! میں سمجھا نہیں کہ آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں یا کیا کہہ رہے ہیں۔'' الجھن میرا انداز تھی۔ پروفیسر صاحب کی پیشانی پر بھی الجھن کی لکیریں ابھر آئیں۔ ڈاکٹر عقیل، عارب اور اختر انصاری بھی استفہامیہ نظروں سے پروفیسر صاحب کی جانب دیکھنے لگے۔

''دیکھو میری بات کو سمجھنے کی کوشش کرنا۔'' پروفیسر صاحب نے کافی کا کپ

ٹیبل پر رکھا اور کرسی پر پہلو بدل کر رہ گئے۔ ان کے چہرے سے اضطراب مترشح تھا۔"

"دیکھو اس پوری کائنات میں یا...... یا تمام جہانوں میں جو کچھ تھا، ہے، ہوگا۔ یا جو کچھ ہو رہا ہے وہ...... وہ سب فطری اصولوں کے مطابق ہے۔ ہم کسی بھی چیز کو یا کسی بھی عمل کو چاہے وہ انسانی ہے یا حیوانی، غیر فطری کہنے کے مجاز نہیں کیونکہ فطرت کو ترتیب دینے والی خدا کی ذات ہے اب اگر کچھ غیر فطری ہے تو گویا وہ فطرت کے دائرہ کار سے خارج ہے اور جو فطرت کے دائرے سے خارج۔ گویا وہ فاطر کی دسترس سے خارج اور یہ کسی طور ممکن نہیں۔ تم سمجھ رہے ہو نا......؟" پروفیسر صاحب نے تجدید طلب نظروں سے میری سمت دیکھا۔

"پروفیسر صاحب......! مجھے الجھن سی ہو رہی ہے۔ آپ کہنا کیا چاہتے ہیں......؟"

"فی الحال تو خود میرا ذہن الجھ رہا ہے۔ بہر حال جو میرے ذہن میں چبھ رہا ہے وہ تمہیں بتا رہا ہوں باقی تجزیہ تم خود کر لینا۔ فطرت سے ٹکر لینے والے بدبخت ہر دور میں پیدا ہوتے ہیں اور ان کا انجام بڑا عبرت ناک ہوا کرتا ہے۔ کچھ بدبختوں نے فطرت کے درمیان رکاوٹیں پیدا کرنے کی کوششیں کی ہیں۔ انسانوں کے ناپاک ارادے انسان ہی ختم کرتے ہیں۔ تم یوں سمجھ لو کہ تمہیں فطرت کے خلا بھرنے کے لئے فاطر نے منتخب کیا ہے۔ کچھ ...... کچھ عقدے ڈالنے کی منحوس جسارتیں کی گئی ہیں۔ تمہیں فطرت کے وہ عقدے کھولنے ہیں؟ اور تم بات کر رہے تھے نا...... سونے کے مجسمے کی، کہ تابوت میں لاش ہونی چاہئے تھی......؟" پروفیسر چند لمحے کے توقف سے دوبارہ گویا ہوئے۔

"تابوت میں جو سونے کا مجسمہ ہے نا...... وہ صرف مجسمہ نہیں وہ ہزاروں سال پرانی لاش ہی ہے۔" پروفیسر صاحب کی بات سن کر میں حیرت زدہ رہ گیا۔ ڈاکٹر عقیل، عارب اور اختر کی حالت بھی مجھ سے مختلف نہ تھی۔ وہ بھی تحیر و بے یقینی کے عالم میں پروفیسر کی صورت دیکھ رہے تھے۔

''پروفیسر......! کیسی بے تکی باتیں کرنے لگے ہیں آپ ......! ہم نے خود وہ مجسمہ دیکھا ہے، خالص سونے کا بنا ہوا ہے اور آپ اس مجسمے کو ہزاروں سال پرانی لاش بتا رہے ہیں۔'' میں نے بے یقینی کے انداز میں کہا۔

''جس وقت تم بے ہوشی کے عالم میں پڑے تھے اس دوران میں اس مجسمے اور تابوت پر تین گھنٹے مسلسل مغز ماری کرتا رہا ہوں، تابوت پر کندہ تحریر کا ترجمہ بھی میں نے کیا ہے اور چند ایک سطریں مجسمے کی بھی ترجمے میں ڈھالی ہیں وہ صفحات تمہاری خواب گاہ میں موجود ہیں۔ ذرا کافی پی لو پھر چل کر جائزہ لیتے ہیں۔'' پروفیسر صاحب نے پرسکون لہجے میں کہا اور ٹیبل سے کافی کا کپ اٹھا کر چسکیاں لینے لگے۔

''کس چیز کا جائزہ لیتے ہیں، کیا وہ مجسمہ اٹھ بیٹھے گا......؟'' ڈاکٹر عقیل نے تمسخرانہ انداز میں کہا تو پروفیسر صاحب اس کی جانب متوجہ ہوگئے۔

''نہیں......! ان کاغذات کا جائزہ لیتے ہیں جن پر میں نے تابوت پر کندہ قدیم تحریر کا ترجمہ اتارا ہے...... میرا...... خیال ہے کہ میں کچھ بھول رہا ہوں الفاظ کی ترتیب میرے ذہن میں گڈمڈ ہو رہی ہے۔ لیکن اتنا تو مجھے یاد ہے کہ مجسمے کے سینے پر تحریر تھا کہ اس کے اندر بدنصیب مریاقس کا زندہ وجود ہے...... ہاں کچھ ایسی ہی تحریر تھی۔'' پروفیسر کے چہرے پر سوچ کی پرچھائیاں رقصاں تھیں۔

''زندہ وجود......! زندہ وجود سے کیا مراد ہے آپ کی......؟'' ڈاکٹر عارب نے حیرت سے کہا۔

''زندہ وجود سے میری کوئی مراد نہیں۔ میں وہ بتا رہا ہوں جو مجسمے پر تحریر ہے اب اصل حقیقت کیا ہے یہ میں نہیں جانتا ہاں اتنا ضرور کہوں گا کہ کچھ انہونی ہونے والی ہے۔''

''آپ بھی کمال کرتے ہیں پروفیسر صاحب......! ساتھ ساتھ عجیب و غریب بیان بھی دیئے جا رہے ہیں اور یہ بھی کہتے جا رہے ہیں کہ حقیقت کا مجھے علم نہیں...... عجیب بات ہے۔'' ڈاکٹر عارب کا لہجہ ناخوشگوار ہوگیا۔ میں نے محسوس کیا کہ اگر اس

موضوع پر مزید کچھ دیر گفتگو ہوتی رہی تو بلاوجہ کشیدگی پیدا ہو جائے گی سو میں نے مداخلت کرتے ہوئے گفتگو کا رخ موڑ لیا۔

''پروفیسر صاحب......! چھوڑیں اس مسئلے کو ابھی چلیں گے، آپ کا کیا ہوا ترجمہ دیکھیں گے اور آگے کا ترجمہ مکمل ہونے کے بعد اس مسئلہ پر گفتگو کریں گے۔ آپ یہ بتائیں کہ آپ کا اس طرح اچانک بغیر کوئی اطلاع کے ادھر آنے کا پروگرام کیسے بن گیا؟ سب خیر خیریت تو تھی ناں......؟''

''ہوں...... خیریت ہی تھی وہ...... میرا ایک شاگرد انڈیا سے آیا ہوا تھا۔ دوروز پہلے ''جسونت دیال'' اسے یہاں کوئی کام تھا، مجھ سے اس نے ذکر کیا۔ میں نے سوچا کہ چلو میں بھی ساتھ چلا چلتا ہوں تم سے ملاقات ہوئے بھی کافی عرصہ ہو گیا تھا سو سوچا کہ چلو اسی بہانے تم سے بھی مل لوں گا۔ ارادہ تھا کہ خود یہاں رک جاؤں گا اور اسے کہوں گا کہ بھئی تم اپنا کام نبٹا آؤ واپسی میں مجھے یہاں سے پک کر لینا۔ مگر جب ہم یہاں پہنچے تو پتا چلا کہ یہاں تو کہانی ہی کچھ اور ہی ہوئی ہے۔

یہاں سے پھر اختر کے ساتھ تمہاری طرف گئے تو خیموں میں موجود مزدوروں نے بتایا کہ اہرام کا دروازہ کھل گیا تھا تم اندر داخل ہونے کی تیاری میں لگ گئے اور جو چند مزدور تمہارے ساتھ تھے ان کو تم نے اوپر واپس بھیج دیا۔ پھر جب ہم نیچے پہنچے تو نہ کوئی روزن نہ کوئی دروازہ...... اور جب دروازہ کھلا تو اندر کا ماحول ہی عجیب و غریب تھا۔ تمام مزدور دروازے کے سامنے ہی بے سدھ پڑھے تھے تم خود چند قدم کے فاصلے پر تابوت کے اندر اوندھے ہوئے پڑے تھے۔ بہرحال ہم تمہارے ساتھ ساتھ وہ تابوت اور نوادرات بھی اٹھا لائے۔ جسونت ذرا جلدی میں تھا اس لئے یہاں آنے کے بعد وہ تو اپنے کام کے سلسلے میں چلا گیا اور ڈاکٹرز تمہاری وجہ سے پریشان ہو گئے۔ تمہاری چار گھنٹے کی بے ہوشی کے دوران میں نے سرسری طور پر ان نوادرات، تابوت اور مجسمے کا بھی ذرا جائزہ لے لیا۔ اب باقی کی تمام صورت حال تمہارے سامنے ہے۔''

''تو وہ...... جسونت دیال صاحب کیا واپس نہیں آئے......؟''

''نہیں ......! ابھی تو نہیں آیا...... ویسے چار پانچ گھنٹے ہونے والے ہیں اب تک آ تو جانا چاہئے تھا اسے...... بہر حال آجائے گا۔'' پروفیسر صاحب نے لاپرواہی سے کہا۔

سب کافی ختم کر چکے تو ڈاکٹر عارب نے کہا۔

''اب آپ لوگوں کے کیا ارادے ہیں......؟ میرا خیال ہے کہ چل کے اب ذرا اس مجسمے کا جائزہ لے لیا جائے۔''

ڈاکٹر عقیل اور اختر نے کندھے اچکا دیئے۔ میں نے پروفیسر صاحب کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو وہ کرسی کھسکاتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

''ہاں......اب کوئی جھنجٹ نہیں چلو سب چلتے ہیں۔'' اور ہم سب اٹھ کھڑے ہوئے۔ ہسپتال کی عقبی عمارت میں ایک طرف ملازمین کے کوارٹر بنے ہوئے تھے اور اس سے ملحقہ عمارت میں ڈاکٹرز کی رہائش گاہیں تھیں۔

میں چونکہ شروع ہی سے تنہائی اور سکون پسند طبیعت کا مالک تھا اس لئے میری رہائش ان سے الگ تھلگ تھی۔ ملازم بھی صرف دو تھے۔ ایک چوکیدار، دوسرا خانسامے سے لے کر مالی تک بھی فرائض انجام دیتا تھا۔

ہم آفس سے نکل کر ہسپتال کی عمارت کی عقبی سمت چل پڑے۔ عارب اپنی فطرت کے مطابق پروفیسر سے الجھ رہا تھا۔

''پروفیسر......! آپ باتیں ہی ایسی کرتے ہیں کہ کوئی صاحب شعور انسان ان پر یقین نہیں کر سکتا۔''

''میں نے ایسی کون سی بات کر دی ہے جس پر یقین کرنے میں تمہارا شعور مانع ہے......؟''

''آپ خود ہی تو کہہ رہے ہیں کہ سنہری مجسمے کے اندر کسی ''مریاقس'' کا زندہ وجود ہے۔ کیسی خلاف عقل بات ہے کہ ہزاروں سال قدیم ایک ایسے اہرام کے جو زمین کی گہرائیوں میں دفن تھا اندر سے ایک تابوت برآمد ہوتا ہے اس میں سے ایک مجسمہ نکلتا ہے اور اس مجسمے کے اندر ہزاروں سال سے ایک زندہ وجود مقید ہے......

بھلا یہ کوئی تسلیم کی جانے والی بات ہے......؟''

''تو میں نے ایسا اپنی طرف سے تھوڑی ہی کہا ہے۔میں نے بتایا تو تھا کہ یہ تابوت پر تحریر ہے۔''

''اور آپ نے یقین کرلیا کہ ایسا ہی ہوگا......؟''

''ایسا ہونا ناممکنات میں سے بھی نہیں ہے۔''

''واہ...... پروفیسر......! آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ ذرا بات کی وضاحت تو کریں کہ یہ کیسے ممکن ہے......؟''

''مسٹر عارب......! اس جہاں میں کچھ بھی ناممکن نہیں۔انسان رب کا نائب ہے، اشرف المخلوقات ہے۔تم نے صرف ان الفاظ کو تسلیم کیا ہوگا۔معنی، مفہوم اور ان الفاظ کی گہرائی میں اترنے کی کبھی کوشش نہیں کی ہوگی۔تم نہیں سمجھ سکتے کہ انسان کیا بلا ہے۔ وہ بھی انسان ہی تھا جو مردوں کو زندہ کر دیا کرتا تھا۔ وہ بھی انسان ہی تھا جس کے ہاتھ میں آکر فولاد موم بن جاتا تھا۔وہ بھی انسان ہی تھا جس کے لئے دریائے نیل کا پانی دو اطراف سمٹ گیا تھا اور وہ بھی انسان ہی تھا جس کی ایک جنبش انگشت سے چاند دو ٹکڑوں میں منقسم ہوگیا تھا۔اس حضرت انسان سے کچھ بعید نہیں۔''

''وہ تو انبیاء علیہم السلام تھے پروفیسر......! آپ ان کا ذکر کیوں درمیان میں لے آئے......؟''

''کیا انبیاء علیہم السلام انسان نہ ہوا کرتے تھے......؟ ان کا تعلق کسی اور مخلوق سے تھا......؟ اس کا مطلب ہے کہ''استغفراللہ......!'' آپ فراعنہ کا تقابل انبیاء سے کر رہے ہیں۔''

''چلو اگر میں ایسا ہی کہہ رہا ہوں تو اس میں''استغفراللہ'' کہنے کی کیا بات ہے......؟ ان کا تقابل تو اللہ کی ذات نے کرایا۔اور پھر میں بات انبیاء کی نہیں کر رہا، علم کی کر رہا ہوں اور علم کبھی بھی کسی کی میراث نہیں رہا۔ وہ ذات جسے جتنا چاہے اس دولت سے نواز دے۔ اب یہ تو ظرف کی بات ہے کہ وہ اس کا کیسا استعمال کرتا ہے۔

اب موٹی سی مثال ہے۔ شیطان کو ہی لے لو۔ کتنی طاقت ہے اس کے پاس اور کتنا علم ہے۔ خون کی حدت میں حل ہو کر رگوں میں بہتا ہے۔ اسم اعظم وہ جانتا ہے اور مزے کی بات کہ اگر وہ اسم اعظم پڑھ کر توبہ کرے تو اس کی توبہ قبول ہو جائے گی...... اور اس سے بڑھ کر مزے کی بات یہ کہ قیامت سے چالیس برس قبل ہی وہ اسم اعظم بھول جائے گا؟ اب اس پر غور کرو...... وہ بھولے گا نہیں اسے بھلا دیا جائے گا۔ کیونکہ خدا کی یہی مرضی ہے۔ اب علم اور طاقت تو اس نے شیطان کو بھی دے رکھی ہے اور کھلی چھوٹ بھی۔ اب یہ اس کا فعل کہ وہ اس کا استعمال کیسے کرتا ہے اور جوابدہ اللہ کے سامنے ہوگا۔'' پروفیسر صاحب کی اتنی گہری تفصیلی بات بھی اس کی عقل میں نہیں آئی۔ اس کی سوئی ہنوز وہیں اٹکی ہوئی تھی۔

''پروفیسر......! آپ نے اتنی لمبی تقریر کر دی مگر آپ کی اس گفتگو کا اس زندہ وجود سے کیا تعلق ہے......؟ ہزاروں سال سے زندہ......؟ یہ تو فطرت سے تصادم ہو گیا......؟''

''عجیب احمق مغز ہو تم بھی...... بات تمہاری عقل میں نہیں آئی۔ بھئی علم کی بنیاد پر ایسا ہونا ممکن ہے۔'' پروفیسر صاحب کے لہجے میں ناگواری و بے زاری اتر آئی۔

''رہی بات فطرت کی تو وہ جو ہزاروں سال سے غار میں سو رہے ہیں...... اصحاب کہف، کیا وہ فطرت سے متصادم نہیں......؟''

''وہ تو خدا کی مرضی سے سو رہے ہیں۔''

''تو ممکن ہے کہ اس زندہ وجود میں بھی خدا کی مرضی ہو۔ ہزاروں انسان پیدا ہو رہے ہیں۔ براہِ راست آسمان سے تو نہیں گرتے! نہ ہی زمین سے اگ رہے ہیں۔ انسانی ذرائع سے ہی دنیا میں آ رہے ہیں۔ اسی طرح وہ ذات ہر کام کسی نہ کسی ذریعے پایۂ تکمیل تک پہنچاتی ہے۔ اگر مجسمے کے اندر حقیقتاً کوئی زندہ وجود ہے تو ہزاروں سال گزرنے کے بعد اب اس کا ہم تک پہنچنا...... اس میں بھی یقیناً پروردگار کی کوئی مصلحت پوشیدہ ہوگی۔''

''پروفیسر صاحب......!وہ بات تو اپنی جگہ مگر آپ مجھے یہ سمجھائیں کہ ایک چیز جو فطرت کے تقاضوں پر اس دنیا میں آئی، وہ فطرت سے ماوراء کیسے ہو سکتی ہے......؟ ایک انسان کا اعصابی نظام اپنی طبعی عمر پیدا کرنے کے بعد...... بلکہ طبعی عمر کیا ہزاروں سال بعد تک فعال کیسے رہ سکتا ہے......؟''

''تمہارے دماغ میں عقل نام کا مواد ہے یا نہیں......؟'' پروفیسر صاحب بری طرح جھنجلا گئے۔

''اپنی ہی ہانکے جا رہے ہو۔مادیت کا چشمہ پہن کر ہر چیز دیکھو گے تو حواس گنوا بیٹھو گے۔ روحانیت بھی کوئی چیز ہے۔اور تمام مادیت، روحانیت کی ہی مرہونِ منت ہے۔اگر روحانیت نہیں تو مادیت بھی نہیں...... اور اب مجھ سے مزید کوئی بیہودہ سوال نہیں کرنا۔'' پروفیسر صاحب نے برے برے منہ بناتے ہوئے کہا تو ڈاکٹر عارب کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھر آئی۔انہی باتوں کے دوران ہم رہائشی حصے میں آ گئے۔

مین دروازہ کھلا ہوا تھا مگر یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ہم اپنے اپنے خیالوں میں گم اندر داخل ہو گئے۔مگر جیسے ہی ہم دروازے سے اندر داخل ہوئے بے اختیار ہمارے قدم ٹھٹک کر رک گئے۔سانسیں ایک لمحے کو شہ رگ میں اٹک گئیں اور دھڑکنیں جیسے ساکت ہو گئیں۔

پروفیسر اور ڈاکٹر عقیل کے منہ سے بے معنی سی آوازیں آزاد ہو گئیں۔ دروازے سے داخل ہوتے ہی راہ داری آتی تھی۔اس مختصر سی راہ داری کے ایک طرف کچن تھا اور دوسرف طرف میرا اسٹڈی روم اور باتھ روم جبکہ اس مختصر سی راہ داری کی دوسری جانب لان تھا اور تین کمرے۔ایک ڈرائنگ روم کی طرز پر تھا، دوسرا میرا بیڈ روم اور تیسرا کبھی کبھار مہمان خانے کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔کیونکہ اکثر چچا زاد آ جایا کرتے تھے یا پھر بھولے بھٹکے چچا خود اور والد صاحب آ جاتے تھے اور اکثر میرے دونوں بھائی۔عقیل ظفر اور نبیل ظفر آتے رہتے تھے۔ چونکہ ان سب کا میری اس داستان حیات سے تعلق نہیں ہے۔ اس لئے ان کا ذکر بھی ضروری نہیں

سمجھا۔ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ ہم اندر داخل ہوتے ہی ٹھٹک کر رک گئے۔

ہماری آنکھیں حیرت اور بے یقینی کے سے عالم میں پھیل گئیں۔اور دماغ میں جیسے زلزلے بپا ہوگئے......؟ ہم سے چار قدم کے فاصلے پر راہ داری میں چوکیدار کی خون میں لت پت لاش پڑی تھی اور اس کی اذیت گزیدہ نظریں ہماری جانب ہی جمی ہوئی تھیں۔اس کی ساکت پتلیوں اور فرش پر جمے خون کی سیاہ رنگت سے ہی ہم نے اندازہ لگا لیا کہ یہ مر چکا ہے۔ یہ صورت حال ہمارے لئے کچھ ایسی غیر متوقع تھی کہ کچھ دیر کو تو ہم سب اپنی اپنی جگہ بے حس وحرکت سنگی مجسموں کی مانند کھڑے رہ گئے۔ پھر اس سکتے کو پروفیسر صاحب کی گھمبیر آواز نے ہی کرچی کرچی کیا۔

''کھیل کا آغاز خون سے ہو رہا ہے...... بہت خون بہے گا......؟'' لہجہ پُراسرار تھا مگر میں کوئی تبصرہ کئے بغیر چوکیدار کی لاش کی طرف بڑھ گیا۔

اس کی باڈی میں تین گولیاں لگی تھیں۔ایک ایک شانے میں اور ایک سوراخ ٹھیک اس کے دل کی جگہ پر نظر آ رہا تھا۔میری ذہنی کیفیت نہایت انتشار کا شکار تھی۔میں نہ تو خون پہلی بار دیکھ رہا تھا اور نہ ہی لاش...... مگر صورت حال میرے اعصاب کو گرفت میں لے کر جھنجوڑنے لگی تھی۔ میرے مکان میں میرے چوکیدار کا قتل...... کیوں......؟ یہ کیوں بڑی اذیت ناک اور پریشان کن تھی۔ میں تیزی سے آگے بڑھ گیا۔میرا رخ اپنے بیڈ روم کی طرف تھا۔ باقی سب میرے عقب میں تھے۔اختر نے آگے آنے سے پہلے بیرونی دروازہ لاک کر دیا تھا۔

بیڈ روم کا دروازہ خلاف توقع کھلا ہوا تھا اور اندر سے ٹی وی چلنے کی آواز آ رہی تھی۔ میرے قدم رک گئے، اعصاب لاشعوری طور پر ایک تناؤ کا شکار ہوگئے۔

میں نے محتاط قدموں سے آگے بڑھ کر اندر جھانکا اور اندر کا منظر مجھے دہلا گیا۔ ڈاکٹر عقیل، عارب، اختر اور پروفیسر میرے عقب میں چوکنے کھڑے تھے۔ میرے چہرے کی بدلتی رنگت دیکھ کر اختر فوراً آگے بڑھ آیا۔اس نے کوئی سوال نہیں کیا سیدھا اندر جھانکا اور اس کے چہرے پر بھی سنسنی کے تاثرات ابھر آئے۔

ڈاکٹر عقیل، عارب اور پروفیسر کی حالت بھی کچھ مختلف نہ ہوئی۔

اندر بیڈ پر خانسامہ کی لاش پڑی تھی اور بیڈ کی سفید چادر خون سے سرخ ہو رہی تھی۔

''دو قتل......؟'' اختر کی آواز سرسرائی۔

''مجسمہ اور نوادرات بھی غائب ہیں۔'' پروفیسر کی گھمبیر آواز نے انکشاف کیا۔ہم اندر داخل ہوکر اندر کا جائزہ لینے لگے۔ہر چیز اپنی جگہ پر موجود تھی کسی چیز کو چھیڑا نہیں گیا تھا۔کمرے کے سامان اور ترتیب میں کوئی کمی نہیں تھی ہاں البتہ میرے نزدیک بیڈروم میں خانسامہ کی لاش اضافی تھی۔باقی سب کچھ جوں کا توں تھا۔اختر،عقیل، عارب اور پروفیسر کے مطابق کمرے سے تابوت اور نوادرات غائب تھے جس پر وہ سب حیرت کا اظہار کر رہے تھے مگر میرے نزدیک اس بات کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔میرا دماغ تو اپنے دو ذاتی ملازموں کے میرے ہی بنگلے میں قتل پر آندھیوں کی زد پر آیا ہوا تھا۔

خانسامہ کی لاش پشت کے بل بیڈ پر پڑی تھی اور ٹانگیں بیڈ سے نیچے لٹک رہی تھیں۔دل میں لگنے والی گولی نے اسے پوری طرح تڑپنے بھی نہیں دیا ہوگا۔

''یہ قتل یقیناً اس تابوت اور نوادرات کی وجہ سے ہوئے ہیں۔جنہیں یہاں سے چرایا گیا ہے۔'' ڈاکٹر عارب نے قیاس آرائی کی۔

''یہ بعد میں سوچیں گے کہ ان قتلوں کا محرک کیا رہا...... فی الحال تو یہ سوچیں کہ ان لاشوں کا اب کیا کرنا ہے......؟'' اختر نے کہا پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔

''سر......! آپ کیا سوچ رہے ہیں......؟''

''کوئی سوچ ہی تو ذہن میں جنم نہیں لے رہی اختر......! سمجھ نہیں آ رہی...... کچھ بھی...... دماغ ماؤف سا ہوگیا ہے۔''

''اپنے حواس مجتمع رکھو شکیل......! ابھی تو اس کھیل کا آغاز ہوا ہے اور پتا نہیں کتنے قتل ہوں گے۔اور تمہارا دماغ ہے کہ ابھی سے ماؤف ہونے لگا۔آنے والے حالات کا سامنا تم کس طرح کرو گے......؟''

''پروفیسر صاحب......! خدا کے لئے بس کریں۔ایک تو پہلے ہی دماغ کی

کھچڑی بنی ہوئی ہے اوپر سے آپ خوفناک پہیلیاں بجھوانے پر تلے ہوئے ہیں۔'' میں نے بیزاری سے کہا۔

''میں تو یہی کہوں گا کہ یہ پہیلیاں بوجھنے کی اب عادت ڈال لو۔ آگے تمہاری اپنی مرضی......! مگر ایک پیشین گوئی میں کر دوں تم نے صدیوں پر محیط فاصلہ سمیٹا ہے، ماضی کے اندھیروں کو حال کی روشنیوں سے ہمکنار کیا ہے، ہزاروں سال سے بند داستان کا پہلا ورق الٹا ہے۔اب اس داستان کے آخری ورق تک تمہیں سفر کرنا ہے اور جانے کیوں مجھے یقین سا ہے کہ اس داستان کے اختتام پر ختم شد کی لکیر تمہارے ہاتھوں سے ہی کھنچے گی......تم لاکھ نظریں چراؤ...... اس داستان کے مطالعہ سے مفر نہیں پا سکو گے۔'' پروفیسر صاحب کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی کہ چند لمحے تک تو میں کچھ بول ہی نہ سکا۔

''جو ہونا تھا وہ ہو چکا پروفیسر صاحب......! اگر تو یہ قتل اس سونے کے مجسمے اور نوادرات کے حصول کی خاطر کیئے گئے ہیں تو قاتل وہ مجسمہ اور نوادرات لے جا چکے ہیں۔ بات ختم ہوئی اب مجھے یہ بھی جاننے کی ضرورت نہیں کہ وہ نوادرات کون لے گیا ہے اور کہاں لے گیا......؟ قصہ ختم......!''

''قصہ تو ابھی شروع ہو رہا ہے شکیل میاں......! اختتام تو ابھی بہت دور ہے۔''

''پروفیسر......! لعنت ڈالیں قصے کہانیوں پر...... کیا لغو قسم کی قیاس آرائیاں کرنا شروع کر دی ہیں۔ بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔ پہلے موجودہ صورت حال کے متعلق تو کچھ فیصلہ کر لیں۔ یہاں دو دو لاشیں پڑی ہیں ایسا نہ ہو کہ ہمارے لئے کوئی مصیبت کھڑی ہو جائے۔'' ڈاکٹر عارب نے ہماری توجہ لاشوں کی جانب مبذول کرائی۔ میں ایک بار پھر تشویش میں مبتلا ہوگیا۔

''کیا ارادہ ہے......؟ کیا پولیس کو انفارم کیا جائے......؟'' ڈاکٹر عقیل نے سوال طلب نظروں سے ہماری طرف دیکھا۔

''میرا خیال ہے کہ یہ ایک احمقانہ حرکت ہوگی۔'' پروفیسر نے مدبرانہ انداز

میں کہا۔ پولیس والے ہزار طرح کے سوال اٹھائیں گے۔ کیا جواب دیا جائے گا ان کو......؟ کیا وجہ بتائیں گے کہ یہ قتل کیوں ہوئے......؟ کیا مجسمے اور نوادرات کو وجہ قتل بتایا جائے گا......؟ آج اہرام کی دریافت کے متعلق انتظامیہ کو انفارم کیا جا رہا ہے اور آج ہی ڈاکٹر شکیل ظفر کے بنگلے پر دو دو قتل ہو جاتے ہیں۔ پولیس آفیسر جب کڑیاں ملانے لگیں گے تو سچ جھوٹ کے کئی دھبے ہمارے چہروں کو مسخ کر دیں گے۔'' پروفیسر صاحب کی بات واقعی درست تھی۔ میری پریشانی دو چند ہو گئی۔

''تو پھر اس مسئلے کا حل کیا کیا جائے......؟'' میں نے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔ پروفیسر صاحب چند لمحے کے لئے خاموش ہو گئے اور ان کی آنکھوں میں سوچ کے بھنور نمودار ہو گئے اور پھر جیسے وہ مطمئن ہو گئے۔

''اس مسئلہ کا سب سے بہتر حل یہ ہے کہ لان میں گڑھا کھود کر ان لاشوں کو دفن کر دیا جائے اور یہ واقعہ ذہنوں سے کھرچ کر نکال دیا جائے گویا کہ کچھ ہوا ہی نہیں۔'' چند لمحات کے لئے ہم سب ہی اپنی اپنی جگہ سوچوں میں گم ہو گئے اور پھر جیسے سب کی سوچیں ایک ہی نکتے پر آ کر جم گئیں اور ہم سب حرکت میں آ گئے۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد پورے بنگلے میں کسی قتل کا کوئی ہلکا سا نشان تک باقی نہیں تھا۔ دونوں لاشیں دیوار کے ساتھ دفن کرنے کے بعد اوپر گملے سجا دیئے گئے تھے۔ بیڈ کی چادر جلا دی گئی تھی، گدا دھو کر پلٹ دیا گیا اوپر نئی بیڈ شیٹ ڈالی گئی۔ اور راہ داری کا فرش بھی جیسے چمک اٹھا۔

ہر طرف سے مکمل اطمینان ہو جانے کے بعد میں نے ایک گہری سانس لی۔ تمام اعصابی دباؤ تحلیل ہو گیا اور طبیعت قدرے فریش سی ہو گئی۔

سب ڈرائنگ روم میں آ بیٹھے۔

''اب اگر ایک ایک کپ گرما گرم کافی کا ہو جائے تو ذہن تر و تازہ ہو جائے گا۔'' ڈاکٹر عقیل نے صوفے پر نیم دراز ہوتے ہوئے کہا۔

''اس کے لئے آپ کو خود ہی زحمت کرنا ہو گی کیونکہ کافی بنانے والی سرکار زمین دوز کچن میں جا پہنچی ہے۔ میرا اشارہ خانسامے کی طرف تھا۔

''یہ تو پھر آپ کی غلطی ہوئی نا...... آپ کو چاہئے تھا کہ اس بیچارے کو دفن کرنے سے پہلے کہتے کہ اٹھ بھائی آخری بار اپنے ہاتھوں کی بنی کافی پلا دے۔''

''مجھے تو خیال نہیں رہا۔ایسا کریں آپ اب جا کر اسے نکالیں اور یہ فرمائش کر دیں۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ڈاکٹر عارب اچانک بھڑک اٹھے۔

''کچھ خوفِ خدا ہے آپ لوگوں میں یا نہیں......؟ یہاں دو قتل ہوئے ہیں، دو انسانوں کی موت واقع ہوئی ہے...... افسوس کا مقام ہے یہ...... اور آپ لوگ یوں چہلیں کر رہے ہیں جیسے ابا میاں کی شادی میں آئے بیٹھے ہو۔اتنے بے حس تو جانور بھی نہیں ہوتے...... وہ بھی اپنے ہم جنس کی موت پر مغموم ہو جاتے ہیں۔''

''وہ اس لئے مغموم ہو جاتے ہیں مسٹر عارب......! کہ وہ جانور ہوتے ہیں اور الحمدللہ ہم انسان ہیں۔'' ڈاکٹر عقیل نے ہنستے ہوئے کہا۔

میرے سامنے والے صوفے پر ڈاکٹر عقیل اور پروفیسر صاحب برابر برابر بیٹھے تھے اور دائیں طرف والے صوفے پر ڈاکٹر عارب اور اختر تھے۔ڈاکٹر عقیل اور عارب کے درمیان نوک جھونک ہو رہی تھی۔ میں اختر خاموش بیٹھے ان کی باتوں پر مسکرا رہے تھے جبکہ پروفیسر صاحب سنجیدگی کا لحاف اوڑھے ہوئے جانے کن سوچوں میں غرق تھے۔

اچانک کافور کی تیز خوشبو کا ایک جھونکا سا میرے نتھنوں سے ٹکرایا اور مجھے یوں لگا جیسے کوئی نادیدہ وجود میرے برابر صوفے پر آ بیٹھا ہو۔ہلکی سی کپڑوں کی سرسراہٹ بھی ابھری تھی۔ میں نے چونک کر اپنے برابر صوفے پر نظر ڈالی تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ایک یخ بستہ سلاخ سی میری کھوپڑی کی پشت میں اترتی چلی گئی۔صوفہ اپنی جگہ سے یوں نیچے کو دب گیا تھا جیسے سچ مچ کوئی اس پر آ بیٹھا ہو۔

میں نے بول کر دوسروں کی توجہ صوفے کی جانب متوجہ کرنا چاہی تو یکبارگی کافور کی تیز خوشبو کا ایک جھونکا میرے چہرے سے آ ٹکرایا اور میں باوجود ارادے کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکال پایا۔ کافور کی وہ مسحور کن خوشبو جیسے ایک لطیف جھلی کی طرح میرے چہرے کے خدوخال کے ساتھ لپٹ کر رہ گئی۔ میرے حواس جیسے سن

ہو کر رہ گئے، سماعت میں صرف ایک گونج رہ گئی۔آنکھوں کے سامنے کیا تھا ذہن اس کی تمیز کھو بیٹھا۔کان کیا سن رہے تھے، حواس اس سے بے نیاز ہو گئے، وجود جیسے پور پور جھڑ کر فرش پر بچھے قالین پر بکھر گیا۔

اور پھر اچانک گنبد سر کے اندر بپا گونج میں میری آواز ابھری۔میں خود سے مخاطب تھا۔

''شکیل ظفر......!تم مجسمے اور ان نوادرات سے اس قدر لاتعلقی اختیار کر رہے ہو...... کتنی تگ و دو، دردِ سری اور کتنا پیسہ برباد کرنے کے بعد تم انہیں حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے تھے...... تمہاری کتنی راتوں کا آرام و سکون غارت ہوا...... کیا اتنی جلدی فراموش کر بیٹھے کہ کتنے مزدوروں نے اس کوشش میں اپنی جانیں گنوا دیں......؟ تمہارے بنگلے میں تمہارے دو ملازموں کو بے دردی سے قتل کر دیا گیا اور تم سبکدوشی کا فیصلہ کر کے بیٹھ گئے۔کیا یہ زندگیاں اتنی ہی ارزاں اور بے وقعت تھیں......؟ان درندوں سے ان زندگیوں کا حساب کون لے گا شکیل ظفر......؟ کوئی تمہارے گھر میں گھس کر تمہارے دو ملازموں کو موت کے گھاٹ اتار کر تمہاری کوئی قیمتی متاع، تمہارا سامان، تمہاری ملکیت، تمہارا حق اٹھا کر لے جاتا ہے اور تم اس سب کو نظر انداز کر کے بیٹھ جاتے ہو۔کیا تمہارا یہ فیصلہ درست ہے......؟ کہاں ہے تمہاری خودداری، تمہاری انا، تمہاری غیرت......؟ تمہاری اصول پرستی......؟

خود کو سنبھالو شکیل ظفر......! پرکھو درست غلط کو...... جائز ناجائز میں تمیز کرو۔اپنے اصولوں کی کسوٹی پر پرکھ کرو۔تمہیں...... تمہیں ان درندوں کو ڈھونڈنا ہے...... ان معصوم زندگیوں کا حساب برابر کرنا ہے۔اپنا حق واپس لینا ہے۔وہ مجسمہ اور وہ نوادرات تمہاری ملکیت تھے اور لے جانے والے انہیں تمہارے بنگلے، تمہارے بیڈ روم سے اٹھا کر لے گئے ہیں۔تمہارے منہ پر طمانچہ مار گئے ہیں وہ تمہیں چیلنج کر گئے ہیں...... تمہیں اس طمانچے کا جواب دینا ہے...... تمہیں وہ سب حاصل کرنا ہے...... ان کا چیلنج قبول کرنا ہے...... وہ مجسمہ اور نوادرات ان سے واپس چھیننا ہے تمہیں...... یہ تمہارا حق ہے۔''

کوئی نادیدہ قوت تھی جو میرے حواس کو گرفت میں لئے ہوئے تھے۔ مجھے ہپناٹائز کیا جا رہا تھا۔ میری سوچوں کا رخ موڑا جا رہا تھا۔ یہ سب کیسے ہو رہا تھا۔ یہ بات میری عقل سے ماورا تھی۔

میری یہ سحر زدہ کیفیت اس وقت ختم ہوئی جب ڈاکٹر عارب نے مجھے کندھے سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔ میرے حواس عود کر آئے تو میں نے ڈاکٹر عارب کو اپنے سامنے پایا وہ مجھے جھنجھوڑ رہا تھا۔

''ڈاکٹر صاحب......! ڈاکٹر صاحب......!''

''آہ...... ہاں......کیا ہوا......؟ کیا بات ہے......؟'' میں ہونقوں کی طرح اس کی صورت دیکھنے لگا۔

''عجیب مذاق ہے...... الٹا ہم سے پوچھا جا رہا ہے کہ کیا ہوا......؟ آپ بتائیں کہ آپ کو کیا مسئلہ ہے......؟ کہاں گم ہوگئے تھے بیٹھے بیٹھے......؟'' سب کی سوالیہ نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ میں نے اپنے برابر صوفے پر نظر ڈالی دبا ہوا صوفہ فوراً ابھر آیا۔ کپڑوں کی سرسراہٹ بیدار ہوئی اور لحظہ بہ لحظہ دور ہوتی گئی۔ کافور کی تیز خوشبو بھی مدھم پڑ گئی۔

یہ میرا وہم ہرگز نہیں تھا میں نے واضح طور پر محسوس کیا تھا کہ کوئی غیر مرئی وجود میرے برابر سے اُٹھ کر ڈرائنگ روم کے دروازے کی طرف گیا تھا۔ میری متحیر نظریں دروازے کی جانب ہی مرکوز تھیں مگر کوئی ہلکا سا عکس بھی مجھے دکھائی نہیں دیا۔

''شکیل صاحب......! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا...... کیا مسئلہ ہے......؟ کیا نظر آ گیا آپ کو......؟'' ڈاکٹر عقیل نے تشویش زدہ لہجے میں مجھ سے سوال کیا۔

''لگتا ہے ڈاکٹر صاحب نے ان دو ملازموں کی موت کا کچھ زیادہ ہی اثر لے لیا ہے۔'' میں نے چونک کر ڈاکٹر عارب کی طرف دیکھا، حواس قدرے بحال ہوگئے تھے۔ منہ سے کوئی عجیب وغریب بات نکال کر تماشا بننے سے بہتر تھا کہ اصل معاملہ اندر ہی اندر دبا دیا جاتا۔ اس خیال پر میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اب ایسی بھی کوئی بات نہیں۔''

''شکیل......!'' پروفیسر صاحب نے گہری نظروں سے میرا جائزہ گیا۔

''کیا نظر آیا تھا تمہیں......؟''

''کیا مطلب ہے آپ کا......؟'' میں نے الٹا سوال کر دیا۔

''کیا محسوس کر رہے تھے ابھی تم......؟''

''اوہ......! پروفیسر صاحب......! جو آپ سب سمجھ رہے ہیں ایسی کوئی بات نہیں دراصل چند روز قبل گھر سے والد صاحب کا فون آیا تھا گھر میں کچھ پرابلم ہے۔ذرا پرائیویٹ اور سیریس قسم کی، اسی لئے بس ذرا......'' میں نے بات بنائی مگر سب کی آنکھوں سے محسوس کیا جا سکتا تھا کہ وہ پوری طرح میرے جواب سے مطمئن نہیں ہوئے۔

''اچھی بات ہے یہ لیں کافی پئیں۔'' ڈاکٹر عارب نے کافی کا کپ میری جانب بڑھایا پھر شاید میری آنکھوں میں ابھرتی حیرت کو وہ خود ہی سمجھ گیا۔

''جب آپ مراقبے میں پہنچے ہوئے تھے اسی دوران اختر کافی بنا کر لایا تھا۔'' اس نے میری حیرت رفع کی اور اپنی جگہ واپس جا بیٹھا۔

کپ سے اٹھتی ہوئی ہلکی ہلکی مہک ہی حواس کو لطف دے گئی۔میں خاموش سے کافی کے گھونٹ بھرنے لگا۔

''ہاں تو پروفیسر......! اب آپ بتائیں...... ذرا وہ کاغذات دکھائیں جن پر آپ نے تابوت اور مجسمے کی عبارت کا ترجمہ تحریر کیا تھا۔'' ڈاکٹر عارب نے پروفیسر کو مخاطب کیا۔

''وہ بھی غائب ہیں۔میں نے وہ کاغذات تابوت کے اوپر ہی رکھ دیئے تھے کہ بعد میں اطمینان سے باقی عبارت کا بھی جائزہ لوں گا۔لے جانے والے وہ صفحات بھی لے گئے ہیں۔''

''یہ بھی اچھی رہی۔''

''مگر کچھ تھوڑا بہت مجھے یاد ہے...... تابوت پر ہیرے جوڑ کر ایک نام لکھا گیا تھا۔'' پروفیسر کی نظریں خلا میں کسی نادیدہ نقطے پر مرتکز ہو گئیں۔

''وہ نام یقیناً اس شہزادی کا تھا جو اس مجسمے کے اندر محبوس ہے......

''مریاقس''...... ہاں یہی نام تھا۔''

حرماں نصیب ماں کی حرماں نصیب بیٹی

''مریاقس''

جو نہ مردہ ہے اور نہ زندہ ہے!

بالکل بلاشک وشبہ تابوت پر یہی عبارت تھی...... اور مجسمے پر کندہ عبارت میں کسی مسیحا کو مخاطب کیا گیا تھا ایک...... ایک ایسے مسیحا کو جو مردوں کو زندہ کر دینے والا علم جانتا ہے۔ جس کی آنکھیں جسموں کے اندر دیکھنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ کچھ ایسی ہی عبارت تھی وہ اور اگر غور کیا جائے تو بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ الفاظ ایک ڈاکٹر، ایک سرجن کے تخاطب میں کندہ کئے گئے ہوں گے۔ کیونکہ ایک سرجن کے پاس ہی یہ علم ہو سکتا ہے کہ وہ جسموں کے اندر، انسان کے اندرونی اعضاء تک دیکھ لیتا ہے اور آپریشن کے ذریعے ایک طرح کے مردے کو زندہ کر دیتا ہے اور شکیل ظفر وہ سرجن، وہ ڈاکٹر...... یعنی مجسمے پر کندہ عبارت میں جس مسیحا کو مخاطب کیا گیا ہے وہ کوئی اور نہیں...... تم ہو۔''

پروفیسر صاحب کی بات سن کر ڈاکٹر عقیل، عارب اور اختر تینوں چونک پڑے جبکہ مجھے یوں لگا جیسے میرے ذہن سے بہت بڑا بوجھ سرک گیا ہو۔ میں جس تذبذب کا شکار تھا اس سے چھٹکارا مل گیا۔ ایک فیصلہ سکون بن کر میرے اندر اترتا چلا گیا۔

''پروفیسر......! آخر آپ ثابت کیا کرنا چاہتے ہیں......؟ آپ کا ایسی باتیں کرنے کا مقصد کیا ہے......؟ آپ خود کو پُراسرار شخصیت ثابت کر کے اپنا رعب جمانا چاہتے ہیں یا ہمیں خوفزدہ کرنا چاہتے ہیں......؟'' عارب پروفیسر صاحب پر بگڑ پڑا۔ پھر پروفیسر صاحب کے کچھ بولنے سے پہلے ہی میں بول پڑا۔

''پروفیسر......! میں آپ کی بات سے اتفاق کرتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ نے جو بتایا تابوت اور مجسمے پر وہی کندہ ہوگا اور اس عبارت سے جو مفہوم آپ نے اخذ کیا ہے وہ درست ہے۔ مگر اب آپ یہ بتائیں کہ مجسمہ تو نہ جانے کون لے

گیا اور اس وقت کہاں ہوگا اس کا بھی کچھ اندازہ نہیں اب اگر اسے حاصل کرنا ہو تو کیا کیا جائے......؟" میری سنجیدگی کو محسوس کر کے میرے ساتھی ڈاکٹرز متحیر نظروں سے میری سمت دیکھنے لگے جبکہ پروفیسر کی آنکھیں اندرونی مسرت کی شدت سے چمک اٹھیں۔

"ہم کوشش کریں گے شکیل......! مجھے یقین ہے کہ ہم جلد کوئی نہ کوئی سراغ پانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔"

"پروفیسر صاحب......! کیا آپ کو کچھ اندازہ ہے کہ یہ کام کس کا ہو سکتا ہے......؟"

"یہاں مصر میں ایسے بہت سے گروہ ہیں جو بھاری معاوضہ لے کر نوادرات چرانے کی وارداتوں میں ملوث ہیں...... ہو سکتا ہے کہ یہ کارروائی کسی ایسے ہی گروہ کی ہو۔ مگر یقین کے ساتھ ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اس سارے معاملے کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے، یا یہ کس کی حرکت ہے۔"

☆☆☆

''پروفیسر صاحب......!'' میں نے ایک خیال کے تحت کہا۔
''کہیں یہ کام مزدوروں کا نہ ہو......؟''
''نہیں...... یہ ناممکن ہے۔ مزدوروں کو تو ان نوادارات کا علم ہی نہیں۔ یہ پوری رازداری کے ساتھ یہاں پہنچائے گئے تھے۔ مزدوروں کے تو خواب و خیال میں بھی نہیں ہوگا۔''
''پروفیسر صاحب......! یہ کیسے ممکن ہے......؟ اگر یہ کام کسی پیشہ ورانہ گینگ کا بھی ہے تو آخر اس گینگ تک بھی تو کہیں سے اطلاع پہنچی ہی ہوگی نا...... ورنہ انہیں الہام تو ہوا نہیں ہوگا۔''
''ہاں...... یہ بات تو تمہاری درست ہے۔'' پروفیسر صاحب کی پیشانی پر شکنیں ابھر آئیں۔
''مگر میرے ذہن میں ایسا کوئی پہلو نہیں جو کمزور رہ گیا ہو...... جہاں...... جہاں سے یہ نقب لگائی گئی ہے۔''
''اور پھر ابھی تو کوئی وقت بھی نہیں گزرا تھا......؟''
''جو بھی ہے تم بے فکر ہو جاؤ۔ میرے چند جاننے والے ہیں جن کا ایسے جرائم کرنے والوں میں اٹھنا بیٹھنا ہے۔ میں دو چار دن میں ہی پتہ چلا لوں گا کہ یہ کام کن کا ہے......؟''

''محترم ......! میں تو مشورہ دوں گا کہ اس تجسس سے اپنے ذہنوں کو نجات دلا لیجئے کہیں کوئی احمقانہ حرکت کر بیٹھے تو شاید پچھتانے کا موقع بھی میسر نہ ہو۔'' عارب نے درمیان میں مداخلت کی۔

''کون سی احمقانہ حرکت......؟'' پروفیسر کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

''یہی مجسمے کا سراغ لگانے کی یا ان کرمنلز تک پہنچنے کی جنہوں نے مجسمہ چرایا ہے۔ جس انداز میں یہ ساری کارروائی ہوئی ہے اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کام کرنے والے کوئی معمولی کرمنلز نہیں ہیں۔ چند گھنٹوں کے اندر جس برق رفتار اور منظم انداز میں یہ سب ہوا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مجرم انتہائی ذہین اور خطرناک ہیں۔ دو دو قتل بھی کر گئے ایک تابوت اور کئی نوادرات بھی لے اڑے اور اپنے عقب میں کوئی ہلکا سا نشان تک نہیں چھوڑ کر گئے...... کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ لوگ ان کا سراغ لگانے کے چکر میں ہوں اور وہ آپ کی کھوپڑیوں میں سوراخ کر جائیں اور کسی کو کانوں کان خبر تک نہ ہو۔''

''ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ تم بے فکر رہو۔''

''کیوں آپ کیا سلیمانی ٹوپی پہن کر گھومیں گے......؟ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ آپ کو توقع نہیں ہے مگر ایسا ہوسکتا ہے۔ ہم لوگوں کی طرف سے وہ اتنے بے خبر نہیں ہوں گے۔ نامعلوم وہ کتنے باوسائل ہوں، یہ بھی ممکن ہے کہ ہم خوش فہمیوں کا شکار ہوں اور اس وقت یہاں جو پلان ترتیب دیئے جا رہے ہیں وہ یہ سب کہیں بیٹھے سن رہے ہوں۔ ان کے بااثر ہونے کی منہ بولتی مثال تابوت اور نوادرات کی چوری ہے۔''

عارب نے سرسری سے انداز میں کہہ دیا مگر اسے خود احساس نہ ہوا کہ اس نے کیسی سنگین صورت حال ہمارے سامنے بے پردہ کر دی ہے۔

چند لمحے کے لئے پروفیسر صاحب کو بھی چپ لگ گئی۔ عین ممکن تھا کہ ہمارے آس پاس ہی کہیں کوئی حساس آلہ چھپایا گیا ہوتا اور ...... اور ہمارے مابین ہونے والی گفتگو کو کسی دوسری جگہ سنا جا رہا ہوتا۔ پروفیسر صاحب نے مجھے آنکھوں ہی

آنکھوں میں یہ گفتگو پھر پر رکھنے کا اشارہ کیا اور گفتگو کا رخ موڑ دیا۔

کچھ دیر ہم ادھر ادھر کی گفتگو کرتے رہے پھر اٹھ کھڑے ہوئے۔

☆☆☆

رات کو جب میں بنگلے پر سونے کے لئے آیا تو میرے لاشعور کی سطح پر چوکیدار اور خانسامہ کی خون میں لت پت لاشیں ابھر آئیں۔ ذہن میں عجیب سی سرسراہٹیں جنم لے رہی تھیں اور رگوں میں دوڑتا خون جھٹکے لے لے کر گردش کر رہا تھا۔

بیڈ روم میں آیا تو بستر پر لیٹتے ہوئے مجھے عجیب سی وحشت نے آ دبوچا۔ بار بار میں چونک پڑتا۔ یوں احساس ہوتا جیسے میرے پہلو میں خانسامہ کی لہو میں لتھڑی لاش پڑی ہو اور اپنی پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے ہی گھور رہی ہو۔ ہر لحظہ یہ احساس قوی ہوتا گیا۔ آخر کار میں بستر سے اٹھ کر صوفے پر آ بیٹھا۔

ذہن کو ان خیالات سے چھٹکارا دلانے کی غرض سے میں نے سوچوں کا رخ موڑ لیا۔

پروفیسر صاحب جاتے ہوئے کہہ گئے تھے کہ وہ اپنے طور پر مجسمے کا سراغ لگانے کی کوشش کریں گے اور چند روز بعد دوبارہ چکر لگائیں گے۔ میں بذات خود بڑی بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ کس طرح آنکھ جھپکتے ہی اس سنہرے مجسمے تک پہنچ جاؤں۔ رگوں میں اضطراب کھولنے لگا تھا اور اپنی یہ کیفیت خود میری سمجھ سے بالا تھی۔

جوں جوں وقت گزرتا گیا میرے ذہنی انتشار اور اضطراب میں اضافہ ہوتا گیا۔ میں اٹھ کر بے چینی سے صوفوں کے درمیان ٹہلنے لگا۔

اسی کیفیت میں رات نصف سے زیادہ گزر گئی تقریباً ڈھائی تین بجے کا وقت رہا ہوگا جب لان سے ایک سمجھ نہ آنے والی آواز بلند ہوئی اور میں چونک پڑا۔

آواز بہت مدہم تھی مگر میرا وہم نہ تھی۔ چند لمحے مزید گزرے آواز ایک بار پھر بلند ہوئی۔ اس بار وہ آواز قدرے واضح تھی مگر ناقابل فہم۔

میرے ذہن میں خطرے کے الارم بج اٹھے۔ لاشعور چیخ پڑا۔

''لان میں کوئی ہے...... کوئی ہے......؟''

میں نے تیزی سے بیڈ سائیڈ دراز کھولی اور پسٹل نکال لیا۔ میگزین چیک کی وہ فل تھی۔ پہلا خیال میرے ذہن میں یہی آیا کہ جن لوگوں نے مجسمہ چرایا ہے وہی ہوں گے اور ہو نہ ہو میرے قتل کے ارادے سے بنگلے میں داخل ہوئے ہیں۔

پھر ایک خیال آتے ہی میں تیزی سے ٹیلی فون کی طرف بڑھ گیا۔ آئندہ لمحے میں ڈاکٹر عقیل کے نمبر پریس کر رہا تھا۔

پانچویں بیل پر ریسیور اٹھا لیا گیا۔

''ہیلو......!'' ڈاکٹر عقیل کی نیند سے بوجھل آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

''ہیلو ڈاکٹر عقیل......! میں شکیل بات کر رہا ہوں۔ میرے بنگلے میں کوئی گھس آیا ہے۔ آپ فوری طور پر عارب کو ساتھ لیں اور یہاں پہنچیں۔ چوکیدار کو بھی ساتھ لے لیجئے گا۔'' میں نے تیز لہجے میں کہا۔

''کیا......؟'' ڈاکٹر عقیل جیسے اچھل پڑے۔

''کون گھس آیا ہے......؟ آپ...... آپ فکر مت کریں شکیل صاحب......! میں ابھی پہنچ رہا ہوں۔'' ڈاکٹر عقیل نے بدحواسی سے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔ میں نے ریسیور رکھا اور لپک کر کمرے کی لائٹ آف کر دی۔ پورا کمرہ گاڑھے اندھیرے سے بھر گیا۔

میں دبے قدموں دروازے کی سمت بڑھنے لگا۔ اعصاب ایک سنسنی کا شکار تھے۔ دل تھا کہ دھک دھک کر رہا تھا۔ پسٹل میرے دائیں ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا۔ دروازے کے قریب پہنچ کر میں نے بلٹ لوڈ کی اور ہاتھ دروازے کے ہینڈل پر رکھ دیا۔ چند لمحے میں دروازے سے کان لگائے خاموش کھڑا رہا مگر باہر مکمل خاموشی طاری تھی۔

میں نے آہستہ سے دروازہ کھول دیا۔ آسمان ستاروں سے بھرا ہوا تھا جن کی مدہم روشنی میں لان کے اطراف رکھے پھولوں کے گملے چھلاووں کی صورت دکھائی

دے رہے تھے۔ فضا سناٹے میں جکڑی ہوئی تھی۔ کہیں کوئی آواز، کوئی آہٹ نہ تھی۔ لان بھی سنسان سا تھا نہ کہیں کسی انسان کا سایہ دکھائی دے رہا تھا نہ ہیولہ۔

میں محتاط قدموں سے باہر نکلا اور برآمدے کے ستون سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ میرے کان کسی بھی آہٹ، کسی بھی آواز کے منتظر تھے۔ مگر فضا پر خاموشی کی دبیز تہہ جمی ہوئی تھی۔ کہیں کسی آواز کی ہلکی سی گرد تک نہ تھی۔

کچھ دیر کے انتظار کے بعد ستون کی اوٹ سے نکلا اور چوکنے انداز میں لان کی مغربی دیوار کی سمت بڑھ گیا۔ جہاں ''گلیر'' کے دو درخت لگے ہوئے تھے۔ جن کے پھولوں کی خوشبو نے پوری رات کو مہکا رکھا تھا۔

میں آہستہ روی سے آگے بڑھ رہا تھا اور میری نظریں تیزی سے اطراف کا جائزہ لے رہی تھیں۔ لان کے وسط میں پہنچ کر اچانک میری نظریں اپنے سامنے چند قدم کے فاصلے پر پڑیں تو بے اختیار میرے قدم ٹھٹک کر رک گئے۔

دہشت کی تیز دھار سلاخ جیسے کسی نے عقب سے میری گردن میں گھسیڑ دی۔ میرے سامنے چار قدم کے فاصلے سے لان کے گھاس پر دو انسانی وجود منہ کے بل پڑے تھے۔ ان کی پوزیشن احساس دلاتی تھی کہ وہ زندگی سے محروم ہیں۔ اس کے باوجود میں ڈرتے قدموں سے آگے بڑھ کر ان کے قریب پہنچ گیا۔ پسٹل پر میری گرفت پہلے سے مضبوط ہوگئی...... میں نے ڈرتے ڈرتے دونوں کا جائزہ لیا اور میرے اندازے کی تصدیق ہوگئی۔ دونوں وجود مردہ تھے مگر ان کے جسم کے کسی بھی حصے پر کسی قسم کے زخم کا کوئی نشان نہیں تھا۔ یقیناً وہ میرے قتل کے ارادے سے آئے تھے کیونکہ دونوں ہی مسلح تھے۔

اچانک صندل اور کافور کی تیز خوشبو میرے نتھنوں سے ٹکرائی اور میں چونک پڑا۔ ایک عجیب سی آہٹ نے مجھے پلٹنے پر مجبور کر دیا اور پھر جو منظر میرے احاطہ بصارت میں آیا اس نے مجھے مبہوت کر کے رکھ دیا۔ پورے وجود کے رونگٹے گویا تن کر الرٹ ہو گئے۔

میرے سامنے سفید دھوئیں کا ایک ستون سا ایستادہ تھا جس کے اندر گردش

کرتی روشنیوں نے اس دھوئیں میں ایک خیرہ کن چمک پیدا کر دی تھی اور اس دھوئیں کے اندر ایک انسانی پیکر کھڑا تھا۔ غالباً اس پیکر نے بھی سفید ہی لبادہ اوڑھا ہوا تھا کیونکہ اس کے وجود کا ہلکا سا عکس ہی تھا جس کی جھلک دکھائی دے رہی تھی البتہ چہرے کے خدوخال واضح تھے۔ وہ کوئی عورت تھی ادھیڑ عمر مہرباں صورت۔ کشادہ پیشانی، لمبی لمبی آنکھیں، باریک ہونٹ اور تیکھی ناک۔ چہرے پر ایک عجیب سا سکوت ایک وقار۔

''گھبراؤ نہیں بیٹا......! تمہیں مجھ سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔'' آواز میں ایک نرمی تھی۔

''آ......آپ......!'' میری زبان ہکلا گئی اور میں اپنی بات مکمل نہیں کر سکا مگر شاید وہ میرے دل کی بات خود ہی سمجھ گئی۔

''میں......حرماں نصیب مریاقس کی ماں ہوں۔'' بیوسا''

''مریاقس......؟'' میں زیرلب بڑبڑایا اور میری نظریں ایک لمحے کو اپنے عقب کی جانب سرک گئیں۔

''اور یہ لاشیں......؟''

''انہیں میں نے زندگی سے نجات دلائی ہے۔ کیونکہ یہ تمہیں ہلاک کرنے کی نیت سے آئے تھے۔

''اور تم تو میرے لئے...... مریاقس کے لئے رحمت کا فرشتہ ہو، مسیحا ہو۔ کیونکہ صرف تم ہی ہو جو مریاقس کو جامد عذاب سے نجات دلا سکتے ہو۔''

''یہ مجھے کیوں ہلاک کرنا چاہتے تھے۔ اور...... میں مریاقس......! عذاب......؟'' میرا ذہن الجھن کا شکار ہو گیا۔

''آپ ذرا تفصیل سے بتائیں مجھے......!'' میرا انداز الجھن آمیز تھا۔

''اے نیک مسیحا......! میرے پاس اتنا اختیار نہیں۔ میں ایک بدنصیب بیٹی کی ماں ہوں...... میری ممتا کو سکون میسر نہیں...... ہزاروں سال گزر گئے میری لخت جگر اذیت ناک عذاب جھیل رہی ہے...... میں...... میں تم سے درخواست کرتی

ہوں۔ اے مسیحا......! ایک مضطرب ماں تم سے التجا کرتی ہے کہ میری بچی کو ڈھونڈ اور اسے اس عذاب سے رہائی دلاؤ جس میں وہ ہزاروں سال سے مبتلا ہے۔''

ٹھیک اسی لمحے کال بیل چیخ اٹھی۔

''مگر میں اسے کہاں سے ڈھونڈ کر لاؤں اور...... اور بھلا میں اسے کسی عذاب سے کیسے نجات دلا سکتا ہوں......؟'' بیل کی آواز ایک مرتبہ پھر بلند ہوئی۔ دھوئیں میں ملفوف بیوسا کا پیکر جھلملانے لگا۔

''مریاقس کہاں ہے...... یہ تم 'جسونت دیال' سے پوچھ سکتے ہو۔ جب اسے ڈھونڈ لو گے تو باقی کی حقیقت تم پر از خود منکشف ہو جائے گی۔ اب میں پلٹتی ہوں تم تمام لائٹیں روشن کر دو اور ان لاشوں کا کسی سے ذکر مت کرنا۔'' وہ پیکر...... وہ دھواں شاید فضا میں ہی کہیں تحلیل ہو گیا۔ اب وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔

بیل کی آواز تیسری بار بلند ہوئی اور میں اندرونی جانب بڑھ گیا۔ بیڈ روم، برآمدہ، ڈرائنگ روم اور راہ داری کی لائٹیں آن کرتے ہوئے میں دروازے کی سمت بڑھ گیا۔ میں نے پوچھا کہ کون ہے دوسری جانب عقیل تھا۔ میرے دروازہ کھولتے ہی وہ تیز لہجے میں بولے۔

''سب خیریت تو ہے نا......؟'' چوکیدار بھی ان کے ہمراہ تھا اس کے ہاتھ میں بھی رائفل تھی اور ڈاکٹر عقیل کے ہاتھ میں بھی ریوالور پکڑا ہوا تھا۔

''ہاں...... سب خیریت ہے کوئی مسئلہ نہیں۔'' میں نے پسٹل نیفے میں اڑس لیا۔ پھر چوکیدار کو مخاطب کیا۔

''تم واپس چلے جاؤ۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔'' اور وہ بغیر کچھ کہے واپس پلٹ گیا۔ ڈاکٹر عقیل اندر آ گئے۔ ان کے چہرے سے پریشانی ظاہر ہو رہی تھی۔ میں نے دروازہ لاک کیا اور پلٹ پڑا۔

''کیا مسئلہ تھا......؟ کون تھا......؟'' ڈاکٹر عقیل بری طرح گھبرائے ہوئے تھے۔ انہوں نے لباس بھی چینج نہیں کیا تھا، شب خوابی کے لباس میں ہی اٹھ کر دوڑے آئے تھے۔

''ہوگا کوئی چور...... میں نے پکڑنے کی کوشش تو کی تھی مگر بھاگ گیا۔'' ہم چلتے ہوئے دوسرے حصے میں پہنچے تو میں چونک پڑا۔ ڈاکٹر عارب اور اختر ہاتھوں میں پستول پکڑے ہمارے سامنے کھڑے تھے۔

''تم لوگ کدھر سے آئے......؟'' حیرت میرا انداز تھی۔

''دیوار سے...... ڈاکٹر عقیل نے کہا تھا کہ جب تیسری بیل کی آواز سنائی دے تو ہم لوگ دیوار پھاند کر اندر داخل ہو جائیں۔ مسئلہ کیا تھا......؟'' ڈاکٹر اختر نے مسکراتے ہوئے لہجے میں کہا۔

میری نظریں بے اختیار لان کی جانب اٹھ گئیں۔ حیرت کا ایک دھچکا سا لگا۔ لاشیں غائب تھیں۔ یقینی بات تھی کہ بیوسا کی روح نے انہیں غائب کر دیا ہوگا۔ میں مسکراتے ہوئے ڈرائنگ روم کی جانب بڑھ گیا۔

''کوئی چور تھا، بھاگ گیا۔''

''میری صلاح مانیں ڈاکٹر صاحب......! تو اب یہ بنگلہ چھوڑ دیں۔ اس بنگلے کی گردش شروع ہوگئی ہے۔ دن میں نوادرات غائب ہوتے ہیں...... دو قتل کیے جاتے ہیں اور رات کو چور آتے ہیں...... حیرت ہے......!'' اختر نے معنی خیز انداز میں کہا۔ میں اس کے لہجے کا مطلب تو سمجھ گیا تھا مگر میں نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

''آپ کا فون آیا تو میں تو گھبرا ہی گیا تھا۔ یہاں آتے ہوئے دل ہی دل میں دعا مانگ رہا تھا کہ خدا خیر کرے اور آج تو بڑی مدت کے بعد اتنی اچھی نیند آئی تھی۔ کیا خوب صورت خواب تھا۔'' ڈاکٹر عقیل نے صوفے پر تقریباً گرتے ہوئے کہا تو اختر ہنس پڑا۔

''عقیل صاحب......! آپ کی جوانی ڈھل رہی ہے، بڑھاپے کا آغاز ہے اور اس عمر میں خوب صورت خواب......؟ عجیب سی بات ہے......!''

''کیوں بھئی......! اس میں عجیب بات کیا ہے......؟ بھلا بڑھاپے کا خوابوں سے کیا تعلق......؟ اور پھر بڑھاپا کہاں سے آگیا......؟ ابھی تو جوانی پوری طرح وارد نہیں ہوئی اور تم بڑھاپا لے کر آگئے۔'' ڈاکٹر عقیل نے کچھ اس انداز سے کہا کہ بے

اختیار مجھے ہنسی آ گئی۔

''نہیں...... ابھی تو آپ پر بچپنا بھی پوری طرح نہیں آیا۔''

''نہیں...... ابھی یہ پیدا بھی نہیں ہوئے۔'' ڈاکٹر عارب نے اپنے مزاج کے مطابق کھردرے لہجے میں کہا۔

''ہاں...... اور تم مجھے پیدا ہونے بھی نہ دینا۔ تمہارا تو وہ حال ہے کہ نہ کھیلنا اور نہ کھیلنے دینا۔''

''نہیں عقیل صاحب......! یہاں تو آپ کو یہ کہنا چاہیے تھا کہ نہ پیدا ہونا اور نہ کسی کو پیدا ہونے دینا۔'' اختر نے قہقہہ لگایا۔ وہ مذاق پر مگن ہو گئے اور میں سوچوں میں، میرے ذہن میں جسونت دیال کا نام گونج رہا تھا۔

جسونت دیال......؟ پروفیسر فاضل بصاری کا شاگرد جو چند روز قبل ہی انڈیا سے یہاں آیا تھا اور جب مجھے اہرام سے بے ہوشی کے عالم میں نکالا گیا تھا تو وہ بھی ساتھ تھا۔ نوادرات اور مجسمے کے متعلق اسے بھی آگاہی تھی۔ تمام صورت حال مجھ پر واضح ہوتی گئی اور ذہن نے ایک مضبوط فیصلہ کر لیا۔ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ مجسمے کو دوبارہ حاصل کرنے کا جنون جیسے میرے دماغ کی آغوش میں پرورش پا رہا تھا۔

☆☆☆

میں نے گزشتہ رات کی ساری رام کہانی فون پر پروفیسر صاحب کے گوش گزار کر دی۔ میری ساری بات سننے کے بعد پروفیسر صاحب سنجیدہ لہجے میں گویا ہوئے۔

''اس صورت حال میں ہم جسونت پر صرف شک کر سکتے تھے شکیل......! کیونکہ شروع سے ہی اس کا ریکارڈ کچھ ایسا ہی ہے۔ مگر مریاقس کی ماں بیوسا کی روح کے خود آ کر جسونت کے بارے میں ایسے الفاظ کہہ دینے سے شک یقین میں بدل جاتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہم جسونت کے ذریعے مریاقس کا تابوت دوبارہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔''

''پروفیسر......! اس صورت حال میں مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔''

''شکیل......! اس معاملے میں تمہارے کام آنا میں اپنے لئے اعزاز سمجھوں گا۔ بلکہ میری تم سے درخواست ہے کہ اس کہانی میں مجھے بھی اپنا ہم سفر بنا لو۔ اس داستان میں میری ذات کا ملوث ہونا میرے لئے کسی اعجاز سے کم نہیں...... میں تمہارے ساتھ رہ کر صدیوں سے الجھی ہوئی اسرار کی یہ گھتیاں سلجھانا چاہتا ہوں۔''

''پروفیسر صاحب......! یہ میری خوش نصیبی ہوگی کہ مجھے آپ کا تعاون حاصل ہوگا۔ آپ جسونت کو ہمراہ لئے میرے بنگلے پر چلے آئیں۔ اب اصل کیا ہے یہ اس کی زبان سے ہم یہیں اگلوائیں گے۔''

''ٹھیک ہے شکیل......! گو کہ یہ سب میرے پیشے اور مرتبے سے متصادم ہے مگر مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں۔ اس معاملے میں میں کسی بھی حد تک جا سکتا ہوں۔ تم انتظار کرو میں جسونت کو لے کر پہنچ رہا ہوں۔''

''ٹھیک ہے میں منتظر ہوں۔'' میں نے ریسیور رکھا اور چند لمحے اپنے منصوبے کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد میں نے ریسیور اٹھا کر ڈاکٹر عارب کے نمبر پریس کر دیئے۔

''عارب......! فوراً میرے آفس میں پہنچو۔'' میں نے ریسیور رکھ دیا۔ کچھ ہی دیر بعد ڈاکٹر عارب میرے آفس میں موجود تھا اور میں نے بجز تمہید اسے اپنے ارادے سے آگاہ کر دیا۔

''ٹھیک ہے...... یہ سب اگر مناسب سمجھتے ہیں تو آپ کی مرضی......! میں ہر تعاون کے لئے تیار ہوں۔'' عارب نے کندھے اچکا دیئے۔

''تو ٹھیک ہے...... میں بنگلے پر جا رہا ہوں۔ جیسے ہی پروفیسر آئیں تم انہیں ساتھ لے کر چلے آؤ۔'' میں اٹھ کھڑا ہوا۔

''اوکے......! میں آفس سے نکلا اور سیدھا بنگلے پر آ گیا۔

واقعات کی کڑیاں ایک دوسرے سے مربوط ہو ہو کر ایک زنجیر کی صورت اختیار کرنے لگیں۔ ایک مزدور کا ناقابل یقین انداز میں زخمی ہو کر یہاں پہنچنا، دمیر اطوس اور انا آطوکا کا عجیب طریقہ کار سے مجھ سے ملنا، کھدائی کے دوران انا آطوکا

کھدائی کے اصل مقام کی رہنمائی کرنا، اس کے ادا کیئے ہوئے عجیب وغریب الفاظ کا ماسواء میرے کسی دوسرے فرد کی سمجھ میں نہ آنا۔ اہرام کے اندر محبوس ہو کر موت کی دیوی کے قدموں تک پہنچ جانے پر پروفیسر صاحب کی غیر متوقع آمد، نوادرات کی چوری کے بعد میرا ان سے لاتعلق ہونا اور ''بیوسا'' کا میرے پہلو میں صوفے پر آ کر بیٹھنا اور میری سوچوں کو ہپناٹائز کرنا، رات کو میرے قتل کے ارادے سے آئے ہوئے دو افراد کو بیوسا کی روح کا ہلاک کرنا اور مجھے مریاقس کے وجود کو ڈھونڈنے پر مجبور کرنا، اسے کسی عذاب سے نجات دلانے کے لئے بیوسا کا مجھ سے درخواست گزار ہونا، اور......اور مجسمے پر کندہ تحریر کا حیرت انگیز مفہوم۔

میری ذات پر بہت کچھ واضح ہوتا جا رہا تھا۔ نہ جانے میں کب تک ان سوچوں کے درمیان الجھا رہا۔ یہ سلسلہ اس وقت ٹوٹا جب کال بیل کی آواز میرے پردۂ سماعت کو جھنجوڑ گئی۔ میری توقع کے مطابق ڈاکٹر عارب پروفیسر صاحب اور جسونت دیال کو ساتھ لے کر آیا تھا۔

جسونت کوئی تیس سال کا چھریرے بدن اور درمیانے قد کا جوان تھا۔ اس نے بڑی گرم جوشی کے ساتھ مجھ سے ہاتھ ملایا تھا۔ میں پروگرام کے مطابق انہیں لے کر اپنے بیڈ روم میں آ گیا۔ جبکہ عارب پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق کافی بنانے کے لئے چلا گیا۔

''ڈاکٹر صاحب......! سنائیں اب طبیعت کیسی ہے......؟'' گفتگو کا آغاز جسونت نے ہی کیا۔

''ذات باری تعالیٰ کا خاص کرم ہے۔ بالکل پرفیکٹ ہو گیا ہوں۔''

''دراصل مجھے کچھ ایمرجنسی تھی اس لئے میں چلا گیا تھا ارادہ تو تھا کہ جلد لوٹ آؤں گا مگر مسئلہ کچھ ایسا تھا کہ مجھے تاخیر ہو گئی اور میں نہیں آ سکا۔'' جسونت نے شرمندہ سے لہجے میں کہا۔ بڑا شاندار اداکار معلوم ہوتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اسے کیا ایمرجنسی آ پڑی تھی اور یہ کہ وہ کہاں گیا تھا؟

اسی دوران عارب ٹرے میں چار کپ کافی لے آیا۔ سب سے پہلے اس نے

جسونت کو کپ پیش کیا پھر مجھے اور پروفیسر کو کپ پکڑایا اور چوتھا کپ خود اٹھا کر ایک طرف بیٹھ گیا۔

''آپ کا یہاں مصر میں کب تک رکنے کا پروگرام ہے......؟'' میں نے جسونت سے سوال کیا۔ پروفیسر صاحب بڑی گہری نظروں سے میری صورت دیکھ رہے تھے۔ شاید انہوں نے میرے چہرے پر پھیلی ہوئی سنگینی کو محسوس کر لیا تھا۔

''میں جن امور کی تکمیل کے لئے یہاں آیا تھا وہ مکمل ہو گئے ہیں۔ میں آج رات بارہ بجے کی فلائٹ سے واپس انڈیا جا رہا ہوں۔'' جسونت نے کافی کا گھونٹ بھرا۔

''کس سلسلے میں آئے تھے آپ یہاں......؟''

''بس کچھ ذاتی قسم کے مسئلے مسائل تھے۔''

''پروفیسر صاحب نے بتایا تھا کہ تاریخ کے ساتھ ساتھ آپ کو آثارِ قدیمہ سے بھی گہری دلچسپی ہے۔''

''ہاں جی......! انہوں نے درست فرمایا ہے۔ تاریخ اور آثارِ قدیمہ کا تو آپس میں گہرا ربط ہے۔ عہد قدیمہ کی تہذیب سے متعلق تجسس تو میری فطرت میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے تب سے میں آثارِ قدیمہ میں بڑی اٹریکشن فیل کرتا ہوں۔''

''آپ کو نوادرات جمع کرنے کا بھی شوق ہوگا......؟''

''جنون کی حد تک...... مگر میرے پاس اتنے وسائل نہیں کہ میں اپنے اس ذوق کی تسکین کر سکوں۔'' جسونت نے آخری گھونٹ بھرا اور کپ سامنے ٹیبل پر رکھ دیا۔

''تو محدود وسائل ہونے کی صورت میں آپ کس طرح اپنے اس ذوق کی تسکین کر رہے ہیں......؟''

''تسکین ہی تو نہیں ہو پا رہی جس کے باعث روز بروز میری تشنگی میں اضافہ ہی ہو رہا ہے۔''

''کیا ان میں کوئی ممی بھی ہے......؟'' میری بات پر جسونت کے چہرے پر ایک سایہ سا آکر گزر گیا۔

''نہیں...... یہ اپنے اختیارات اور حیثیت سے بہت اوپر کی بات ہے۔'' جسونت نے مسکرانے کی کوشش کی۔

''اور کوئی مجسمہ وغیرہ......؟'' اس بار واضح طور پر جسونت کے چہرے کی رنگت متغیر ہوگئی مگر اس نے اپنے تاثرات بڑی تیزی سے چھپا لئے۔

''کس قسم کا مجسمہ......؟''

''مسٹر جسونت......! اداکاری تو تم اچھی کر لیتے ہو مگر ابھی بہت کمی ہے۔ ہاں...... اداکاری کی صلاحیتیں تم میں ضرور موجود ہیں۔'' میں صوفے سے پشت ٹکا کر مطمئن انداز میں بیٹھ گیا۔ میرے لہجے کی تبدیلی محسوس کر کے جسونت کے چہرے کے تاثرات الجھن آمیز ہوگئے جبکہ عارب اپنی جگہ مستعد ہو بیٹھا۔

''کیا مطلب ہے آپ کا......؟'' جسونت سیدھا ہو بیٹھا۔

''اب بننے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ میں حقیقت جان چکا ہوں۔ تمہاری صحت کے لئے بہتر ہوگا کہ تمام معاملہ خود ہمیں بیان کر دو کہ ممی کہاں ہے...... ورنہ دوسرا طریقہ کار تمہارے لئے بھی دردناکیوں کا پیغامبر ہوگا اور ہمیں بھی فضول میں سر دردی ہوگی۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔ جسونت کی پیشانی پر بل پڑ گئے وہ رخ بدل کر پروفیسر صاحب سے مخاطب ہوا۔

''پروفیسر صاحب......! یہ کیا ہانک رہے ہیں......؟ آپ تو ان کی بہت تعریفیں کر رہے تھے اور ان کو بات کرنے کا بھی سلیقہ نہیں۔''

''برخوردار......! میں تو غیر جانبدار ہوں۔ یہ جو جاننا چاہتے ہیں انہیں خود ہی بتا دو ورنہ انہیں تو سلیقہ نہ سہی تمہیں یہ بات کرنے کا سلیقہ ضرور سکھا دیں گے۔'' پروفیسر صاحب چشمے کے موٹے شیشوں کے اوپر سے جسونت کی طرف دیکھ کر معنی خیز انداز میں گویا ہوئے۔

''کیوں مسٹر جسونت......! کیا خیال ہے پھر......؟''

''کس بارے میں......؟ آپ کیا کہہ رہے ہیں...... کیا چاہتے ہیں...... میں کچھ نہیں سمجھ رہا۔'' جسونت نے بیزاری سے کہا۔ میں نے عارب کی طرف دیکھا وہ اٹھ کر دروازے کی سمت بڑھ گیا اور میں جسونت سے مخاطب ہوا۔

''تمہیں امن سکون اچھا نہیں لگتا۔ بدامنی کے خواہاں ہو تو ٹھیک ہے۔ یوں ہی سہی......'' عارب نے دروازہ بند کر کے چٹخنی چڑھا دی۔

''یہ...... یہ سب کیا ہے......؟ دروازہ کیوں بند کیا ہے تم نے......؟'' جسونت اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا آگے بڑھنے کا ارادہ عارب کے ہاتھ میں ریوالور دیکھتے ہی دم توڑ گیا۔

وہ میری طرف پلٹا تو میرے ہاتھ میں بھی پسٹل تھا۔ اس صورت میں جیسے اس کی روح ہی فنا ہوگئی۔ چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

''یہ...... یہ سب کیا کر رہے ہیں......؟ کیا چاہتے ہیں آپ......؟''

''ہم ممی کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔ وہ یہاں سے کیسے چرائی گئی اور کہاں پہنچائی گئی ہے......؟''

''دیکھئے آپ......'' میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

''دکھایئے نہیں...... بتایئے......! وہ ممی کہاں ہے......؟ دیکھو جسونت......! اب بھی تمہارے پاس وقت ہے اگر تم کچھ دیر مزید یونہی رد و قدح کرتے رہے تو ہم بھی تمہیں موت کے منہ میں جانے سے بچا نہیں سکیں گے کیونکہ تم نے جو کافی پی ہے اس میں زہر شامل تھا۔ جو اب تمہارے معدے میں داخل ہو چکا ہے۔ جسے تمہارے دل تک پہنچنے میں مزید صرف بیس منٹ لگیں گے اور پھر کسی قسم کی میڈیکل ٹریٹمنٹ بھی تمہیں بچا نہیں سکے گی۔ تمہاری زندگی تمہارے اپنے ہاتھ میں ہے، بے شک وقت ضائع کرتے رہو۔'' میں نے پرسکون لہجے میں کہا۔

جسونت کے چہرے پر زردی کھنڈ گئی۔ پورے وجود کا خون جیسے یکا یک خشک پڑ گیا اور آنکھیں یوں پھیل گئیں جیسے وہ اپنے ہی اندر خون میں حل ہوتا زہر دیکھنا چاہتے ہوں۔

''شکیل صاحب ..... ! یقین کریں ..... بھگوان سوگند میں نے کوئی ممی چوری نہیں کی ہے۔'' جسونت ہاتھ جوڑتے ہوئے گڑگڑایا۔

''یقین کرلیا ..... یہ بتاؤ کہ کس نے چرائی ہے اور کیوں چرائی ہے ..... ؟''

''وہ ..... وہ ..... اگر میں نے آپ کو بتا دیا تو وہ لوگ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔'' جسونت نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

''پلیز ..... پلیز شکیل صاحب ..... ! مجھ پر رحم کریں ..... میں ..... میں ابھی مرنا نہیں چاہتا ..... میرا دم گھٹ رہا ہے۔ مجھ پر رحم کریں۔''

''یعنی تم کچھ نہیں بتاؤ گے ..... ؟'' جسونت فرش پر گھٹنے ٹیک کر بیٹھ گیا۔

''اگر ..... اگر میں ان لوگوں کے خلاف زبان کھولوں گا تو وہ مجھے ہلاک کر دیں گے ..... وہ ..... وہ بہت خطرناک ہیں۔''

''تو ٹھیک ہے ..... مت کھولو زبان ..... اور مر جاؤ ..... ! زیادہ وقت نہیں، صرف پندرہ منٹ۔''

''نہیں نہیں ..... آپ کو بھگ ..... گوان ..... آپ کو اپنے خدا کا واسطہ ..... مجھے شما کر دیں ..... مجھے بچا لیں ..... چھوڑ دیں مجھے۔'' جسونت بری طرح گڑگڑانے لگا اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے جھلملانے لگے تھے۔

''دیکھو جسونت ..... ! وہ لوگ تو جب تمہیں کوئی نقصان پہنچائیں گے تب پہنچائیں گے لیکن اگر تم نے ہمیں اصل حقیقت نہ بتائی تو کچھ ہی دیر میں تم ایڑیاں رگڑ رگڑ کر اذیت ناک موت مر جاؤ گے۔ اب فیصلہ خود کرلو کہ چند دن زندہ رہ کر ان خطرناک لوگوں کے ہاتھوں مرنا چاہو گے یا ابھی یہیں مرو گے۔ یہاں سے اگر زندہ بچ گئے تو ان لوگوں سے تو ویسے بھی خود کو چھپ چھپا کر بچا سکتے ہو بہرحال ..... سوچ لو۔'' میں نے بے فکری کا مظاہرہ کیا۔

''ٹھٹ ..... ٹھیک ہے ..... میں سب کچھ بتا دوں گا۔ سب کچھ مم ..... مگر پہلے آپ میرا کوئی بندوبست کریں ورنہ میں مر جاؤں گا۔''

''وقت ضائع کر رہے ہو ..... اگر بول پڑو تو ہم تمہیں کچھ نہیں ہونے دیں

گے، یہ وعدہ رہا۔‘‘

’’ٹھیک ہے...... آپ جو پوچھنا چاہتے ہیں پوچھیں...... میں سب کچھ بتاتا ہوں۔‘‘

’’ہوں...... یہ ہوئی نا عقلمندی کی بات...... اب بتاؤ کہ وہ ممی کہاں ہے......؟‘‘

’’وہ...... وہ آج ہی...... اب سے دو گھنٹے قبل ایک طیارے کے ذریعے انڈیا کے لئے لے جائی گئی ہے۔‘‘

’’انڈیا......؟‘‘ میں چونک پڑا۔

’’کون لے کر گیا ہے اسے......؟‘‘

’’شیخ حارث طہابی کے آدمی۔ وہ بہت بڑا اسمگلر ہے۔ اس سے پہلے بھی وہ اس قسم کی وارداتوں میں ملوث رہا ہے۔ یہاں سے نوادرات اسمگل کر کے وہ انڈیا پہنچاتا ہے اور اس کے بدلے مہاراجہ رام پرشاد اسے بھاری معاوضہ دیتے ہیں۔‘‘

’’حارث طہابی کو اس ممی کے متعلق کیسے علم ہوا......؟‘‘ میں نے گہری چبھتی نظروں سے جسونت کی آنکھوں میں جھانکا۔

’’اس...... اسے میں نے بتایا تھا۔ بس میرا اتنا ہی قصور ہے۔ اس کے علاوہ میرا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں...... آپ میری بات کا یقین کریں۔‘‘

’’ہم نے یقین کر لیا...... تم یہ بتاؤ کہ تم نے اسے کیوں بتایا تھا......؟‘‘

’’وہ...... وہ میں نے مہاراجہ رام پرشاد کی وجہ سے اسے ان نوادرات کے متعلق بتایا تھا۔‘‘

’’یہ موصوف مہاراجہ کون ہیں......؟ اور تمہارا ان سے کیا تعلق ہے......؟‘‘

’’وہ ریاست رام پور کے مالک ہیں۔ بہت باوسائل اور لمبے ہاتھ ہیں ان کے۔ دولت جائیداد کا کوئی شمار نہیں۔ انہیں نوادرات جمع کرنے کا جنون کی حد تک شوق ہے۔ ان کے محل میں لاکھوں کروڑوں کے نوادرات موجود ہیں۔ ان کے عجائب خانے میں اتنے نوادرات اور ایسے نادر روزگار نمونے موجود ہیں کہ یوں سمجھ

لیں انہوں نے محل کے ایک حصے میں گویا ایک عالم عجائب بنا رکھا ہے مگر اس کے باوجود روز افزوں ان کی اس نوادرات جمع کرنے کی ہوس میں اضافہ ہوا ہے۔

اپنے اس ذوق کی تسکین کی خاطر وہ اپنے مطلب کے افراد کو اپنی عنایات سے اپنا گرویدہ بنا کر رکھتے ہیں یا پھر اسے کسی جال میں پھانس کر اس حد تک اپنا مطیع کر لیتے ہیں کہ وہ بلا چوں چراں ان کے احکام کی بجا آواری کرنے لگے۔ میرا ان سے ربط بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ اور دنیا کے ان بیشتر ممالک میں جہاں سے قدیم تہذیبوں کے آثار دریافت ہوئے ہیں ان کے لئے ایسے روابط ہیں جو بھاری معاوضے کے عوض نوادرات اسمگل کر کے ان تک پہنچاتے ہیں۔ اور وہ ان نوادرات کو اپنے عجائب خانے میں سجا دیتے ہیں۔ یہاں سے چرائے گئے نوادرات اور ممی یا وہ سونے کا مجسمہ بھی ان کے عجائب خانے میں ہی پہنچایا جائے گا۔“ بولتے بولتے جسونت کی آواز میں غنودگی اتر آئی۔ آنکھوں میں سرخی تیرنے لگی اور پلکیں بوجھل ہوگئیں۔ زہر نے اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا تھا۔

جسونت کو کافی میں دیئے گئے زہر کی یہ خاصیت تھی کہ وہ پہلے نشہ لاتا تھا، گہری نیند طاری کرتا تھا اور پھر ہلاک کرتا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی شور شرابہ ہو اسی لئے میں نے ایسے زہر کا انتخاب کیا تھا جو پہلے حواس کو منجمد کرتا تھا، اعصاب پر خمار طاری کرتا تھا اور پھر انسان کو موت کے ذائقہ سے آگاہی بخشتا تھا۔

جسونت کو زندہ چھوڑ کر میں کسی رسک کا متحمل نہیں ہونا چاہتا تھا اس لئے میں نے اس کی ہلاکت ضروری خیال کی تھی۔ جسونت گھٹنوں کے بل بیٹھا یوں جھومنے لگا تھا جیسے فلموں میں بین کے سامنے سانپ جھومتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں سرخی اتر آئی تھی اور پلکیں بوجھ سے جھکنے لگی تھیں۔

دروازے پر ہونے والی اچانک دستک نے ہم تینوں کو ہی چونکا دیا۔ ایک لمحے کے لئے مجھ پر بوکھلاہٹ طاری ہوگئی۔ کمرے میں ایک شخص موت سے ہم آغوش ہو رہا تھا جسے میں نے دھوکے سے زہر دیا تھا اور اب اس کی شہ رگ میں سانسوں کی کمزور سی ڈور اٹکی ہوئی تھی جو کسی بھی لمحے ٹوٹنے والی تھی۔

دستک ایک بار پھر ہوئی۔ پروفیسر اور عارب دونوں سوالیہ نظروں سے میری سمت دیکھنے لگے۔ اس سے پہلے میں کچھ بولتا یا کرتا دروازے پر تیسری بار دستک ہوئی اور ساتھ ہی ایک آواز سنائی دی۔

''شکیل صاحب......!'' آواز ڈاکٹر عقیل کی تھی۔

میں نے ایک گہری سانس لی اور عارب کو دروازہ کھولنے کا اشارہ کر دیا۔ اختر بھی ان کے ہمراہ تھا۔

''کیا وجہ خیریت تو......'' دروازہ کھلتے ہی ڈاکٹر عقیل عارب سے مخاطب ہوتے ہوئے اندر داخل ہوئے مگر ان کے الفاظ ان کے حلق میں ہی اٹک کر رہ گئے۔ قدم ٹھٹک کر رک گئے اور نظریں جسونت پر جم کر رہ گئیں۔

''یہ......مسٹر جسونت کو کیا ہوا ہے......؟'' ان کے ساتھ ساتھ اختر کی صورت بھی متغیر تھی۔

''اسے زہر دیا گیا ہے۔'' میں نے گھمبیر لہجے میں کہا تو وہ دونوں ہی متحیر نظروں سے میری سمت دیکھنے لگے۔

''زہر......؟ کیوں......کس وجہ سے......؟''

''اس کی وجہ سے ممی یہاں سے چوری ہوئی اور دو جانیں بھی گئیں۔ چوکیدار اور خانسامہ اسی کی وجہ سے موت کا شکار ہوئے۔ ان کی موت اس کی زندگی پر قرض تھی۔ اب وہ قرض اتر گیا۔ حساب برابر ہوا۔'' میں اپنے لہجے کی سفاکی پر خود بھی حیران ہوا۔ شاید ڈاکٹر عقیل نے بھی اس کو محسوس کیا جو وہ خاموش ہو رہے۔

جسونت منہ کے بل گر پڑا تھا۔ سانسوں کی ڈور ٹوٹ گئی تھی جسم کی قید میں پھڑپھڑانے والا پرندہ آزاد ہو چکا تھا۔

''اب کیا ارادہ ہے تمہارا......؟'' میں نے چند لمحے خاموش نظروں سے پروفیسر صاحب کی طرف دیکھا اور پھر اختر سے مخاطب ہوا۔

''اختر......! اس کو بھی ان دونوں کے قریب پہنچا دو۔ باقی حساب کتاب وہ خود اس سے کرلیں گے۔'' پھر میں نے عارب کو مخاطب کیا۔

''عارب......! تم انڈیا جانے والی پہلی فلائٹ میں ہی سیٹوں کا بندوبست کرو۔ میں اور پروفیسر تو جائیں گے ہی، تمہارا ارادہ ہو تو خود بھی تیار ہو جاؤ۔ ہمیں فوراً انڈیا روانہ ہونا ہے۔'' میں عارب کو ہدایات دے رہا تھا اور ڈاکٹر عقیل بڑی گہری اور تیکھی نظروں سے میری صورت دیکھ رہے تھے۔ پتا نہیں وہ کیا اندازہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

☆☆☆

طیارہ ہزاروں فٹ کی بلندی پر محو پرواز تھا۔ باہر آسمان کی وسعتوں میں تاریکی رچی ہوئی تھی اور طیارہ تاریکی کا سینہ چیرتے ہوئے اپنی منزل کی جانب بڑھ رہا تھا۔ تیز روشنیاں آف کر دی گئی تھیں جس کے باعث طیارے میں ملگجا سا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔

آدھے سے زیادہ مسافر سو رہے تھے اور باقی کے نیم غنودگی میں مبتلا تھے مگر میری آنکھوں سے نیند ابھی ایسے دور تھی جیسے افق پر زمین سے ہم آغوش ہوتا آسمان درحقیقت دور ہوتا ہے۔ میرے ساتھ اس وقت طیارے میں پروفیسر صاحب اور عارب کے علاوہ ڈاکٹر عقیل اور اختر بھی موجود تھے۔

روانگی سے قبل ڈاکٹر عقیل سے میری بڑی گرما گرم قسم کی بحث بھی ہوئی تھی۔ انہوں نے اپنی سرتوڑ کوشش کی تھی کہ میں کسی بھی طرح اس سفر اور ممی کی تلاش کا ارادہ ترک کر دوں۔ انہوں نے استدلال کی روشنی میں مجھے قائل کرنے کی تمام کوششیں کر ڈالی تھیں مگر ڈھائی گھنٹے کی طویل بحث کے باوجود بھی وہ میرے ارادے متزلزل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے اور آخر کار انہوں نے ہار مان لی اور اس مہم میں میرا ساتھ دینے پر بھی تیار ہو گئے۔

اس سلسلے میں انہوں نے انڈیا میں موجود ایک دوست سے بھی رابطہ کیا جو ان کی تعلیم کے اوائل دور کا دوست تھا اور ان دنوں دہلی میں ایک پرائیویٹ ڈیٹیکٹو ایجنسی کا چیف ایگزیکٹو تھا۔ ڈاکٹر عقیل اور ان کے دوست ''شلندر رائے ہریجہ'' نے ایف ایس سی تک تعلیم ساتھ ہی حاصل کی تھی۔

ڈاکٹرعقیل کو چونکہ شروع سے ہی میڈیکل میں دلچسپی تھی اس لئے ان کے راستے الگ ہوگئے تھے۔ ڈاکٹرعقیل ایم بی بی ایس کرنے کے بعد ڈاکٹر بن گئے جیسا کہ "شلندر رائے ہریجہ" نفسیات میں ماسٹر کرنے کے بعد کرمنالوجی میں ماسٹر کرنے کی تیاریوں میں لگ گیا اور ماسٹر کرنے کے بعد اس نے سراغ رسانی کا شعبہ جوائن کرلیا اور آج وہ سراغ رسانی کا اپنا پرائیویٹ ادارہ قائم کئے ہوئے تھا۔

ڈاکٹرعقیل نے کسی حد تک شلندر کو صورت حال سے آگاہ کر دیا تھا اور مجھے یقین تھا کہ شلندر نے اپنے طور پر کام بھی شروع کر دیا ہوگا۔

آنے سے قبل بیوسا کی روح، دتمیراطوس اور انا آطو (دتمیراطوس کی بیوی) نے مجھ سے الوداعی ملاقات بھی کی تھی اور مجھے ہر لحہ محتاط رہنے کی تلقین کی تھی۔ ساتھ ہی انہوں نے اپنی معذوری کا اظہار کر دیا تھا کہ وہ میری کسی بھی قسم کی مدد نہیں کرسکیں گی کیونکہ ان کا اختیار صرف سرزمین مصر کی حدود پر تھا اس سے باہر کچھ کرنے کی وہ قدرت نہیں رکھتی تھی۔ اور حقیقی بات تو یہ تھی کہ اگر میں زندہ سلامت اس وقت سفر کر رہا تھا تو میری یہ زندگی انہی کی مرہونِ منت تھی۔ وہ غائبانہ طور پر میری مدد کرتی رہی تھی مگر میں بے خبر تھا کہ کیسی شیطانی طاقتیں میری تاک میں ہیں۔

یوساف بھی میری جگہ مارا گیا تھا۔ آج سے ساڑھے چار ہزار سال قبل اس وقت کے ساحروں نے اہرام کے اندر شیطانی روحوں کو بند کر دیا تھا۔ یہ یوساف کی بدقسمتی رہی کہ اہرام کا دروازہ جب کھلا تو سامنے واحد شخص وہی تھا۔ ہزاروں سال سے مضطرب اور بے چین روحوں نے اسے دبوچ لیا اور یوساف کے ساتھ ساتھ خود بھی اس کے خون میں جل مریں۔

مجھے دتمیراطوس نے بتایا تھا کہ اگر دروازہ کھلتے وقت سینکڑوں افراد بھی دروازے کے سامنے موجود ہوتے تو سب کے سب ان بدروحوں کا شکار ہوکر مارے جاتے۔

پھر جس وقت اہرام کی راہ داری میں تابوت کھولا گیا تھا اس تابوت میں سے بھی کچھ شیطانی روحیں آزاد ہوئی تھیں مگر بروقت بیوسا، دتمیراطوس اور انا آطو آپہنچے

تھے اور ان بدروحوں سے الجھ پڑے تھے۔ ورنہ وہ بدروحیں میری زندگی کا چراغ بھی گل کر دیتیں۔ پھر بنگلے میں دو افراد مجھے قتل کرنے آئے تو وہ بیوسا کا شکار ہو گئے اور میں ایک بار پھر صاف بچ نکلا۔

بقول دتمیراطوس عدلان پاشا سے ملاقات میرا امتحان تھا۔ مریاقس کے نجات دہندہ کی تمام نشانیاں مجھ میں موجود تھیں مگر انہیں یقین نہیں تھا سو مجھے میرے کردار کو آزمانے کے لئے انہوں نے ایک مکمل بساط بچھائی تھی۔

میرے استفسار کے باوجود انہوں نے مریاقس کی داستان حیات سے پردہ نہیں ہٹایا تھا کہ وہ کس المیے سے دوچار ہے، کس مصیبت، کس عذاب میں مبتلا ہے اور میں اسے کس طرح نجات دلا سکتا ہوں......؟ میرے استفسار پر تینوں کا ایک ہی جواب تھا کہ ہمیں اس بارے میں کچھ کہنے کی اجازت نہیں۔ ہم کچھ بھی نہیں بتا سکتے اور ہمیں دی گئی مہلت بھی پوری ہوئی۔ اب ہم اس دنیا میں مزید نہیں رک سکتے۔ ہمیں بلاوا آچکا ہے اور اب ہم ہمیشہ کے لئے جا رہے ہیں۔ آگے جو بھی کرنا ہے وہ تمہاری ذمہ داری ہے اور تمہیں ہی انجام دینا ہے۔ ہم آگے پہنچ کر مریاقس کے منتظر رہیں گے۔ یقیناً تم اسے نجات دلانے میں کامیاب ہو جاؤ گے۔ کچھ دیر کی مزید گفتگو کے بعد وہ تینوں روشنیوں میں تبدیل ہوئے اور تحلیل ہوتے ہوئے میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئے تھے۔

صبح کے آٹھ بجے تھے اور ہم پانچوں دہلی ایئر پورٹ سے باہر آ رہے تھے۔

سڑک کے ایک طرف سات آٹھ ٹیکسیاں کھڑی تھیں ہمارے رکتے ہی قریبی ٹیکسی کا ڈرائیور جو ٹیکسی کے شیشوں پر کپڑا رگڑ رہا تھا لپک کر ہمارے قریب آ گیا۔

''جی صاب جی......! حکم کریں۔ ٹیکسی چاہئے......!''

''ایک نہیں دو چاہئیں......!''

''دو کیا صاحب......! دس بھی مل جائیں گی۔'' پھر وہ پلٹتے ہوئے ایک ٹیکسی کے قریب کھڑے نوجوان سے مخاطب ہوا۔

''اوے رنگو......! ادھر صاحب کے بیگ رکھو۔'' وہ جوان تیزی سے آگے

بڑھا۔ ہم نے اپنے بریف کیس ان کو تھمائے اور ٹیکسیوں کی طرف بڑھ گئے۔

''کسی اچھے سے مسلم ہوٹل چلو......!'' میں نے ڈرائیور کو مخاطب کیا اور دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا۔ پروفیسر میرے ساتھ تھے جبکہ عقیل، عارب اور اختر تینوں دوسری ٹیکسی کی طرف بڑھ گئے۔ ڈرائیور پلٹتے ہوئے اسی نوجوان سے مخاطب ہوا۔

''رنگو......! وائٹ سٹار......!'' یہ یقیناً کسی ہوٹل کا نام تھا۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا اور ٹیکسی ایک ہلکے سے ارتعاش کے بعد حرکت میں آگئی۔

''شکیل......!'' پروفیسر صاحب نے مجھے مخاطب کیا۔

''یہ عقیل اپنے جس سراغ رساں دوست کا ذکر کر رہا تھا کیا اسے ہماری آمد کے متعلق علم ہے......؟''

''ہاں...... اسے عقیل نے فون پر آگاہ کر دیا تھا۔'' پروفیسر چند لمحے خاموش رہنے کے بعد دوبارہ گویا ہوئے۔

''عقیل نے تمام صورت حال سے اسے آگاہ کر دیا ہے۔ یہ مجھے کچھ مناسب نہیں لگا۔'' پروفیسر کے لہجے میں تشویش تھی۔

''تو اس سے کیا فرق پڑے گا......؟''

''مجھے نہیں لگتا کہ یہ شخص عقیل کے ساتھ مخلص ہے اور دوسرے مجھے یہ انتہائی غیر ذمہ دار بھی لگا ہے۔ ایک بہترین دوست ایک طویل عرصے کے بعد ہزاروں میل کی دوری سے اس کے پاس آیا ہے اور وہ ایئر پورٹ پر ریسیو کرنے تک نہیں آیا۔'' پروفیسر کی پریشانی کی وجہ جان کے بے اختیار میرے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھر آئی۔

''پروفیسر صاحب......! اسے علم ہے کہ ہم انڈیا پہنچ رہے ہیں مگر کب اس بات کا اسے علم نہیں۔ کیونکہ جس وقت عقیل نے اسے فون کیا تھا اس وقت فلائٹ کنفرم نہیں تھی اور نہ ہی توقع تھی کہ اتنی جلدی ہمیں انڈیا کی کسی فلائٹ میں سیٹیں مل جائیں گی۔ لہٰذا اس بات سے اس بیچارے کے خلوص پر شک کرنا جائز بات نہیں۔''

''جو بھی ہو ان دونوں کی طویل عرصہ ہوا کوئی ملاقات نہیں ہوئی۔ کیا خبر اس دوران اس کی مصروفیات کس قسم کی رہی ہیں اور وہ کس قماش کا شخص ہے۔ ممکن ہے کہ وہ نیگٹو ذہنیت کا مالک ہو۔ وہ اپنے مفاد کے چکر میں پڑ جائے اور اس پردیس میں ہم کسی اور بڑی مصیبت میں پھنس جائیں۔''

''آپ کے اندیشے درست بھی ہو سکتے ہیں پروفیسر......! اور محض قیاس آرائیاں اور مفروضات بھی ثابت ہو سکتے ہیں۔ فی الحال کچھ بھی وثوق کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ ہمیں پوری طرح محتاط رہنا ہوگا تاکہ کوئی بھی ناگہانی صورت حال پیش آئے تو ہم ذہنی طور پر اس سے نمٹنے کے لئے تیار ہوں۔'' اس کے بعد پروفیسر خاموش رہے۔ تقریباً بیس منٹ بعد ہم ایک اعلیٰ درجے کے ہوٹل تک پہنچ گئے۔ رہنے کے لئے دو کمرے مناسب خیال کئے گئے۔ کچھ دیر بعد ہم تیسری منزل پر دو برابر برابر کمروں میں تھے۔ فیصلہ یہ ہوا تھا کہ پہلے فریش ہوا جائے اس کے بعد ناشتہ کمرے میں منگوا لیا جائے اور اسی دوران ڈاکٹر عقیل، شلندر رائے کو فون پر یہاں اپنی موجودگی کے متعلق آگاہ کر دیں گے۔

میں اور پروفیسر ایک کمرے میں آ گئے جبکہ ڈاکٹر عقیل، عارب اور اختر دوسرے کمرے میں چلے گئے۔

پروفیسر صاحب شاور لے کر نکلے تو میں باتھ روم میں گھس گیا۔ ٹھنڈا پانی اعصاب کو بڑی طمانیت بخش رہا تھا۔ میں کافی دیر تک نہاتا رہا۔ آخر دروازے پر دستک ہوئی اور ساتھ ہی اختر کی آواز سنائی دی تو میں باہر نکلا۔

''بس کریں شکیل صاحب......! کوئی چار قطرے نل میں بھی چھوڑ دیں۔''

میں باہر نکلا تو سبھی وہاں موجود تھے اور ناشتے کی ٹرالی بھی۔

''کیا آج پانی میں گھل کر باتھ روم میں کیچڑ کرنے کا ارادہ کئے ہوئے تھے......؟ کب سے انتظار کر رہے ہیں۔''

''انتظار کی عادت بھی ہونی چاہئے انسان کو ورنہ زندگی کے کچھ مخصوص حصوں میں بڑی اذیت کا سامنا کرنا پڑا ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور ڈاکٹر عقیل

کے برابر بیٹھ گیا۔

''چلیں شروع کریں۔'' میں نے ایک توس اٹھاتے ہوئے کہا۔

ناشتے کے دوران ہی ڈاکٹر عقیل نے بتایا کہ میں نے شلندر کو فون کیا تھا مگر وہ آفس میں موجود نہیں تھا۔ لہٰذا میں نے اس کے لئے پیغام ریکارڈ کرا دیا ہے۔

ناشتے کے ساتھ ساتھ ہم آپس میں اپنے آئندہ اقدام کے متعلق بھی ڈسکس کرتے رہے کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔

اس گفتگو کے دوران ہی میں ایک عجیب سی بے چینی محسوس کرنے لگا۔ اعصاب میں ہلکی ہلکی سنسنی سی ہلکورے لینے لگی تھی۔ لاشعور کی اتھاہ گہرائیوں میں کہیں الارم سا بج رہا تھا جس کی آواز شعور کی دنیا میں آتے آتے اتنی مبہم ہو جاتی تھی کہ کوئی تمیز کرنا ناممکن تھا۔ میری چھٹی حس ہلکے ہلکے کسمسا رہی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ صرف میں ہی نہیں میرے ساتھی بھی ایسی ہی کیفیت کا شکار ہیں۔ دفعتہً لاشعور کی گہرائیوں میں گونجنے والا الارم پوری شدت سے چیخ اٹھا، ذہن پر یکایک گاڑھی دھند نے یلغار کر دی۔ میرے ساتھیوں کے چہرے بھی زرد پڑ رہے تھے اور آنکھوں میں ایک بوجھل پن اتر آیا تھا۔

عارب ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''ڈاکٹر صاحب......! ہمارے ساتھ کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔'' اس کا لہجہ گہرا خمار لئے ہوئے تھا۔ میں اپنی جگہ سے اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا مگر قدم ڈگمگا گئے۔ پورے وجود میں جیسے کسی نے پارہ بھر دیا تھا۔ مجھے اتنا احساس ہوا کہ میں گر رہا ہوں اس کے بعد کھوپڑی میں جیسے اندھیرے گھس گئے۔ آنکھوں میں دھند اتر آئی اور میں بے حسی کے کسی گہری کنویں میں اتر گیا۔ یہ تو علم نہیں کہ بے حسی اور لاعلمی کا یہ دورانیہ کتنا طویل تھا ہاں جب ہوش آیا تو میں نے اختر کو اپنے اوپر جھکے ہوئے پایا وہ مجھے ہوش دلانے کی کوشش کر رہا تھا۔

''ڈاکٹر صاحب......! آر یو آل رائٹ......؟'' میری خالی الذہن کی کیفیت فوراً اڑن چھو ہو گئی۔ میں فرش پر چاروں شانے چت پڑا تھا۔ اختر گھٹنوں کے بل

میرے قریب بیٹھا تھا۔

''آئی ایم آل رائٹ......!'' میں فوراً اٹھ بیٹھا۔ ڈاکٹر عقیل عارب اور پروفیسر بھی قریب ہی بے سدھ پڑے تھے۔

''ڈاکٹر صاحب......! ہمارے ساتھ ہاتھ ہوگیا ہے۔ یقیناً کھانے میں کچھ ملایا گیا تھا۔''

''یہ لوگ میری توقع سے کہیں زیادہ تیز نکلے ہیں۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔

''مجھے تو لگتا ہے کہ ہم شروع سے ان کی نظروں میں ہیں یا پھر جب ہم مصر سے روانہ ہوئے اس وقت ہماری مخبری ہوئی ہے۔''

''ہوں...... بڑے فعال اور باوسائل لوگ لگتے ہیں۔ ادھر ہم یہاں پہنچے اور ادھر انہوں نے ہمیں اپنے جال میں جکڑ لیا۔''

''ڈاکٹر صاحب......! شاید یہ ہماری توقع سے بڑا نیٹ ورک ہے۔''

''کوئی بات نہیں...... دیکھا جائے گا......تم ان کو دیکھو۔'' میں نے بے ہوش پڑے ساتھیوں کی طرف اشارہ کیا تو اختر ان کی طرف متوجہ ہوگیا اور میں اس قید خانے کا جائزہ لیتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

اچھا خاصا وسیع اور کشادہ کمرہ تھا۔ دیواریں تو بالکل درست حالت میں تھیں البتہ فرش کا سیمنٹ جگہ جگہ سے ٹوٹا ہوا تھا۔ کہیں چھوٹے چھوٹے گڑھے تھے تو کہیں ہلکی ہلکی دراڑیں۔ چھت اس قدر بلند تھی کہ یوں احساس ہوتا تھا کہ کسی کمرے میں نہیں بلکہ گہرے کنوئیں میں کھڑے ہیں۔ چھت کے ساتھ ایک صدیوں پرانا پنکھا سا جھول رہا تھا اور پنکھے کے دائیں جانب بلب روشن تھا مگر اونچائی اتنی زیادہ تھی کہ نیچے پہنچتے پہنچتے اس کی روشنی خاصی بیمار اور مدقوق ہوگئی تھی۔ فضا عجیب سیلن زدہ اور بدبودار تھی۔

بائیں طرف کونے میں ایک بڑا سا فولادی دروازہ نظر آ رہا تھا۔ اس دروازے کے علاوہ کوئی کھڑکی کوئی روزن نہ تھا۔ میں آگے بڑھ کر دروازے کا جائزہ

لینے لگا۔ وہ بہت مضبوط تھا اور یقینی بات تھی کہ باہر سے لاک بھی۔ کچھ دیر کی زور آزمائی اور مغز ماری کے بعد میں پیچھے ہٹ آیا۔ ڈاکٹر عقیل اور عارب تو پوری طرح حواسوں میں دکھائی دے رہے تھے البتہ پروفیسر کچھ مضمحل نظر آ رہے تھے۔ سب کے کپڑوں کی حالت بتا رہی تھی کہ ہمیں کس عزت و احترام سے لا کر یہاں لٹایا گیا ہوگا۔

''پروفیسر......! آپ ٹھیک تو ہیں......؟'' میں آگے بڑھ کر پروفیسر کے قریب بیٹھ گیا۔

''ہاں......ٹھیک ہی ہوں۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں......بس ذرا سر وزنی ہو رہا ہے۔''

''ہوں...... اور تم لوگ......؟'' میں نے ڈاکٹر عقیل اور عارب کی طرف دیکھا۔

''فی الحال تو ٹھیک ہی ہیں مگر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کب تک ٹھیک رہیں گے کیونکہ صورت حال بتا رہی ہے کہ باعزت ڈاکٹروں کی مٹی پلید ہونے والی ہے۔'' عارب نے مسکرانے کی کوشش کی۔

''کوئی بات نہیں...... جو ہونا ہے وہ تو ہو کر رہے گا۔''

''ظاہر ہے......اگر اوکھلی میں سر دیا ہے تو اب موسلوں سے کیا ڈرنا......؟ سر پر پڑی ہے تو بھگتنا پڑے گی۔''

''کم بختوں نے ڈالا بھی ایسی جگہ پر ہے کہ جہاں سے نکلنے کی کوئی آس امید نہیں ہے۔کوئی روزن تک نہیں رکھا۔'' اختر نے چاروں طرف سے جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

''تو تمہارا خیال کیا ہے کہ ہمیں کاغذ کے پنجرے میں رکھتے کہ لو بچہ...... جب جی چاہے بھاگ جانا۔''

''نہیں کاغذ کے پنجرے کا تو نہیں کہہ رہا لیکن کم از کم قیدیوں کے لئے کوئی نہ کوئی سہولت تو ہونی چاہئے نا......اپنے بچاؤ کے لئے۔''

''ٹھیک کہہ رہے ہو کوئی آتا ہے تو اسے اس قیمتی مشورے سے ضرور آگاہ کرنا۔''

''چھک لو......! چھک لو......! کچھ وقت ہے تمہارے پاس بعد میں شاید حسرت ہی رہ جائے ان خوش گفتاریوں کی۔'' ڈاکٹر عقیل بھنائے ہوئے انداز میں گویا ہوئے۔

''تو آپ کا کیا خیال ہے کہ ہم قبل از وقت واویلا کرنے لگیں۔ اس سے بھلا کیا حاصل ہوگا......؟ ڈاکٹر عارب ڈاکٹر عقیل کی طرف پلٹ پڑا۔ عجیب آدمی تھا کسی مسئلے، کسی بات کو بھی خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ شاید ان میں تلخی ہو جاتی مگر درمیان میں پروفیسر بول پڑے۔

''دوستو......! یہ وقت آپس میں الجھنے کا نہیں...... ہم بہت کمزور پوزیشن میں ہیں، صورت حال کی سنگینی کو سمجھنے کی کوشش کرو۔''

''پروفیسر......! میں بھی تو انہیں یہی احساس دلانا چاہتا ہوں لیکن یہ یوں خرمستیاں کر رہے ہیں جیسے کسی دعوت میں آئے ہوئے ہیں۔'' ڈاکٹر عقیل نے کہا۔

''بس ٹھیک ہے...... ختم کرو اس تلخی کو اور اس افتاد سے گلو خلاصی کے متعلق سوچو کہ یہ سب کیا ہے اور اب کیا کرنا ہے......؟'' کچھ دیر کے لئے سبھی کو چپ لگ گئی۔

''ایک بات تو طے ہے کہ ہم یہاں کسی غلط فہمی کے نتیجے میں نہیں پہنچے بلکہ ہمارے دشمنوں نے اچھی طرح سوچ سمجھ کر اور باقاعدہ منصوبہ بندی کرنے کے بعد ہمیں اس قید خانے میں پہنچایا ہے۔ اب یہ معلوم نہیں ہمارے ساتھ ان کا رویہ کیا ہوگا......؟ ہم پہلے قدم پر ہی ان کے جال میں پھنس گئے ہیں اور اب پوری طرح ان کے رحم و کرم پر ہیں۔'' میں نے سنجیدہ انداز میں کہا۔

''کون لوگ ہو سکتے ہیں یہ......؟'' ڈاکٹر عقیل نے فکرمندی سے کہا۔

''ظاہری سی بات ہے کہ کرائے کے غنڈے، مہاراجہ رام پرشاد، کے پالتو کتے۔ یا کوئی ایسا جرائم پیشہ گروہ جس کی پشت پناہی پر مہاراجہ رام پرشاد کا ہاتھ ہوگا۔''

''پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ مہاراجہ ہمیں زندہ رکھنا چاہتا ہے ورنہ ہماری زندگی کب کی ختم ہو چکی ہوتیں۔'' اختر نے کہا۔

''اور یہ بھی ممکن ہے کہ مہاراجہ ہمیں اپنے سامنے یا اپنے ہاتھوں سے ہلاک کرنا چاہتا ہو اور اس کے انتظار میں ہمیں زندہ رکھا گیا ہو۔'' ڈاکٹر عقیل نے رائے دی۔

''تو ہم نے کیا چوڑیاں پہن رکھی ہیں......؟ ہماری زندگیاں کیا اتنی سستی ہیں...... ان کے باپ کی کھیتی ہے جو اُجاڑ دیں گے......؟'' عارب کے نتھنے پھول گئے۔

''ذہن ٹھنڈے رکھنا ہوں گے۔'' پروفیسر بول پڑے۔

''جوش کی نہیں ہوش کی ضرورت ہے۔ دشمن ہمارے لئے اتنا تر نوالہ ثابت نہیں ہوں گے۔ یہیں سے اندازہ لگا لو کہ انہوں نے ہمارے ہاتھ پاؤں باندھنا بھی ضروری نہیں سمجھا یعنی وہ اتنے پرُاعتماد اور مطمئن ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم ان کے گھر میں موجود ہیں اور وہ یہاں کے مالک و مختار ہیں۔ ہماری ذرا سی حماقت ہمارے عرصہ حیات کو نگل سکتی ہے اس لئے غصے یا جذبات میں آنے کی ضرورت نہیں۔ دشمن افرادی طاقت میں بھی ہم سے مستحکم ہیں اور وسائل میں بھی۔''

پروفیسر کی بات مکمل ہوئی ہی تھی کہ فولادی دروازے پر آہٹ پیدا ہوئی تو ہم سب چونک پڑے۔ عارب ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ اس کی آنکھوں میں عقاب کی سی چمک پیدا ہوگئی۔ اگلے لمحے دروازہ ایک زور کی آواز سے کھلا اور عارب جو آگے بڑھنے کا ارادہ رکھتا تھا اپنی جگہ کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔

کھلے ہوئے دروازے سے یکے بعد دیگرے چار مسلح جوان اندر داخل ہوگئے۔ ان کے ہاتھوں میں جدید رائفلیں تھیں۔ دو تو وہیں دروازے کے دائیں بائیں کھڑے ہوگئے جبکہ دو آگے بڑھ آئے۔ ان کی رائفلوں کا رخ ہماری جانب ہی تھا اور ان کے تیور بتا رہے تھے کہ اگر ہم نے ایک سانس بھی ان کی مرضی کے خلاف لی تو وہ بلا جھجک فائر کھول دیں گے۔

''کھڑے ہو جاؤ......!'' آگے آنے والے دو میں سے ایک نے کرخت لہجے میں ہمیں مخاطب کیا اور ہم بلا چوں چراں اٹھ کھڑے ہو گئے۔

''پیچھے دیوار کے ساتھ گھٹنے ٹیک کر بیٹھ جاؤ۔''

''بھائی صاحب......! ہمارا قصور کیا ہے......؟ ہمیں کس لئے یہاں قید کر لیا گیا ہے......؟'' اختر نے معصوم لہجے میں سوال کیا۔

''بکواس نہیں کرو...... جو کہا ہے وہ کرو ورنہ ماتھے پر روشن دان کھل جائے گا۔'' ہم نے خاموشی سے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ ظاہر ہے کہ اس کے علاوہ اور کوئی راستہ بھی نہیں تھا۔ ہم پانچوں عقبی دیوار کے ساتھ ایک قطار کی صورت گھٹنوں کے بل بیٹھ گئے اور وہ بھیڑیا ایک طرف ہو کر مستعد انداز میں کھڑا ہو گیا۔ ہم خاموشی سے ایک دوسرے کی شکلیں تک رہے تھے۔ سمجھ سے باہر تھا کہ وہ کرنا کیا چاہتے ہیں۔

کچھ ہی دیر گزری تھی کہ ہماری آنکھیں خیرہ ہو کر رہ گئیں۔ ایک شعلہ جوالہ دروازے سے اندر داخل ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ایک اور ادھیڑ عمر آدمی بھی تھا جو شکل وصورت اور پہناوے کے لحاظ سے کوئی اچھا خاصا رئیس معلوم ہوتا تھا۔ مگر میں نے محسوس کیا کہ میرے ساتھ ساتھ میرے ساتھیوں کی نظریں بھی فقط اس قتالہ عالم کا طواف کر رہی تھیں۔ اس نے بلیک لیدر کی چست پتلون پہنی ہوئی تھی اور لیدر کی ہی جیکٹ۔ پاؤں میں چرمی شوز، کھلے بال اس کے چوڑے کندھوں کی اوٹ سے جھانک رہے تھے۔ بڑی بڑی آنکھوں میں سیماب کی سی چمک، عنابی ہونٹ اور بالوں کی آغوش سے جھانکتا ہوا روشن چہرہ دیکھ کر سیاہ بادلوں کے حصار میں مقید چاند کا تصور ذہن کو گدگداتا تھا۔ چال میں ایک وقار، ایک کافرانہ تمکنت، ایک ایک عضو ایسا ڈھلا...... ایسا ترشا ہوا تھا کہ دل پر ہزارہا بجلیاں گر گئیں۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ اس زمین کی مخلوق ہی نہ ہو بلکہ...... آسمانی بجلی کو انسانی قالب میں ڈھال دیا گیا ہو۔

میں ڈاکٹر ہوں مگر ان لمحوں میرا دل شاعری کرنے کو چاہ رہا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنی نظروں کو اس مقناطیسی وجود سے ہٹایا۔ ان کے اندر داخل ہوتے ہی ہم پر تنی ہوئی رائفلوں کی نالیں جھک گئیں۔ اور مسلح افراد اور بھی زیادہ مستعد نظر

آنے لگے کہ جیسے ابھی پلک جھپکنے کی دیر میں نہ صرف ہمیں نشانے پر لے لیں گے بلکہ فائر بھی کھول دیں گے۔

وہ دونوں ہمارے سامنے آ کھڑے ہوئے۔ مجھے بخوبی اندازہ ہو رہا تھا کہ میرے ساتھیوں کی نظریں بھی اس حسن کے ''بھانبھڑ'' کی تاب نہ لاتے ہوئے جھک گئی ہیں۔ البتہ اختر کی گردن تنی ہوئی تھی اور یقیناً اس کی نظریں اس شعلہ جوالہ کے سلگتے ہوئے چہرے پر تھیں۔ اور ہمارے یا اس کے حق میں یہ کوئی اچھی علامت نہ تھی۔

''خاموش فضا میں قدموں کی چاپ بلند ہوئی پھر ایک آہٹ پیدا ہوئی اور وہ نووارد اور وہ برق آسمان پیچھے ہٹ گئی۔

''مسٹر شکیل ظفر......!'' ایک گنگناتی ہوئی آواز میری سماعت سے ٹکرائی تو میں نے سر اٹھایا۔ غالباً ایک گارڈ کرسیاں اٹھا کر لایا تھا کیونکہ جب میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو چند قدم کے فاصلے سے وہ دونوں برابر برابر کرسیوں پر براجمان تھے۔

''ڈاکٹر صاحب......! کیسے مزاج ہیں آپ کے......؟ کوئی تکلیف تو نہیں پہنچی......؟'' وہ حسینہ آرزو خیز مجھ سے مخاطب تھی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ رقصاں تھی۔

''کیا میں جان سکتا ہوں کہ آپ لوگ کون ہیں اور ہمیں یہاں کیوں لایا گیا ہے......؟'' میرا لہجہ پوری طرح پُراعتماد تھا۔ میرے سوال پر اس کی مسکراہٹ کچھ مزید گہری ہوگئی اور جلتے ہوئے گالوں میں خفیف سے بھنور نمودار ہوگئے۔

''کیوں نہیں......! یہ تو آپ کا حق بنتا ہے۔ آپ کا تعارف نامہ تک ہم تو پہلے ہی پہنچ چکا ہے ہاں البتہ اپنا تعارف ہم کرائے دیتے ہیں۔'' اس نے اپنے برابر بیٹھے اس خوش پوش شخص کی جانب اشارہ کیا۔

''انہیں ''ویر چندر'' کہتے ہیں۔ یہ مہاراجہ رام پرشاد کے دست راست ہیں اور ریاست رام پور کے اندرونی امور کے انچارج ہیں اور مجھے آپ ''سمترا'' دیوی کہہ سکتے ہیں۔ میرا ریاست رام پور یا مہاراج کے نزدیک کیا مقام ہے اس کو آپ

رہنے ہی دیں۔ باقی رہی بات آپ کی یہاں موجودگی کی بات تو اس کو آپ سے بہتر تو کوئی نہیں سمجھ سکتا۔'' کم بخت کا لہجہ اور بولنے کا سٹائل بڑا قیامت خیز تھا۔

''میرا خیال ہے کہ میں نہیں سمجھ سکا۔ اگر آپ بتانے، سمجھانے کی زحمت گوارہ کرلیں تو آپ کا احسان ہوگا۔''

''بہت خوب.....! ہمیں خوشی ہوئی کہ آپ کو گفتگو کے انداز اور آداب سے آگہی ہے۔''

''جی شکریہ.....!''

''دیکھیں ڈاکٹر صاحب.....! سیدھی سی بات ہے کہ اگر تابوت یا ممی آپ کے ہاتھ سے نکل گئی تھی تو آپ کو اس قصے پر لعنت بھیج دینا چاہئے تھی نا کہ یہ آپ سوچے سمجھے بغیر احمقوں کی طرح اس کی بازیابی کی نیت سے یہاں تک آ پہنچے۔ یہ بھی نہیں سوچا کہ نتیجہ کیا نکلے گا اور نہ ہی آپ نے یہ سوچا کہ مہاراجہ رام پرشاد کتنے ذرائع اور وسائل کے مالک ہیں اور تو اور آپ نے شیخ حارث کے آدمیوں کا بھی گھونٹ بھرلیا۔

بس یہیں سے ہم آپ کی طرف سے محتاط ہوگئے کہ اگر آپ کا بندوبست نہ کیا گیا تو آپ خطرناک ثابت ہو سکتے ہو۔ کیونکہ ہزارہا کوششوں اور وسائل کے باوجود ان دو آدمیوں کا سراغ نہیں پایا جا سکا، البتہ لان کی کھدائی کے دوران آپ کے چوکیدار اور خانسامے کی لاشیں ضرور برآمد ہوئی تھیں۔''

اتنا کہنے کے بعد وہ خاموش ہوگئی۔ ایک شریری مسکراہٹ بدستور اس کے ہونٹوں پر رقصاں تھی اور چمکدار آنکھیں ہماری جانب ہی نگراں۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد میں نے کہا۔

''یہ سب تو اپنی جگہ درست رہا آپ یہ بتائیں کہ اب ہمیں یہاں رکھنے سے آپ کا مقصد کیا ہے.....؟''

''تو آپ کا کیا خیال ہے کہ پوری آزادی دے دی جائے کہ مہاراج کے لئے سردردی پیدا کریں.....؟ مہاراج کا تو ارادہ تھا کہ آپ کو ائیر پورٹ پر ہی اڑا

دیا جائے۔ آپ کی قسمت کچھ اچھی تھی کہ بروقت مصر سے شیخ حارث کا پیغام پہنچ گیا کہ ان کے دو آدمیوں کو آپ کی تحویل سے بازیاب کرایا جائے۔ اسی بہانے آپ کی کچھ سانسیں بڑھ گئی ہیں ورنہ اب تک تو آپ سب سورگ باش ہو چکے ہوتے۔''

''کون سے دو آدمیوں کی بات کر رہی ہیں آپ......؟''

''انہی کی جو رات کے وقت آپ کے قتل کے ارادے سے آپ کے بنگلے میں گھسے تھے مگر اس کے بعد سے اب تک ان کی کوئی خیر خبر نہیں۔''

''اور اگر میں کہوں کہ مجھے اس بارے میں کچھ معلوم نہیں تو......؟''

''تو......آپ اپنے ساتھ ساتھ اپنے ساتھیوں پر بھی ظلم کریں گے۔ آپ کی موت بڑی اذیت ناک ہو جائے گی اور آپ کے ساتھ آپ کے ان دوستوں......'' بولتے بولتے اس نے میرے ساتھیوں کی طرف اشارہ کیا تو یکایک اس کو چپ لگ گئی اور اس کی نظریں اختر پر جم کر رہ گئیں۔

لمحہ بھر میں اس کے تاثرات متغیر ہوئے۔ پہلے ایک ذرا حیرت پھر ناگواری۔ بے ساختہ میں نے بھی گردن گھما کر اختر کی طرف دیکھا۔ وہ یک ٹک کسی پتھر کے بت کی طرح سمترا کو تک رہا تھا۔ گویا اسے اپنے اردگرد اور صورت حال کا کچھ احساس ہی نہ تھا۔

''اے مسٹر......! کیا گھور رہے ہو......؟'' سمترا نے خشک لہجے میں اختر کو مخاطب کیا۔ مگر اس نے جیسے سنا ہی نہ تھا۔

''اے......! میں تم سے مخاطب ہوں......!'' سمترا کی پیشانی پر شکنیں ابھر آئیں۔

''ہم تو پہلے ہی جھٹکے میں مردار ہو گئے ہیں دیوی جی......! اب آپ کون سی اذیت ناک موت کی بات کر رہی ہیں......؟'' اختر یوں بولا جیسے نیند کے عالم میں بول رہا ہو۔

''بکواس بند کرو اور نظریں جھکا کر بیٹھو......!''

''دیوی جی......! مجھے آج اور ابھی تو علم ہوا ہے کہ آنکھیں کتنی بڑی نعمت

ہوتی ہیں۔ اب میں ان کو جھکا کر اور خدا کی قدرت سے منہ موڑ کر ناشکرا کیسے ہو سکتا ہوں......؟ میں اس گناہ کا مرتکب نہیں ہو سکتا۔'' چند ثانیے کے لئے تو سمترا کو چپ سی لگ گئی۔ بس گہری نظروں سے اختر کو گھورتی رہی۔ اختر کے ہونٹوں پر ایک شریر مسکراہٹ اتر آئی تھی پھر آہستہ آہستہ سمترا کے چہرے کا تناؤ ختم ہو گیا۔

''لگتا ہے کہ زندگی سے عاجز آ چکے ہو......؟'' نہ جانے سمترا کے لہجے میں ایسا کیا تھا کہ میں جھرجھری سی لے کر رہ گیا۔

''آپ کے ان نازک ہاتھوں سے مرنا چاہوں گا۔''

''تمہاری ہر خواہش پوری کر دیں گے لیکن ایک شرط ہے۔''

''آپ کا حکم سر مژگاں......!''

''ہمیں بتا دو کہ شیخ حارث کے دو آدمی کہاں ہیں......؟''

''کیا پوچھتے ہو ہم سے، ہم خود کو بھلائے بیٹھے ہیں۔ ہمیں تو اپنی خبر نہیں کہ ہم کہاں ہیں کسی اور کے متعلق آپ کو کیا بتائیں گے......؟''

''اچھی طرح سوچ سمجھ لو......!''

''ہماری سوچ دانی منجمد ہو چکی ہے۔''

اس گفتگو کے دوران ویر چند پہلی دفعہ بولا۔

''سمترا......! وقت ضائع نہیں کرو ہمیں جو حکم ہوا ہے وہ پورا کرو اور واپسی کا سوچو۔''

پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔

''مسٹر شکیل......! ہم آپ سے نہ کوئی فضول بات کرنا چاہتے ہیں اور نہ آپ سے ان دو آدمیوں کے متعلق سچ اگلوانے کے لئے آپ لوگوں پر تشدد کر کے وقت ضائع کرنے کے حق میں ہوں گے۔ یہاں سے زندہ اور صحیح سلامت صرف آپ اپنے ملک واپس جا سکتے ہیں۔ آپ کے دوست زندہ تو جا سکتے ہیں مگر صحیح سلامت نہیں یعنی...... ٹانگوں سے محروم ہو کر...... اور ایسا بھی اس صورت میں ممکن ہو گا کہ جب آپ ہم سے تعاون کریں گے اور آئندہ کے لئے بھی ہمارے ساتھ ایگریمنٹ

کر لیں گے بصورت دیگر مہاراج کے حکم کے مطابق آپ کے چار ساتھی ہیں ہم چار دفعہ آپ سے ان دو آدمیوں کے متعلق سوال کریں گے اور ہر انکار یا لاعلمی کے اظہار پر آپ کا ایک ساتھی موت کا شکار ہوگا اور ان کی موت کے بعد ہم آپ کو مہاراج کے سامنے پیش کر دیں گے اور وہاں پر آپ کی سانسیں اجیرن کر دی جائیں گی...... یقیناً میری بات آپ کی سمجھ میں آگئی ہوگی۔ اب فیصلہ آپ کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ اور ایک بار پھر کہہ رہا ہوں کہ ہم نہ تو فضول بات کریں گے اور نہ تشدد وغیرہ میں وقت ضائع کریں گے...... ایک سوال...... اور...... ایک زندگی...... اب بتائیں آپ کا کیا ارادہ ہے......؟'' ساتھ ہی اس نے ایک گن مین کو اشارہ کیا۔ وہ سمترا کے برابر آ کھڑا ہوا۔ باقی کے تینوں بھی اپنی اپنی جگہ چوکس ہو گئے۔

لاشعوری طور پر اعصاب دباؤ کا شکار ہو گئے۔ ویر چند کا لہجہ بتا رہا تھا کہ اس نے جو کہا ہے وہ وہی کرے گا۔ اور مجھے یقین تھا کہ ان دو آدمیوں کی گمشدگی کی حقیقت بتاؤں گا تو کوئی بھی یقین نہیں کرے گا۔ یہ بھی حقیقت تھی کہ مجھے خود کچھ علم نہ تھا کہ وہ دونوں یا ان کی لاشیں کدھر گئیں۔ اس بارے میں تو صرف بیوسا ہی بتا سکتی تھی۔ بڑی نازک پوزیشن تھی موت سامنے تھی صرف ایک اشارے کی دیر تھی۔

''مسٹر شکیل......! ہمارا وقت بہت قیمتی ہے اور آپ ہمارا وقت ضائع کر رہے ہیں۔ ہمیں جواب چاہئے۔'' ویر چند کا لہجہ سرد ہو گیا۔

''آپ میرے کہے پر یقین کریں گے......؟'' میں نے تذبذب انداز میں پوچھا۔

''ہم آپ سے کوئی کہانی نہیں سننا چاہتے صرف ان دو آدمیوں کے بارے میں بتائیں۔''

''دیکھیں ویر چندر صاحب......!'' گن مین نے بلٹ چڑھائی میری بات درمیان میں ہی رہ گئی۔

''مسٹر شکیل......! آپ اچھے خاصے عقل مند اور ذی ہوش انسان دکھائی دیتے ہیں...... دکھائیں نہیں صرف بتائیں...... شیخ حارث کے دو آدمی کہاں

ہیں......؟'' گن مین نے رائفل اختر کی طرف کر دی۔
''آپ...... آپ رائفل کا رخ ہٹوائیں میں بتاتا ہوں...... مجھے نشانے پر رکھ لیں۔''
میں حقیقت میں قدرے بوکھلاہٹ کا شکار ہوگیا۔ ویر چندر میری بات کو نظرانداز کرتے ہوئے گن مین سے مخاطب ہوا۔
''اگر دس سیکنڈ کے اندر مسٹر شکیل اصل نکتے پر نہ بولے تو فائر کھول دینا۔''
گن مین کی آنکھوں میں درندگی کی چمک ابھر آئی اور ویر چندر کے ہونٹوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ رقصاں ہوگئی۔ فرط ہیجان کے باعث میں کچھ بول ہی نہ پایا تھا کہ اختر کی آواز ابھری۔
''دیوی جی......! یہ ستم نہیں کریں۔ اگر مجھے ہلاک کرنا ہی ہے تو اپنے مقدس ہاتھوں سے کریں...... میں آپ کے ہاتھوں جام شہادت نوش کرنا چاہتا ہوں۔''
سمترا کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھر آئی۔ وہ کرسی سے اٹھ کر کھڑی ہوئی اور گن مین کے ہاتھ سے رائفل اس نے لے لی۔
''چلو آخری خواہش سمجھ کر تمہاری یہ خواہش پوری کیے دیتی ہوں۔'' اس نے اختر کا نشانہ لیا اور پھر سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا اور ظالم کی بچی نے میرے بولنے کا انتظار کیے بغیر فائر کھول دیا۔ سماعت سے دھماکے کی آواز ٹکرائی اور اندر کی دنیا میں جیسے سکوت پھیل گیا۔
بس جو ہوا لحظہ بھر میں ہو گزرا۔ اس کا رخ مخالف سمت تھا اور دروازے کے دائیں بائیں کھڑے دونوں مسلح افراد کی پیشانیوں سے خون کا فوارہ سا ابل پڑا۔ سمترا کا رخ عقبی سمت کیسے اور کب ہوا اور دروازے پر تعینات افراد کی پیشانیوں سے خون کیسے ابل پڑا، کچھ سمجھ ہی نہ آسکا تھا۔ یقیناً اس سب کے دوران میری پلک جھپک گئی ہوگی۔ بجلی ایک بار پھر چمکی۔ وہ دونوں ابھی عقبی دیوار سے ٹکرا کر نیچے گر رہے تھے کہ سمترا دائیں پاؤں کی ایڑی پر گھومی اور بغلی دیوار کے ساتھ ہکا بکا کھڑا گن مین بھی پیشانی میں رزون لیے فرش پر آرہا۔

ہماری تو خیر کیا خود ان لوگوں کی اپنی عقل میں نہ آسکا کہ یہ سب کیا ہوا ہے......؟ہم سب اپنی جگہ مبہوت تھے اور زندہ بچنے والے دونوں اپنی جگہ سکتے کی کیفیت کا شکار تھے۔ میرا تو خیال تھا کہ اختر اپنے ہی خون میں نہایا ہوگا مگر یہاں یکا یک بساط ہی پلٹ گئی تھی۔ پھراس سے قبل کی سمترا ان دونوں میں سے کسی کو نشانہ بناتی ویر چندر نے اٹھتے ہوئے رائفل کی نال پر ہاتھ ڈال دیا۔ٹھیک اس لمحے عقب میں موجود شخص نے سمترا کے گلے میں بازو ڈال کر اسے دبوچ لیا۔سمترا نے دائیں ہاتھ سے اپنی گردن کے گرد کسے بازو کو پکڑا اور ساتھ ہی ایک ٹھوکر ویر چندر کے زیریں ناف جما دی۔ اس کے منہ سے ذبح ہوتے ہوئے بکرے کی سی آواز نکلی او وہ منہ کے بل جھکتا چلا گیا۔سمترا نے ایک ذرا خود کو سامنے کی جانب جھکایا، اس کے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں اس شخص کے جبڑوں کے نیچے پیوست ہوتی محسوس ہوئیں دوسرے ہی لمحے وہ شخص سمترا کے اوپر سے ہوتا ہوا سامنے کی دیوار کے ساتھ ٹکرایا اور سر کے بل سنگی فرش پر آ گیا۔ ایک ”چٹخ“ کی آواز بلند ہوئی غالباً اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔

سمترا کو نرغے میں آتا دیکھ کر عارب بڑی برق رفتاری سے آگے بڑھا تھا مگر پل جھپکنے کی دیر میں سمترا نرغے سے بھی نکل گئی بلکہ میدان بھی صاف ہوا پڑا تھا۔

عارب ٹھٹک کر رک گیا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سمترا کو دیکھ رہا تھا۔ شاید اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ سب اس نازک اندام لڑکی ہی کی کارستانی ہے۔

تین لاشیں خون میں لت پت پڑی تھیں، چوتھے کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا جبکہ ویر چندر سمترا کے قدموں میں گٹھڑی کی صورت میں پڑ کراہ رہا تھا اور سمترا اپنی جگہ کھڑی تھی۔ نہ جانے کیوں اس کے چہرے پر تشویش او، پریشانی کے تاثرات امنڈ آئے تھے۔

میری طرح ڈاکٹر عقیل، اختر اور پروفیسر بھی بے یقینی کے سے انداز میں کبھی سمترا کی طرف دیکھ رہے تھے اور کبھی آڑے ترچھے پڑے ان اجسام کی طرف۔

عارب نے سر جھٹکا اور آگے بڑھ کر فرش پر پڑی رائفل اٹھا لی۔ ہم بھی اٹھ

کھڑے ہوئے۔ میری نظریں سمترا کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ میرے لاشعور میں ایک ہلچل سی بپا تھی۔

''یہ کون ہے......؟ اس نے ایسا کیوں کیا......اس کی حقیقت کیا ہے......؟''

''دیوی جی......! یہ سب کیا ہے......؟ آپ نے اپنے ساتھیوں کو کیوں مار ڈالا......؟'' اختر نے متعجبانہ انداز میں پوچھا۔

''تمہاری محبت کا پاگل پن ہے یہ......!'' سمترا نے اس کی طرف دیکھے بغیر سنجیدگی سے کہا۔

''اب کوئی فضول سوال نہیں کرنا یہ رائفلیں سنبھال لو۔'' اور ہم نے ایک ایک رائفل اٹھا لی البتہ پروفیسر اپنی جگہ کھڑے رہے۔ سمترا نے ویرچندر کو بالوں سے پکڑ کر اٹھایا۔ اس کے چہرے پر تکلیف اور آنکھوں میں خوف کے سائے سمٹ آئے تھے۔

''بس...... سمترا......! تم پاگل تو نہیں ہوگئی یہ...... یہ کیا کیا تم نے......؟ اپنے ہی آدمیوں کو مار ڈالا......؟''

''ہاں...... اب تمہاری باری ہے۔'' سمترا نے سپاٹ انداز میں کہا۔

''کک...... کیا مطلب......؟ تت...... تم ہوش میں تو ہو......؟'' ویرچندر کی حالت خراب ہوگئی۔

''نہیں...... محبت کے زیر اثر ہوں...... مجھے شما کر دیجیے گا۔'' پھر اس سے پہلے کہ ویرچندر مزید کچھ کہتا سمترا نے دونوں ہاتھوں سے اس کی کھوپڑی کو گرفت میں لیا اور ایک جھٹکا دے کر چھوڑ دیا۔ ویرچندر ریت کی بوری کی طرح فرش پر ڈھیر ہوگیا اور اس کی گردن ٹوٹ گئی تھی۔

سمترا نے ایک تجزیاتی نظر سے ہمارے چہروں کا جائزہ لیا پھر کھلے ہوئے دروازے کی سمت بڑھ گئی۔ سیاہ گھنی زُلفوں کی آبشار کمر سے بھی نیچے گر رہی تھی۔

''میرے پیچھے آجاؤ......!''

''ٹھہرو...... پہلے ہمیں یہ بتاؤ کہ تم کون ہو......؟'' عارب کی آواز پر اس نے

قدم رک گئے۔ اس نے پلٹ کر عارب کی طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے بولی۔

''آپ مجھے سمترا دیوی کہہ سکتے ہیں۔''

''میں نے لطیفوں کی فرمائش نہیں کی۔'' عارب نے خشک لہجے میں کہا۔

''میں بھی فرمائش پوری کرنے کی روادار نہیں۔'' سمترا کی کشادہ پیشانی پر ناگواری کی شکنیں نمودار ہوگئیں۔ اور وہ آگے بڑھ گئی۔

''رک جاؤ ورنہ میں گولی چلا دوں گا۔'' عارب کا لہجہ سخت ہوگیا۔ سمترا نے پلٹ کر حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

''کیا تم مجھ سے کہہ رہے ہو......؟''

''ہاں...... آپ ہی سے مخاطب ہوں۔'' عارب نے رائفل سیدھی کر لی۔

''عارب...... کیا حماقت ہے یہ......؟'' پروفیسر پہلی بار گویا ہوئے۔

''سمترا ہماری محسن ہے۔ اس نے ہماری زندگیاں بچائی ہیں اور تم اسی پر رائفل سیدھی کئے ہوئے ہو......؟ ہٹاؤ اسے...... پاگل نہیں بنو۔''

''پروفیسر......! میں بھی ان کا یہ احسان مانتا ہوں مگر صورت حال کا آپ کو بھی مکمل علم ہے۔ کچھ دیر پہلے تک یہ ہماری دشمن تھی اور گرگٹ کی طرح لمحوں میں رنگ بدلا ہے انہوں نے۔ ذہن میں یہی پھانس ہے کہ نہ جان نہ پہچان ان کو ہمارے لئے ایسا انتہائی قدم اٹھانے کی کیا ضرورت تھی......؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ ایک مصیبت سے انہوں نے ہمیں نجات دلائی ہے اور دوبارہ وہ خود کہیں اس سے بھی بڑی مصیبت میں نہ پھنسا دیں۔ جب تک یہ اپنی طرف سے ہمیں مطمئن نہیں کر دیتی میں رائفل کا رخ نہیں ہٹاؤں گا۔''

''یہی سوال اخلاق اور دوستی کے دائرہ میں رہ کر بھی تو کیا جا سکتا ہے۔'' پروفیسر نے قدرے نرم لہجے میں کہا۔

''میرا خیال ہے کہ ابھی تک میں نے کوئی بداخلاقی یا دشمنی نہیں کی ان سے۔''

''عارب......!'' میں نے ملائمت سے عارب کو مخاطب کیا۔

''پروفیسر کی بات درست ہے۔ تم رائفل نیچے کر لو۔'' پھر میں سمترا سے مخاطب ہوا۔

''براہ کرم آپ ہمیں اپنے بارے میں کچھ بتا دیں تاکہ ہماری الجھن اور پریشانی رفع ہو سکے۔'' چند لمحے تک سمترا خاموش کھڑی رہی پھر گہری سنجیدگی سے گویا ہوئی۔

''دیکھیں ڈاکٹرز حضرات......! میں قبل از وقت کچھ بھی نہیں بتا سکتی۔ اسے آپ لوگ چاہیں تو میری مجبوری سمجھ لیں چاہے مصلحت، ہاں اتنا کہہ دیتی ہوں کہ میں دوستوں میں سے ہوں اگر تو میری بات کا یقین کر سکیں تو میرے ساتھ آ جائیں بصورت دیگر آپ میری پیٹھ پر گولی چلا کر اپنے ذہنوں میں پلنے والے اندیشوں سے چھٹکارا پا سکتے ہیں۔'' سمترا نے ایک ایک نظر ہم سب پر ڈالی پھر پلٹ کر کھلے ہوئے دروازے سے باہر نکل گئی۔

چند لمحے تک ہم آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے سوال کرتے رہے پھر سب سے پہلے عارب ہی آگے بڑھا اور ہم نے بھی اس کی تقلید کی اور کمرے سے باہر نکل آئے۔

یہ ایک مختصر سی راہ داری تھی۔ بائیں ہاتھ سے مکمل طور پر بند تھی اور دائیں ہاتھ میں چند قدم کے فاصلے پر جہاں راہ داری کا اختتام ہوتا تھا وہاں سے یہ دائیں ہاتھ گھومتی تھی اور اس کونے میں ہی سمترا غالباً ہمارے ہی انتظار میں کھڑی تھی۔ ہمیں دیکھتے ہی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اتر آئی۔

''میں اس اعتماد پر آپ لوگوں کی شکر گزار ہوں۔'' ہمارے قریب پہنچتے ہی وہ گویا ہوئی۔

''ہم نے آپ کو اپنا کمانڈر تسلیم کیا ہے۔ اب آگے بتائیں کیا کرنا ہے......؟'' عارب نے کہا۔

''شکریہ مسٹر عارب......!'' ایک ذرا توقف کے بعد وہ دوبارہ گویا ہوئی۔

''یہاں آگے ایک کمرہ ہے اور اس کمرے کی دوسری سمت ایک مختصر سا ہال

جہاں سے لفٹ اوپر ہوٹل تک جاتی ہے اس ہال میں ویر چندر کے دو ذاتی گارڈ موجود ہیں۔ میں انہیں اندر کمرے میں بلاؤں گی آپ لوگوں نے ان پر قابو پانا ہے۔"

"تو کیا وہ ابھی تک وہاں موجود ہوں گے......؟ میرا مطلب ہے فائرنگ کی آواز......" ڈاکٹر عقیل نے اپنا خدشہ ظاہر کرنا چاہا مگر سمترا نے درمیان سے ہی ان کی بات کاٹ دی۔

"فائرنگ کی آواز ان تک نہیں پہنچی ہوگی یہ جگہ ساؤنڈ پروف ہے۔"

"ٹھیک ہے...... ہم تیار ہیں...... آگے بڑھیں۔" عارب نے لاپرواہی سے کہا اور سمترا راہداری میں مڑ گئی۔ دو قدم ہی کے فاصلے پر دروازہ تھا۔ سمترا نے اطمینان سے دروازہ کھولا اور اس کے پیچھے پیچھے ہم بھی اندر داخل ہو گئے۔ یہ ایک سجا سجایا کمرہ تھا۔ کسی عالی شان محل کی خواب گاہ جیسا۔ ایک طرف کونے میں منقش لکڑی کا دروازہ تھا۔ سمترا اسی دروازے کی سمت بڑھ گئی۔

"تم لوگ دروازے کے دائیں بائیں کھڑے ہو جاؤ۔" اس نے کہا اور ہم دو دو کی صورت میں دروازے کے دائیں بائیں دیوار کے ساتھ پشت ٹکا کر کھڑے ہو گئے۔ سمترا نے دروازہ کھولا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ کہیں قریب ہی سے ہلکی ہلکی باتوں کی آواز آنے لگی مگر باتوں کی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ ہماری دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ نہ جانے وہ ان سے کیا کہہ رہی تھی۔ اعصاب ایک تناؤ کا شکار ہو گئے۔

چند لمحے گزرنے کے بعد دروازے کے قریب آہٹ ہوئی اور سمترا اندر آ گئی ور مطمئن انداز میں سیدھی آگے بڑھ گئی۔ رائفلوں پر ہماری گرفت مضبوط ہو گئی اور ھر وہ دونوں بھی اندر آ گئے جن کی گھات میں ہم چھپے کھڑے تھے۔ اور وہ جیسے ہی ندر آئے ہم نے ان کی گردنوں پر رائفلوں کی ضربیں لگائیں۔ ان کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔

نتیجہ یہ کہ وہ دونوں ہی منہ کے بل گر پڑے۔ ان کے ہاتھوں سے رائفلیں ں کر گر پڑیں۔ ان کے گرتے ہی سمترا حیرت انگیز پھرتی سے پلٹی۔ جانے وہ نازک

سا خنجر اس کے پاس کہاں سے آیا جو اس وقت اس کے ہاتھ میں چمک رہا تھا۔ ان دونوں نے بھی اٹھنے میں دیر نہیں کی تھی مگر موت ان سے بھی زیادہ تیز نکلی۔ عارب نے رائفل لاٹھی کے انداز میں استعمال کی تھی۔ مضروب کی کھوپڑی میں یقیناً لاتعداد دراڑیں پیدا ہوگئی ہوں گی۔ سمترا کے ہاتھ میں پکڑا خنجر دوسرے کی گردن کے آر پار ہوگیا اور وہ دونوں ہی بغیر کوئی آواز نکالے کارپٹ پر ڈھیر ہوگئے۔ سمترا نے خنجر اسی کے کپڑوں سے صاف کیا اور آستین میں چھپا لیا۔ پھر وہ ہمیں اشارہ کرتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی ہم بھی فوراً ہی اس کے پیچھے لپکے۔

یہ ایک اچھا خاصا ہال تھا جس کی دیواروں پر کئی دروازے نظر آ رہے تھے۔ سمترا کوئی بات کئے بغیر لفٹ کی جانب بڑھ گئی۔ لفٹ کا دروازہ بند کرنے کے بعد جب لفٹ ہلکے سے ارتعاش کے بعد حرکت میں آگئی تب عارب اختر سے مخاطب ہوا۔

''اختر......! تم تو بالکل ہی خاموش ہوگئے ہو۔''

''کیا بولوں...... عارب بھائی......! جو کچھ دیکھا ہے وہ دیکھنے کے بعد بھی کیا مجھے کچھ بولنا چاہئے......؟'' اختر ترچھی نظروں سے سمترا کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''میں تو دیوی جی کو ایک عام سی دوشیزہ سمجھ رہا تھا مگر انہوں نے تو ہماری بولتی ہی بند کر دی ہے اب آپ ہی بتائیں بھلا میں وہ دل گردہ کہاں سے لاؤں کہ جس پر بھروسہ کرتے ہوئے میں دیوی جی سے اظہار محبت کر سکوں......؟'' سمترا کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں آیا وہ سنجیدگی کا شکار تھی۔

''دیوی جی......!'' اختر براہ راست سمترا سے مخاطب ہوا۔

''خیریت تو ہے آپ کچھ متفکر دکھائی دے رہی ہیں۔ اگر آپ کو میری باتیں ناگوار گزر رہی ہیں تو میں معذرت خواہ ہوں۔'' سمترا نے بھنویں قدرے اوپر اٹھائیں۔

''میں بچوں کی باتوں پر ناگواری محسوس نہیں کرتی۔''

''اچھا......تو پھر آپ کی پریشانی کا محرک کیا ہے...... دادی ماں......؟'' سمترا

نے ایک ذرا اختر کو گھورا پھر نچلا ہونٹ کاٹتے ہوئے بولی۔

''جو ہوا اچھا نہیں ہوا...... میں مہاراج کی نظروں میں آگئی ہوں اور پھر اس کے سات...... سات آدمیوں کا قتل...... یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔''

''تو کیا ہوا...... مہاراج کیا بندے کھاتا ہے......؟''سمترا کے ہونٹوں پر ایک مضمحل سی مسکراہٹ ابھر کر معدوم ہوگئی۔

''آپ لوگ مہاراج کے متعلق کچھ جانتے نہیں کہ وہ کس قدر باخبر اور باوسائل آدمی ہے۔ کیا بلا ہے......؟ جب اسے اس واقعے کا علم ہوگا تو کیسا زلزلہ آئے گا اور کوئی بعید نہیں کہ اس کو اس سارے واقعے کی خبر بھی ہوگئی ہو۔''

''اتنی جلدی خبر بھی ہوگئی...... وہ کیا کوئی جن ہے......؟''

''ہاں......! یہ تشبیہ اس کے لئے بالکل مناسب ہے۔'' لفٹ ہلکے سے جھٹکے کے ساتھ رک گئی۔

''یہ رائفلیں یہیں ڈال دیں آگے یہ ہمارے لئے مسئلہ پیدا کرسکتی ہیں۔'' سمترا کے کہنے پر رائفلیں ہم نے لفٹ کے ایک کونے میں ڈھیر کردیں۔ اور لفٹ سے باہر نکل آئے۔ یہ بھی ایک خوبصورت آرائش کمرہ تھا جس میں ایک طرف دیوار گیر ریک میں امپورٹڈ برانڈ کی شراب کی بوتلیں سجی ہوئی تھیں۔

سمترا نے آگے بڑھ کر سامنے کی دیوار میں نظر آنے والے دروازے کی ''کی ہول'' سے آنکھ لگا دی پھر مطمئن سا سانس لے کر سیدھی ہوگئی۔ اس نے دروازہ کھولا اور ہم باہر نکل آئے۔ یہ ایک صاف ستھری چمچماتی راہ داری تھی جس کے دونوں طرف دروازے تھے۔ یقیناً ہم زیرزمین تہہ خانوں سے نکل کر اوپر ہوٹل پر پہنچ آئے تھے۔

''اب کدھر کا پروگرام ہے......؟'' عارب نے سمترا کو مخاطب کیا۔

''بس آپ میرے ساتھ آجائیں۔ ہمیں جلد از جلد اس ہوٹل سے نکلنا ہے اور ہم سیڑھیوں کے رستے نیچے جائیں گے کیونکہ لفٹ کے ذریعے نیچے جانا ہمارے لئے خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔''

''اور ہمارا سامان......؟''

''زندگیاں بچ گئی ہیں عقیل میاں......! اس ذات کا شکر ادا کرو۔ سامان کی فکر چھوڑو۔'' پروفیسر نے عقیل کی بات درمیان میں سے ہی قطع کرتے ہوئے کہا۔

''سامان کی طرف سے بھی بے فکر ہو جائیں۔ وہ میرے آدمی لے جا چکے ہیں۔'' سمترا نے کہا۔

''آخر آپ بتا کیوں نہیں دیتیں کہ آپ کیا چیز ہیں......؟'' ڈاکٹر عقیل نے کہا۔

''چیز......؟ عقیل صاحب......! میں ایک عام سی لڑکی ہوں اور بس......!''

ہم سیڑھیوں کے رستے نیچے پہنچے اور عقبی طرف پورچ میں کھلنے والے گلاس ڈور سے پورچ میں پہنچ گئے۔ ٹھیک اسی وقت ایک لینڈ کروزر قطار در قطار کھڑی گاڑیوں میں سے نکلی اور ہمارے سامنے آ رکی۔ ایک لمحے کو ہمارے دل اچھل کر حلق میں آ گئے۔ ڈرائیور سیٹ پر ایک نوجوان بیٹھا تھا۔ بریک پر پاؤں رکھتے ہی وہ سمترا کی طرف دیکھ کر بولا۔

''السلام علیکم میڈم......!''

''وعلیکم السلام......! کہو عبدل کیا حالات ہیں......؟''

''امن......!'' عبدل نے مختصر جواب دیا اور سمترا ہمیں اشارہ کرتی ہوئی گاڑی کی دوسری جانب گھوم گئی اور اس کے ساتھ ہم بھی گاڑی میں سوار ہو گئے۔ پردے کھینچ دیئے گئے اور گاڑی پورچ سے نکل کر دہلی کی معروف شاہراہ پر آ گئی۔

ایک جگہ سے ہم نے گاڑی تبدیل کی۔ اس گاڑی میں بھی سمترا کا ہی آدمی تھا۔

کچھ فاصلہ دو ٹیکسیوں میں طے کیا گیا پھر ہم ایک کھٹارا سی ویگن کے عقب میں سوار ہوئے، راستے بھر ہمارے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ میرا ذہن سمترا کی ذات میں الجھا ہوا تھا۔ بڑی اونچی چیز تھی۔ بظاہر خود کو ایک عام اور بے ضرر سی لڑکی کہتی تھی مگر ساتھ ہی حقیقت بھی ہمارے سامنے تھی۔ اس کی چال کا وقار، لہجے کا اعتماد، آنکھوں سے چھلکتی ذہانت کی چمک اور اس کے لڑنے کی تکنیک اور...... اور پھر

جدید اور آٹومیٹک رائفل بھی اس نے اس طرح چلائی تھی جیسے کہ کھلونا بندوق۔

یہ بات تو یقینی تھی کہ اس نے جہاں سے بھی تربیت حاصل کی تھی زبردست تربیت حاصل کی تھی مگر ہمارے لئے الجھن کی بات یہ تھی کہ اس کی سپورٹ پر کون ہے اور وہ ہمارے لئے اتنا کچھ کیوں کر رہی ہے؟ میں انہی سوچوں میں غلطاں و پیچاں تھا کہ ویگن ایک پرانی طرز کی عمارت کے گیٹ پر پہنچ کر رک گئی۔ ڈرائیور نے ہارن بجایا تو کچھ دیر کے انتظار کے بعد گیٹ کھل گیا۔ گیٹ کھولنے والا ایک دیو قامت آدمی تھا۔ اس کے کندھے سے ''ریپٹر'' لٹک رہا تھا۔

ڈرائیور ویگن کو سیدھا اندر لے گیا جب ایک کونے میں ویگن رک گئی تو ہم سب نیچے اتر آئے۔ اب بھی کچھ کمی تو نہ تھی تاہم کسی دور میں یہ عمارت بڑی پُرشکوہ رہی ہوگی۔ ایک طرف گارڈن چیئر پر ایک نوجوان بیٹھا غالباً اپنی نصابی کتابوں کی اسٹڈی کر رہا تھا اور اس سے تھوڑے فاصلے پر مالی ''رمبی'' سنبھالے پودوں کی گوڈی کر رہا تھا۔ یہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ نوجوان نہ تو کالج اسٹوڈنٹ ہے اور نہ دوسرا مالی بلکہ دونوں اپنی اپنی ڈیوٹی دے رہے ہیں اور وقت پڑنے پر وہ نوجوان کتاب سے لاش گرا سکتا ہے اور مالی کی ''رمبی'' سے گولی بھی نکل سکتی ہے۔

''میڈم......! میرے لئے کیا حکم ہے......؟'' عبدل نے سمترا کو مخاطب کیا۔

''تم فی الحال یہیں رکو...... ہوسکتا ہے تمہاری ضرورت پڑ جائے۔''

''اوکے......!''

ہم سمترا کے ساتھ اندرونی جانب بڑھ گئے۔

''السلام علیکم مالی بابا......!''

''وعلیکم السلام بیٹا رانی......! کیسی ہو......؟''

''بابا......! آپ کی دعاؤں کے سائے میں ہوں۔''

''جیتی رہو......!'' بابا جی ایک سرسری سی نظر ہم پر ڈال کر دوبارہ اپنے کام میں مگن ہوگئے۔ ان کی سرسری سی نظر بھی یوں لگی تھی جیسے اندر سے روح تک کو ٹٹول آئی ہو۔

''ببلو......! تمہاری اسٹڈی کیسی چل رہی ہے......؟'' سمترا اس نوجوان سے مخاطب ہوئی۔

''شدید بوریت ہو رہی ہے آپی......! آپ مجھے کالج میں ایڈمیشن لے دیں نا...... میں اس چار دیواری کی تعلیم سے تنگ آ چکا ہوں۔''

''ابھی چار دیواری سے ہی سبق لو۔ کالج کی کھلی فضاؤں میں ابھی نہیں چل پاؤ گے۔''

عجیب انداز تھا ان کی بات چیت کا لہجوں میں مدوجذر ہی نہ تھا۔ جیسے روز رٹے رٹائے جملے دہرائے جا رہے ہوں یا کوڈ ورڈ چل رہے ہوں۔

''تم اپنا رونا دھونا چھوڑ اور انکل کی سناؤ......!''

''انکل کی کیا سناؤں......؟ صبح سے مقبرے کی زیارت کرنے گئے ہوئے ہیں۔''

''اور مہمانوں کا سامان آیا تھا کس کمرے میں رکھا ہے......؟''

''جڑواں۔''

''ٹھیک ہے...... پڑھو تم......!'' سمترا نے سر ہلاتے ہوئے کہا اور اس نے دوبارہ کتاب اٹھالی۔ ہم سمترا کے ساتھ آگے بڑھ گئے۔ عمارت تین منزلہ تھی۔ سمترا ہمیں دوسری منزل پر واقع ایک ایسے کمرے میں لے آئی جس کے اندر سے ایک دروازہ دوسرے کمرے میں کھلتا تھا۔ یعنی دونوں کمرے ایک دوسرے سے اٹیچ تھے۔

''ہاں تو ڈاکٹرز حضرات......! یہ جڑواں کمرے آپ کے استعمال میں رہیں گے اور اب آپ رہیں گے بھی یہیں اسی عمارت میں۔ یہاں سے آپ نیچے تو آ سکتے ہیں مگر اوپر کی منزل پر جانے سے گریز کیجئے گا اس......'' عارب نے سمترا کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''اور اگر ہم یہاں نہ رہنا چاہیں تو......؟''

''تو......'' سمترا نے گال اندر کی جانب کھینچے، ایڑیاں اٹھاتے ہوئے ایک ذرا پنجوں کے بل جھولا سا کھایا اور مطمئن انداز میں گویا ہوئی۔

''اس الماری میں آپ لوگوں کا سامان پڑا ہے۔'' اس نے دیوار گیر الماری کی طرف اشارہ کیا۔

''فریش ہونا چاہیں تو وہ کونے والا دروازہ باتھ روم میں کھلے گا۔ فریش ہو کر چینج کر لیں تا کہ آپ لوگوں کا حلیہ ذرا شریفانہ لگے۔ کچھ دیر بعد کھانے کی ٹیبل پر ملاقات ہوگی۔ کھانا ہمارے ساتھ کھایئے گا۔ اس کے بعد اگر آپ جانا چاہیں گے تو جہاں آپ کہیں گے آپ کو پہنچا دیا جائے گا اور اگر آپ خود ہی کہیں جانا چاہیں گے تو بھی آپ کو زبردستی روکنے کی کوشش نہیں کی جائے گی۔''

''اور اگر ہم کھانا بھی نہ کھانا چاہیں......؟ کیونکہ پہلے ہی ایک دفعہ کا کھانا بہت مہنگا پڑا ہے۔ ہم مزید مہنگائی برداشت کرنے کے حق میں نہیں۔''

''تو...... اس میں بھی کوئی زور زبردستی نہیں۔ البتہ کھانے کی ٹیبل پر آپ کو لازمی آنا پڑے گا۔''

''اور اگر ہم ابھی اس وقت یہاں سے جانا چاہیں......؟''

''سوری......! یہ ممکن نہیں۔ نہ ہی اس کی مجھے اجازت ہے کہ آپ کو یوں جانے کی اجازت دے دوں۔''

اس دفعہ عارب کے بولنے سے پہلے ہی میں بول پڑا۔

''آپ بتا کیوں نہیں دیتیں کہ آپ کون ہیں......؟ اور ہم سے کیا چاہتی ہیں......؟'' سمترا واپسی کے لئے مڑی تھی کہ میری بات سن کر رک گئی اور وہیں سے گردن موڑ کر مسکراتے ہوئے بولی۔

''آپ فریش ہو لیں کچھ دیر بعد آپ کے ذہن میں کوئی سوال تشنہ نہیں رہے گا۔''

سمترا دروازے تک پہنچی تھی کہ اختر بول پڑا۔

''دیوی جی......!'' سمترا نے رکتے ہوئے بڑی تیکھی نظروں سے اس کی سمت دیکھا۔

''مجھے بھی اپنے ساتھ لیتی جائیں۔''

''کہاں......؟''

''جہاں آپ جا رہی ہیں۔''

''میں جہنم میں جا رہی ہوں۔''

''کوئی بات نہیں......! مجھے دروازے پر بٹھا دیجئے گا۔ تیرا سنگ نہ سہی سنگ آساں ہی سہی......!'' سمترا کوئی جواب دیئے بغیر دروازہ ایک دھماکے سے بند کرتی ہوئی چلی گئی۔ اختر بے اختیار مسکرا دیا۔

''انسان ہو یا کارٹون......!'' عارب نے اسے گھورا۔

''کیوں......؟ کیا ہو گیا......؟''

''لگتا ہے ہندوستان کی آب و ہوا نے تمہارے دماغ پر اثر ڈالا ہے۔''

''دماغ پر نہیں عارب بھائی......! دل پر اثر ڈالا ہے یہاں کی آب و ہوا نے...... دھڑکنیں سینے میں گدگداہٹ سی مچائے ہوئے ہیں اور دل پر تو رقص کی سی کیفیت طاری ہے۔''

''اس کیفیت پر فوراً قابو پالو ورنہ سینے میں دل ہی نہیں چھوڑے گی وہ۔'' عارب مسکرا دیا۔

''تو ہم بھی تو یہی چاہتے ہیں کہ وہ ہمارے دل کا تحفہ قبول کر لے مگر ظالم پتھر کا کلیجہ لے کر پیدا ہوئی ہو گی۔ ایسی نظروں سے دیکھتی ہے جیسے کچا ہی چبا جائے گی۔''

''غالباً کھانے کی ٹیبل پر ان سب کا یہی پروگرام ہے۔'' ڈاکٹر عقیل نے متفکر لہجے میں کہا۔

''عقیل صاحب آپ کو متفکر ہونے کی ضرورت نہیں۔ آپ کو تو یہ لوگ کھا نہیں سکیں گے اور اگر بزور دندان و معدہ ایسا کر گزرے تو یقیناً آپ کو ہضم نہیں کر پائیں گے اور یوں آپ کی قربانی رائیگاں نہیں جائے گی۔'' عارب کی بات پر ڈاکٹر عقیل بھڑک اٹھے۔

''بدتمیز......! تم مجھ سے کلام ہی نہیں کیا کرو...... نامعقول انسان...... کوڑھ

مغز...... یہاں جان عذاب میں پڑی ہوئی ہے اور انہیں خرمستیاں سوجھ رہی ہیں۔"

"جی ہاں......! بقول شاعر ؎

تمہیں خرمستیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں۔"

اختر نے فوراً ان کی تائید کی۔

"ٹھیک ہے...... تم لوگوں کو اگر بیزار ہونے کا کچھ زیادہ ہی کریز ہے تو ہوتے رہو بیزار...... ہمیں تو بیزار ہونا نہیں آتا۔ جب تک ہاتھ پیر سلامت ہیں تب تک بیزار ہونا پسند بھی نہیں کریں گے، جو ہوگا بھگت لیں گے۔" عارب نے الماری میں سے اپنا سامان نکالا اور ساتھ والے کمرے میں چلا گیا۔ اختر نے بھی ان کی تقلید میں اپنا سامان لیا اور مسکراتے ہوئے ان کے پیچھے ہی دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

میں پروفیسر اور ڈاکٹر عقیل صورت حال کا تجزیہ کرنے لگے مگر اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنے والی بات تھی۔ سمترا کہہ گئی تھی کہ سوال جواب بعد میں پہلے فریش ہو لیں۔ سو کچھ دیر کے لئے ذہنی الجھاؤ کو پس پشت ڈال دیا گیا۔ پروفیسر کا تجزیہ تھا کہ سمترا دوستوں میں سے ہے دشمنوں کا رویہ ایسا نہیں ہوا کرتا جبکہ ڈاکٹر عقیل کا کہنا تھا کہ منافقوں کا رویہ تو ایسا ہو سکتا ہے نا......!

تقریباً ایک گھنٹے بعد ہم سب چینج وغیرہ کرنے کے بعد فریش ہو بیٹھے تھے اور ہم سب کا متفقہ فیصلہ تھا کہ اگر حالات ذرا بھی ہمارے خلاف ہوتے نظر آئے تو لڑ مریں گے۔ ٹھیک اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی اور ایک کرخت صورت عورت اندر آ گئی۔

"کھانا لگا دیا گیا ہے، کیا آپ لوگ تیار ہیں......؟"

"جی ہاں......! ہم اچھی طرح دانت تیز کر چکے ہیں۔" اختر نے جلدی سے کہا۔

"تو پھر آ جائیں......!" عورت نے ایک نظر قہربار اختر پر ڈالی۔ اس کے بولنے کا انداز بھی اس کی شخصیت کی طرح روکھا اور کرخت تھا۔ حلیے سے وہ جھاڑو پوچھے والی لگتی تھی۔ ہم اس کی معیت میں سیڑھیاں اتر کر نیچے آ گئے۔ دو راہ داریوں

کے بعد وہ ہمیں ایک بند دروازے پر چھوڑ کر واپس چلی گئی۔

''اندر چلے جائیں۔'' ہم نے ایک نظر ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر میں سب سے پہلے اندر داخل ہوا۔ خوبصورت آرائشی ڈائننگ ہال تھا۔ بالکل سامنے ایک جہازی سائز ٹیبل پر کھانے کے برتن سجے ہوئے تھے۔ تمام کرسیاں خالی تھیں صرف ایک کرسی پر سمترا بیٹھی تھی۔ ہمارے اندر داخل ہوتے ہی وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''آیئے......! آیئے ڈاکٹرز حضرات......! آپ لوگوں کا ہی انتظار تھا۔'' اس کے ہونٹوں پر ایک پُرفریب مسکراہٹ تھی۔

''سب کا یا صرف میرا......؟'' اختر تیزی سے آگے بڑھ گیا۔

''آپ اس قابل نہیں کہ آپ کا انتظار کیا جائے۔'' سمترا نے بڑی متانت سے جواب دیا تو اختر برا سا منہ بنا کر رہ گیا۔

''آئیں تشریف رکھیں۔'' اس دفعہ اس کا تخاطب میں اور پروفیسر تھے۔

''شکریہ......!'' ہم نے ایک ایک کرسی سنبھال لی۔ ہمارے بیٹھنے کے بعد سمترا خود بھی بیٹھ گئی۔

''ابھی انکل آجاتے ہیں تو کھانا شروع کرتے ہیں۔'' اس نے مسکرا کر کہا۔

''آپ اپنے انکل کی کچھ تعریف کرنا پسند کریں گی۔'' عارب نے کہا۔

''بالکل نہیں۔''

''کیا وجہ......؟''

''انکل اپنی تعریف آپ ہیں، سو مجھے ان کی تعریف کی ضرورت نہیں اور نہ ہی ان کی تعریف کے لئے میرے پاس موزوں الفاظ ہیں۔'' دو ٹوک جواب پر عارب خاموش ہو رہا۔

''سمترا......! ویسے تو شاید آپ نے کچھ نہ بتانے کی قسم کھا رکھی ہے لیکن اگر خالصتاً آپ کی ذات کے متعلق کوئی سوال کیا جائے یعنی اس صورت حال سے ہٹ کر تو کیا آپ اس کا جواب دینا پسند کریں گی......؟'' میں نے سنجیدگی سے کہا تو سمترا کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

''یہ بھی سوال کی نوعیت پر منحصر ہے۔ بہت سی ذاتی باتیں ایسی ہوتی ہیں جو کسی کو بتانا انسان مناسب نہیں سمجھتا۔''

''نہیں...... ایسی کوئی بات نہیں۔''

''تو...... پوچھیں کیا پوچھنا چاہتے ہیں۔''

''مجھے آپ کے نام پر شبہ ہے۔'' سمترا بے اختیار مسکرا دی۔

''مجھے نہیں لگتا کہ آپ کا تعلق سمترا کے مسلک سے ہے۔''

''آپ کا اندازہ درست ہے۔ الحمد للہ میں مسلمان ہوں۔''

''ہررے......!'' اختر کی قلقاری پر سمترا...... یا جو بھی...... کے ماتھے پر شکنیں ابھر آئیں۔

''تمہیں کیا دورہ پڑا ہے......؟'' عارب نے اختر کو گھورا۔

''عارب بھائی ایک بہت بڑی رکاوٹ، بہت بڑا مسئلہ حل ہوگیا قدرت کی طرف سے۔'' اختر چہکا۔ میں سمترا کا نام پوچھنا چاہتا تھا۔ ٹھیک اسی وقت بغلی دیوار میں نظر آنے والے دروازے پر دستک ہوئی۔

''کیا میں اندر آسکتا ہوں۔'' بے اختیار ہم سب کی نظریں اس سمت اٹھ گئیں۔ سمترا اٹھ کھڑی ہوئی۔

''ارے انکل......! یہ کیا بات ہوئی...... آئیں ناں......!''

انکل ادھیڑ عمر آدمی تھے۔ دبلے پتلے، لمبا قد...... چمکدار مسکراتی آنکھیں، تیکھا ناک، نوکیلی ٹھوڑی، باریک ہونٹ، مونچھیں داڑھی گو صفا چٹ تھی ہی، پیشانی بھی کافی حد تک بنجر پنے کی طرف مائل تھی۔ اسی باعث یہ تمیز کرنا کافی دقیق مسئلہ تھا کہ ان کی پیشانی کہاں ختم ہوتی ہے اور سر کہاں سے شروع۔

وہ مسکراتے ہوئے اندر آگئے۔

''ہیلو ایوری باڈی...... ہاؤ آر یو......'' ان کے انداز، ان کی آواز سے بے پناہ اعتماد اور تمکنت مترشح تھی۔ وہ ہماری طرف آئے اور ڈاکٹر عقیل کے سامنے آ رکے۔ آنکھوں میں ایک شرارت اور ہونٹوں پر دلچسپی کی مسکراہٹ رقصاں تھی۔

''ہیلو مسٹر عقیل بن عاص......!'' انکل نے عاص کو عجیب لمبا اور کھینچ کر ادا کیا۔

''او شلندر......! یہ...... یہ تم ہو......؟'' ڈاکٹر عقیل نے بے یقینی کے سے انداز میں کہا اور جھٹکے سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ان کی آنکھوں میں شدید حیرت در آئی تھی۔

''ہاں میری جان......! یہ میں ہی ہوں۔'' شلندر نے دونوں بازو کھولتے ہوئے کہا اور وہ ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ تو ستمرا...... یعنی ستمرا کے روپ میں جو قیامت تھی وہ شلندر کے لئے کام کرتی تھی۔ چند لمحوں میں تمام سوالوں کے جواب مل گئے۔ یوں لگا جیسے اعصاب سے...... دماغ سے منوں وزن پل بھر میں سرک گیا ہو۔

''اور اتنے برس بیت جانے کے باوجود عقیل بن عاص...... کی ذات میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں آئی۔'' ان کا جوش اور مسرت دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ کسی دور میں ان دونوں کے درمیان کیسی گہری محبت رہی ہوگی۔ کچھ دیر کے لئے جیسے وہ اپنے آپ کو بھی فراموش کر بیٹھے تھے پھر شلندر کو ہی خیال آیا اور وہ ڈاکٹر عقیل سے الگ ہوتے ہوئے ہم لوگوں سے مخاطب ہوا۔

''سوری فرینڈز......! میں آپ لوگوں کو بالکل ہی بھول گیا۔ دراصل ایک طویل عرصے کے بعد اپنے جگری متر...... دوست سے ملا ہوں۔ سو آئی ایم ایکسٹریملی ایکسائیٹڈ۔'' (اس لئے میں بے انتہا خوش ہوں)۔

''شلندر صاحب......! آپ دونوں کی محبت دیکھ کر ہمیں خود بہت زیادہ خوشی ہوئی ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''میں ان کا تعارف کروا دوں۔'' ڈاکٹر عقیل نے تعارف کرانا چاہا تو شلندر نے جلدی سے انہیں منع کر دیا۔

''ایک منٹ......! جسٹ آ منٹ......!'' پھر وہ پروفیسر کی طرف دیکھ کر بولا۔

''سرٹنلی ہی از پروفیسر......! پروفیسر فاضل بصاری...... یا یم آئی رائٹ......؟''

''ہنڈرڈ پرسنٹ رائٹ......!'' پروفیسر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

پھر وہ میری جانب متوجہ ہوگیا۔ اس کی آنکھوں کی چمک میں مزید اضافہ ہوگیا تھا۔

''ڈاکٹر شکیل ظفر......!''

''یس......!'' میں نے مسکراتے ہوئے مصافحہ کیا۔ اس نے پلٹ کر ایک ایک نظر اختر اور عارب کی طرف دیکھا۔

''اختر انصاری......!'' خلاف توقع اختر نے بڑی سنجیدگی سے ہاتھ ملایا۔

''ڈاکٹر عارب......!''

''جی ہاں......!'' عارب نے مسکراتے ہوئے مصافحہ کیا۔

''حیرت انگیز بات ہے کہ آپ نے اتنے وثوق سے ہماری شناخت کیسے کر لی......؟''

''آپ لوگوں کے نام تو پہلے ہی میرے علم میں تھے اور ناموں کا شخصیت پر بڑا گہرا اثر ہوتا ہے۔ آپ...... آپ لوگ بیٹھیں نا...... کھانا شروع کریں۔'' شلندر گھوم کر ہمارے مقابل بیٹھ گیا۔

''یہ ایٹی کیٹس کے خلاف ہے۔'' اختر بیٹھتے ہوئے شلندر سے مخاطب ہوا۔

''ہمارا تعارف تو آپ نے خود ہی حاصل کر لیا مگر اپنا مکمل تعارف نہیں کروایا۔'' اختر نے ترچھی نظروں سے اس سماوی بجلی کو دیکھا۔

''کیا مطلب......؟'' شلندر نے حیرت سے کہا۔ پھر اختر کا زاویہ نگاہ دیکھ کر قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

''اوہ......! یہ میری بھتیجی ہے۔ نفسیات میں ماسٹر کے بعد اس فیلڈ میں آگئی۔ مارشل آرٹ میں بلیک بیلٹ ہے تھری ڈان، باقی کی تربیت میں نے خود دی ہے۔ اس کا والد میرا بہت اچھا دوست ہے۔ اس نے میرے ادارے سے اٹیچ ہونے کی ضد کی، میں یہ ضد پوری کرنے کے حق میں نہ تھا مگر اپنے دوست کا کہا نہ ٹال سکا۔ اب سوچتا ہوں کہ اسے اپنی ایجنسی میں شامل کر کے میں نے بہت اچھا کیا ہے۔''

''کیا ان کا کوئی اسم گرامی نہیں ہے......؟'' اختر نے ڈونگہ اپنی جانب سرکایا۔

''آپ مجھے دیدی کہہ لیا کریں۔'' شلندر کے بولنے سے پہلے ہی اس شعلہ جوالہ نے ترش لہجے میں کہا۔

''آپ سے کہہ رہی ہیں۔'' اختر نے عارب سے کہا۔

''لگتا ہے کہ آپ لوگوں کا ایک دوسرے سے خاصا گہرا تعارف ہو چکا ہے۔'' شلندر نے قہقہہ لگایا۔

''بہرحال......! بات آگئی ہے اسم مبارک تک تو آپ لوگ ہماری بھتیجی کو ''مہر جی'' کہہ سکتے ہیں۔''

''مہر جی......؟ کچھ عجیب سا نام ہے۔'' اختر نے بھنویں سکیڑیں۔

''ہاں یہ ''جی'' تو پریم سے ساتھ لگایا ہے ویسے ''مہر'' کے آگے کچھ اور آتا ہے لیکن شما کیجئے گا...... پورا نام ہم نہیں بتا سکتے کیونکہ اگر ایسا ہوا تو چاچا حضور کے ہاتھوں ہماری شامت آجائے گی۔''

''کون چاچا حضور......؟''

''بھئی......شہر والوں کے لئے تو وہ ماما ہیں مگر ہمارے چاچا ہیں۔''

''چلیں کوئی بات نہیں۔ ہم آدھے نام سے ہی گزارہ کر لیں گے۔'' اختر نے درویشانہ انداز میں کہا تو شلندر قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔

''ویسے شلندر صاحب......! آپ کی بھتیجی ''مہر جی'' نے ہمیں خاصا الجھن میں ڈالے رکھا ہے۔ ان کی وجہ سے ہم بہت سے شکوک و شبہات کا شکار ہوتے رہے ہیں۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ہم باتیں بھی کر رہے تھے اور ساتھ ساتھ کھانا بھی کھا رہے تھے۔

''یہ فطری عمل تھا۔ ایسا ہوتا ہے جیسے کہ آپ یہاں کھانے کی ٹیبل پر لڑنے مرنے کا سوچ کر آئے تھے، ویسے مجھے وشواس ہے کہ عقیل بن عاص......کو اتنا اندازہ تو ہو ہی گیا ہوگا کہ ہمارے روپے کھوٹ سے پوتر ہیں ان میں منافقت کی ملاوٹ نہیں۔'' یقیناً جس کمرے سے ہم آ رہے تھے وہاں کہیں کوئی مائیک پوشیدہ تھا

جوشلندر ہماری باتیں ہمیں سنا رہا تھا۔

''تو اس کا مطلب ہے کہ تم ہماری ہی جاسوسی کرتے رہے ہو...... بڑے شیطان ہو۔'' ڈاکٹر عقیل نے اسے گھورا۔

''بھئی...... جب ہم مقبرے میں ہوتے ہیں تو ہمارے کان، آنکھیں ہزاروں کی تعداد میں ہو جاتے ہیں۔ یہاں کے دیوار و در دیکھتے بھی ہیں، سنتے بھی ہیں اور بولتے بھی ہیں۔''

''ویسے حقیقت پوچھو تو مجھے یقین نہیں آتا کہ تم وہی شلندر رائے ہریجہ ہو جو کالج میں بھی ''شرلاک ہومز'' کے ناول ساتھ لے کر آیا کرتا تھا اور خود کو پُراسرار ظاہر کرنے کے لئے عجیب احمقانہ حرکتیں کیا کرتا تھا۔''

''مسٹر عقیل......! پورے ہندوستان میں تمہارے دوست کا نام سراغ رسانی میں ایک مقام رکھتا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ آج میں اس مقام پر ہوں تو اس میں سب سے پہلے عمل دخل شرلاک ہومز کو ہی ہے۔ آج بھی میں انہیں اپنا روحانی استاد تسلیم کرتا ہوں۔''

''جب کہ میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت تم خود کسی شرلاک ہومز سے کم نہیں۔''

''یہ تمہاری سوچ ہے۔ میں خود پر اعتماد ضرور کرتا ہوں مگر اپنے کام سے پوری طرح مطمئن نہیں ہوں کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ جہاں کوئی انسان اپنے کام سے مطمئن ہو جاتا ہے وہاں سے اس کا زوال شروع ہو جاتا ہے اور کچھ نہ بھی سہی تو اس کا ارتقائی سفر رُک جاتا ہے، صلاحیتوں کو زنگ لگنے لگتا ہے۔''

باتوں کے دوران ہم کھانا کھا چکے تھے۔ نامعلوم ملازم کو کیسے معلوم ہوا کہ وہ آیا اور خاموشی سے برتن سمیٹ کر لے گیا۔ کچھ دیر بعد وہ واپس آیا اور ٹیبل پر کافی کے برتن سجا گیا۔ مہر جی نے ایک ایک کپ ہمارے سامنے رکھ دیا۔ پروفیسر نے کپ اٹھایا اتفاقاً میری نظر ان کی طرف اٹھ گئی۔ وہ گھونٹ بھرنا چاہتے تھے کہ رک گئے۔ انہوں نے ناک سکوڑ کر کپ سے اٹھتی بھاپ کو سونگھا۔ ان کے چہرے پر شدید کراہت کے آثار پھیل گئے۔ کپ انہوں نے ٹیبل پر رکھ دیا اور سر اٹھا کر کچھ سونگھنے

کی کوشش کرنے لگے۔

"کیا بات ہے پروفیسر......! آپ کچھ مضطرب لگ رہے ہیں۔" میں نے ان کو مخالب کیا۔

"خون......! فضا میں خون کی بو رچ گئی ہے...... ابھی...... اچانک......" انہوں نے گھمبیر لہجے میں کہا۔

"پروفیسر......! خیال کریں ہم تنہا نہیں بیٹھے۔ یہاں کوئی ایسی ویسی بات نہیں کریں کہ ہمارے میزبانوں کو ہم پر ہنسنے کا موقع میسر آئے۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ سب باتوں میں مصروف تھے سو کسی کی خصوصی توجہ ہماری طرف نہ ہوئی۔

"شلندر......! یقین جانو وہ لمحات ایسے تھے کہ میں تو زندہ بچنے کی امید ہی چھوڑ بیٹھا تھا۔" ڈاکٹر عقیل شلندر سے کہہ رہے تھے۔

"میں نے تو دل ہی دل میں کلام پاک پڑھنا شروع کر دیا تھا کہ آخری وقت آ گیا ہے اور جب ہماری بھتیجی نے اختر پر رائفل سیدھی کی، میرا تو دل ہی ڈوب گیا تھا۔ وہم و گمان میں نہ تھا کہ یہ ہماری دشمن نہیں بلکہ ہماری زندگیوں کی محافظ ہے...... اور...... اور پھر جو کچھ ہم نے دیکھا ذہن ابھی تک اس سب پر یقین کرنے کو تیار نہیں کہ ایک نازک اندام لڑکی نے پلک جھپکنے کی دیر میں پانچ کے پانچ آدمیوں کو ڈھیر کر دیا۔" ڈاکٹر عقیل کی بات پر شلندر کی آنکھوں میں مہر جی کے لئے اپنائیت اور تفاخر کے آثار ابھر آئے۔

"عقیل......! مجھے اپنی بھتیجی پر بڑا ناز، بڑا فخر ہے۔ میرے تمام آدمی ایک طرف اور یہ تن تنہا ایک طرف۔ پھر بھی یہ سب پر بھاری پڑے گی اور مجھے سب سے زیادہ خوشی اس بات کی ہے کہ میں نے ایک عرصہ جو اس پر محنت کی، وہ محنت رائیگاں نہیں گئی۔ تمہارے کام کے علاوہ بھی مہاراجہ رام پرشاد سے میرا کچھ حساب کتاب چل رہا ہے اس سلسلے میں مہر جی کے علاوہ ایک عورت اور میرے دو آدمی بھی "راج محل" میں ہی موجود ہیں۔ ان چاروں کو میں نے کس طرح راج محل میں ایڈجسٹ کیا تھا، یہ ایک الگ بحث ہے لیکن اب مہر جی وہاں جا نہیں سکتی۔ اس لئے یوں سمجھو

کہ میرے جو کارندے وہاں موجود ہیں مہر جی کی غیر موجودگی میں ان کی اہمیت آدھی سے بھی کم رہ گئی ہے۔ مہاراج کے سات آدمی مارے گئے، یہ میرے لئے کوئی فکرمندی کی بات نہیں۔ اب تک ان کی لاشیں اسی تہہ خانے میں دفن بھی کر دی گئی ہوں گی۔'' بات کرتے کرتے شلندر خاموش ہوگیا اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی اور آنکھوں میں کسی قدر فکرمندی کی جھلک تھی۔

''تو پھر فکرمندی کی بات کیا ہے......؟'' ڈاکٹر عقیل نے کہا۔

''فکرمندی کی بات یہ ہے کہ اب مہاراج بہت زیادہ محتاط ہو جائے گا......تم لوگ جب وہاں مصر سے یہاں کے لئے روانہ ہو رہے تھے تو شیخ حارث نے مہاراج کو مطلع کر دیا تھا کہ تم لوگ ہندوستان پہنچ رہے ہو اور کیا مقصد لے کر آ رہے ہو۔ اسی باعث تم لوگ پہلے قدم پر ہی ان کے جال میں جکڑے گئے۔ اگر مجھے تم لوگوں کی فلائٹ کا علم ہوتا تو پھر شاید ایسا نہ ہوتا پھر جب ویر چندر تم لوگوں کی طرف نکلا تو اتفاق سے مہر جی کو علم ہوگیا سو یہ بھی ان کے ساتھ ہولی مگر وہاں جو کچھ ہوا وہ مناسب نہیں ہوا۔ اب راج محل سے تابوت نکال لانا بڑا کٹھن ثابت ہوگا۔'' شلندر ہونٹ کاٹنے لگا۔

''انکل......! وہاں صورت حال ہی ایسی ہوگئی تھی کہ اور کوئی چارہ ہی نہ تھا۔'' مہر جی نے جلدی سے کہا۔ اختر کی نظریں فوراً اس کی سمت اٹھ گئیں۔

''ہاں......! میں سمجھ سکتا ہوں کہ تمہیں یہ قدم اٹھانا پڑا تو یقیناً اور کوئی راستہ نہیں بچا ہوگا۔''

''مگر اب بڑی مشکلیں پیدا ہوگئی ہیں اور......تم میری بات یاد رکھنا کہ میری اجازت کے بغیر اب تم یہاں سے کہیں نہیں جاؤ گی۔ مہاراج کے آدمی پاگل کتوں کی طرح تمہیں ڈھونڈ رہے ہوں گے۔''

''یہ ریاست رام پور یہاں سے کتنی دور ہے......؟'' میں نے پوچھا۔

''ریاست رام پور یہاں سے قریباً کوئی ڈھائی گھنٹے کے سفر پر ہے۔ اچھی خاصی ریاست ہے۔''

''اور یہ مہاراج رام پرشاد کیا کوئی بہت پہنچی ہوئی چیز ہے......؟''

''بہت بڑا خبیث ہے۔ بہت لمبے ہاتھ ہیں اسے کے...... بڑا شاطر اور مکار آدمی ہے۔'' شلندر نے نفرت سے ہونٹ سکیڑے۔

''اس...... تابوت کے متعلق کوئی کلیو ملا......؟ کہاں رکھا ہے......؟ مہاراج نے اس کا کیا کیا ہے......؟''

''ہاں......! محل کے نیچے ایک تہہ خانہ ہے...... مہاراج کا عجائب خانہ نوادرات کا ایک خزانہ ہے۔ وہ تابوت بھی وہیں ہے مگر میرے آدمیوں کی رسائی ابھی وہاں تک نہیں ہوئی۔''

''کیا آپ یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ وہ تابوت وہیں ہیں......؟''

''سو فیصدی......! تابوت میں سے سونے کا مجسمہ نکال کر تابوت کے اوپر ایستادہ کیا گیا ہے۔ مہاراج کو علم ہے کہ اس کے اندر ایک ہزاروں سال پرانی لاش ہے مگر باوجود کوشش کہ وہ مجسمے کو کھولنے کا طریقہ نہیں جان سکے اور مجسمہ کاٹ کر وہ نایاب مجسمے کو ضائع کرنے کے حق میں نہیں۔ سو مجسمہ ویسے کا ویسا ہے اور مہاراجہ اپنے دوستوں اور آنے والے مہمانوں کو بڑی خوشی اور بڑے فخر سے وہ مجسمہ دکھاتا ہے۔''

''اسے یہ کیسے معلوم ہوا کہ مجسمے کے اندر ممی ہے......؟'' پروفیسر نے پہلی بار درمیان میں مداخلت کی۔

''آپ کی تحریر سے۔'' شلندر پروفیسر کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

''مجسمے پر کندہ تحریر کا جو ادھورا سا ترجمہ آپ نے کیا تھا وہ کاغذ بھی تابوت کے ساتھ ہی مہاراج تک پہنچا تھا اور...... اس کے بعد وہ کاغذ مجھ تک پہنچ گئے تھے۔'' شلندر کے آخری الفاظ پر ہم بھی چونک پڑے۔

''آپ کے پاس...... آپ کے پاس وہ کیسے پہنچے......؟'' میں نے بے ساختہ پوچھا۔ شلندر نے مہر جی کی طرف دیکھا، وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

''وہ میں نے چرائے تھے۔ بعد ازاں بڑی مشکلوں سے مہاراج نے ایک ایسا

شخص ڈھونڈا تھا جو علم ''فلولوجی'' پر مکمل عبور رکھتا تھا مگر اس سے پہلے کہ وہ مجسمے پر کندہ تحریر کا ترجمہ کرتا ہمارے آدمیوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ حالانکہ ہمارا ایسا ارادہ نہیں تھا، ہمارے آدمیوں نے صرف اسے سمجھانا چاہا تھا مگر بات اتنی بگڑی کہ مجبوراً اس کی رگوں میں زہر اتارنا پڑا۔ اب مہاراج نے مجسمے کی مووی بنا کر مصر شیخ حارث طہاربی کو بھیجی ہے اب وہ وہاں سے مجسمے پر کندہ تحریر مہاراج تک پہنچ جائے گا۔ دراصل مہاراج ممی دیکھنے کے جنون میں مبتلا ہے۔ اور چند دن تک ترجمہ مہاراج تک پہنچ جائے گا۔''

''یہ...... یہ اچھا نہیں ہوگا۔'' پروفیسر مضطرب لہجے میں بولے۔

''وہ کاغذ اب کہاں ہیں جو آپ نے وہاں سے چرائے تھے......؟'' مہر جی سے سرک کر میری نگاہ شلندر پر آٹھہری۔

''وہ تو میں نے ضائع کر دیئے تھے۔'' شلندر نے لاپرواہی سے کہا۔

''اوہ نو......!'' مجھے ایک دھچکہ سا لگا۔

''یہ آپ نے بہت برا کیا شلندر صاحب......! یہ آپ نے بہت ہی برا کیا......''

''مگر وہ تحریر میرے پاس محفوظ ہے۔'' شلندر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کہاں ہے وہ...... میں...... میں دیکھنا چاہتا ہوں۔'' میں نے بے چینی سے کہا۔

''مقبرے میں......!''

''مقبرہ...... کیسے مقبرے میں......؟''

''آئیں سب...... آجائیں...... آپ کو ہم مقبرے کی سیر بھی کرا دیتے ہیں حالانکہ مہر جی کے علاوہ آج تک وہاں کوئی اور نہیں گیا۔'' شلندر اٹھا تو ہم سب اٹھ کھڑے ہوئے۔

''آجائیں......!''

شلندر جس دروازے سے اندر داخل ہوا تھا ہم سب اسی میں داخل ہوگئے۔

وہ غالباً بیڈ روم تھا۔ دوسرے دروازے سے نکل کر ہم ایک مختصر سی گیلری میں پہنچے اور بائیں کونے والے دروازے سے اندر داخل ہوگئے۔ یہ ایک اچھی خاصی لائبریری تھی۔

شلندر نے آگے بڑھ کر ایک جہازی سائز الماری کے پٹ کھولے۔ الماری میں موٹی موٹی کتابیں سجی ہوئیں تھیں۔ شلندر نے کتابوں پر ہاتھ رکھ کر انہیں ایک ذرا دھکیلا۔ الماری کا عقبی حصہ کتابوں سمیت کسی گیٹ کی صورت دائیں طرف کھل گیا۔

''آئیں......!'' شلندر نے ہمیں مخاطب کیا اور خود الماری میں داخل ہوکر اندھیرے میں مدغم ہوگیا۔ ہلکی سی چیخ کی آواز ابھری اور اندھیرا روشنی میں بدل گیا۔ غالباً شلندر نے کوئی بٹن پش کیا تھا۔ ہم سب اندر داخل ہوگئے تو مہر جی نے عقب میں الماری والا دروازہ بند کر کے باقاعدہ چٹخنی چڑھا دی۔

یہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس کے ایک طرف کونے سے سنگی سیڑھیاں نیچے کہیں اندھیرے میں گم ہو رہی تھیں۔ شلندر آگے بڑھ کر سیڑھیاں اترنے لگا۔ ہم نے بھی اس کی تقلید کی۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے اس نے دائیں ہاتھ کی دیوار سے ایک اور بٹن پش کیا اور وہ تہہ خانہ روشنی سے چمک پڑا۔ تقریباً پچیس زینے طے کرنے کے بعد ہم ایک جہان حیرت میں پہنچ گئے۔

یہ ایک ہال کمرہ تھا جس میں انتہائی دبیز کارپٹ بچھا ہوا تھا جس پر قدم رکھتے ہی یوں احساس ہوا کہ ابھی گردن تک دھنس جائیں گے۔ ایک طرف دیوار کے ساتھ قطار کی صورت الماریاں نظر آ رہی تھیں تعداد میں وہ سات تھیں جن میں سے تین تو مکمل سٹیل کی تھیں جب کہ چار میں شیشے لگے ہوئے تھے اور ان میں کتابیں سجی ہوئی تھیں۔

دوسری طرف کی دیوار میں مختلف اسکرینیں نظر آ رہی تھیں جن کے نیچے ایک طویل ٹیبل تھی جس میں مختلف کلر کے بٹن، ہیڈ فون، مائیک تھے۔ ایک طرف تین چار رنگوں کے ٹیلی فون سیٹ پڑے تھے۔ اس ٹیبل کے سامنے چار ریوالونگ چیئرز تھیں۔

تھوڑا ہٹ کر ایک جہازی سائز ٹیبل تھی جس پر تین کمپیوٹر رکھے تھے۔ ان کے برابر دو اسپیکرز اور تین پرنٹر پڑے تھے۔ کچھ فائلیں تھیں، ٹیبل کے بائیں ہاتھ انتہائی نفیس صوفے سجائے گئے تھے۔ عقبی طرف دیوار میں ایک دروازہ تھا اور چوتھی دیوار میں دو دروازے نظر آرہے تھے۔ شلندر نے کیا کیا اکٹھا کر رکھا تھا۔

''یہ ہے جی ہمارا مقبرہ......!'' شلندر نے ہم سب سے مخاطب ہو کر کہا۔

''یہ تو کوئی سائنس ریسرچ سنٹر معلوم ہوتا ہے۔ حیرت ہے کہ اتنا جدید سیٹ اپ اور اتنا قدیم نام۔'' عارب نے کہا۔

شلندر ٹیبل والی کرسی پر بیٹھ گیا اور ہم برابر والے صوفے پر...... ڈاکٹر عقیل، اور عارب صوفے پر تھے ہمارے دائیں ہاتھ والے صوفے پر مہر جی بیٹھ گئی اور بائیں ہاتھ والے پر پروفیسر اور اختر یعنی وہ اور مہر جی ایک دوسرے کے مقابل تھے۔

شلندر نے ایک کمپیوٹر آن کیا اور مانیٹر کا رخ قدرے ہماری طرف کر دیا اور خود دوسرا کمپیوٹر آن کر کے اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ کچھ دیر بعد وہ دوبارہ پہلے کی طرف متوجہ ہو گیا اس نے ماؤس سنبھالا اور پروگرامنگ چیک کرنے لگا۔ چند لمحوں بعد ایک فائل سامنے آگئی۔ ہمیں بالکل واضح دکھائی دے رہا تھا۔ فائل نیم تھا ''دی سرچ آف ممی'' (The search of Mummy) شلندر نے اپنی جگہ اسے اٹھ کر دیوار سے متصل ٹیبل کے سامنے سے مختلف بٹن پریس کرنے لگا سب سے پہلے وسط کی اسکرین روشن ہو گی اور اس میں وہی چوکور خانے دکھائی دینے لگے جو ٹیبل پر آن کمپیوٹر میں دکھائی دے رہے تھے پھر یکے بعد دیگرے اس اسکرین کے دائیں بائیں دو دو اسکرینیں روشن ہو گئیں مگر ان پر کوئی منظر نہیں تھا۔ شلندر نے ایک نظر ان کی طرف دیکھا اور مطمئن انداز میں سر جھکا کر دوبارہ کچھ بٹن پریس کر دیئے۔

''شکیل صاحب......! ملاحظہ کریں......!'' ساتھ ہی کرسی گھومی اور اس نے آدھا رخ ہماری جانب کر لیا۔ اس کا بایاں ہاتھ بدستور ٹیبل پر تھا۔ دائیں طرف کی اوپر اسکرین نے جھماکا سا لیا اور اس پر چند الفاظ واضح ہو گئے۔ ایک طرف کونے میں لکھا تھا۔

(تابوت کی تحریر)

''مریاقس''

حرماں نصیب تاں کی حرماں نصیب بیٹی

''مریاقس''

جو مردہ ہے نہ زندہ ہے

پروفیسر بے اختیار بول پڑے۔

''یہی ہے...... سو فیصدی یہی ہے...... یہی عبارت تابوت پر باریک ہیرے جڑ کر رقم کی گئی تھی۔ بلاشبہ یہ وہی تحریر ہے تابوت والی۔''

شلندر نے ٹیبل پر ایک سبز بٹن پر ہلکا سا دباؤ ڈالا اور وہ تحریر اوپر چلی گئی اور چند اور الفاظ سکرین پر دکھائی دینے لگے۔

(مجسمے کی تحریر)

''اے مسیحا......!''

''اے موت کو شکست دے کر انسان کو دوبارہ زندہ کر دینے والے، تیری نگاہِ مقدس جسموں کے اندر تک دیکھنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ تو ہی ہے۔''

''کہ تیرے سوا کوئی دوسرا تابوت اور مجسمے تک کبھی نہیں پہنچ پائے گا۔ میں تجھے خبر کرتی ہوں کہ یہ مجسمہ محض مجسمہ ہی نہیں ہے بلکہ اس کے اندر ایک زندہ وجود ہے میری لختِ جگر

''مریاقس''

وہ سو رہی ہے۔ عذاب جھیل رہی ہے محض......''

یک دم عبارت ختم ہوگئی۔

''آگے......!'' میں نے مضطرب انداز میں کہا۔

''بس یہی تحریر تھی۔'' شلندر نے ایک بٹن پریس کیا اور وہ تحریر اسکرین سے غائب ہوگئی۔

میں نے پروفیسر کی طرف رخ کیا۔

''پروفیسر......! کیا......کیا آپ کو یاد ہے کہ مجسمے پر اور کیا تحریر تھی......؟''

''نہیں......!'' پروفیسر نے نفی میں سر ہلایا۔

''میں نے اتنا ہی ترجمہ کیا تھا کہ مجھے معلوم ہوا کہ انتظامیہ کے کچھ آفیسر آئے ہیں اور ڈاکٹر شکیل سے ملنا چاہتے ہیں۔ تم اس وقت آئی سی یو میں بے ہوش پڑے تھے، سو میں تمہارے پاس آ گیا تھا بعد میں تمہیں بھی علم ہے کہ یہ کاغذ تابوت کے ساتھ ہی چوری ہو گئی تھے۔'' پروفیسر کے جواب پر میرے ہونٹ سختی سے بھینچ گئے۔

میں نے بہت زیادہ بے چینی محسوس کی اس مختصر سی تحریر کے مفہوم سے اتنی تو سمجھ آتی تھی کہ اشارہ میری طرف ہی ہے مگر بہت سے جواب طلب سوال ایسے تھے جو میری ذات میں انتشار بپا کر گئے تھے۔ وثوق کے ساتھ لکھا گیا تھا کہ

''مجھے معلوم ہے کہ یہ تو ہی ہے کہ تیرے سوا کوئی دوسرا اس تابوت اور مجسمے تک کبھی نہیں پہنچ پائے گا۔''

یقیناً یہ تحریر یوسا کی طرف سے تھی ہزاروں سال قبل انہیں میرے متعلق علم ہو گیا تھا۔ مجھ سے پہلے جو بوڑھا وہاں کھدائی کروا رہا تھا وہ خوفزدہ ہو کر کامیابی سے پہلے ہی بھاگ نکلا تھا اور...... اور یوساف جو مجھ سے پہلے اہرام میں داخل ہوا تھا وہ بھی تابوت تک نہیں پہنچ سکا تھا۔ مگر اصل کہانی کا ابھی تک کوئی اندازہ نہیں تھا کہ مریاقس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ ہزاروں سال قبل اسے کیا حادثہ پیش آیا......؟ وہ کس عذاب کا شکار ہے اور میں...... میں اسے کسی عذاب سے کس طرح نجات دلا سکتا ہوں......؟ تجسس نے میری نس نس میں اضطراب جگا دیا تھا۔ میں مریاقس سے ایک شدید قسم کا قلبی تعلق محسوس کر رہا تھا اور میں خود اپنی اس کیفیت پر حیران و ششدر تھا۔

''شکیل صاحب......!'' شلندر کی آواز پر میں چونک کر اس کی جانب متوجہ ہو گیا۔

''پریشان نہ ہوں۔ ہم بہت جلد وہ تابوت ممی سمیت راج محل سے نکال لائیں گے۔''

''ہوں......!'' میں نے ایک گہری سانس لی۔

''مجھے یقین ہے شلندر صاحب......! کہ آپ جو کہہ رہے ہیں ویسے ہی ہوگا۔''

''لگتا ہے کہ آپ اس تابوت اور اس میں موجود ممی کے لئے بہت کونشیئس ہیں۔''

''آپ درست کہہ رہے ہیں شلندر صاحب......! اس ممی کے ساتھ میری سانسوں کی ڈور لپٹی ہوئی ہے۔''

''شلندر......! اب یہ بتاؤ کہ ہمیں آگے کیا کرنا ہوگا......؟'' ڈاکٹر عقیل نے کہا۔

''آج رات تو آپ لوگ آرام کریں، صبح ہم ریاست رام پور جائیں گے۔ شکیل صاحب......! ممی کے لئے میری توقع سے زیادہ بے کل ہیں اب ہمیں جلد از جلد ممی والا تابوت حاصل کرنا ہے۔''

''انکل......! کیا آپ خود بھی رام پور چلیں گے......؟'' مہر جی نے شدید حیرت سے کہا۔

''ہاں......! یہ مشن میں خود پورا کروں گا......تم ایسا کرو ایک ایک کپ کافی اور پلا دو۔'' مہر جی اٹھی سامنے کی دیوار پر نظر آنے والے دو دروازے میں سے ایک دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگئی۔

''جب تک کافی آتی ہے میں آپ لوگوں کو راج محل کے متعلق بریف کیے دیتا ہوں۔''

شلندر نے کہا اور ایک بار پھر مختلف بٹن پریس کرنے لگا۔ درمیانی اسکرین پر ایک خوب صورت اور پرشکوہ محل کی عمارت نظر آنے لگی۔

''یہ ہے راج محل......!'' شلندر نے کہا۔ وہ بدستور اپنے سامنے موجود ٹیبل

کی جانب متوجہ تھا۔ باقی چاروں اسکرینوں پر بھی مختلف مناظر آ گئے۔

''یہ پہلی اسکرین پر محل کے عقبی حصے اور پائین باغ کا منظر ہے۔ تہہ خانے کو جانے والا واحد راستہ مہاراج کی خواب گاہ سے جاتا ہے اور مہاراج کی خواب گاہ کی کھڑکی پائین باغ میں کھلتی ہے۔ دوسری اسکرین میں محل کا ایک بغلی گوشہ ہے جس میں ملازموں کے رہائشی کوارٹر دکھائی دے رہے ہیں۔ تیسری اسکرین میں محل کا سامنے والا حصہ ہے صدر دروازے پر چوبیس گھنٹے دو مسلح پہرے دار موجود رہتے ہیں۔ ان دو کے علاوہ بیسیوں پہرے دار اور ہیں جو پریت آتماؤں کی مانند محل کے چاروں اطراف چکراتے رہتے ہیں۔

محل کے خفیہ راستوں کے علاوہ محل کے پانچ دروازے ہیں۔ خفیہ راستوں کے متعلق ابھی وشواس سے کچھ نہیں کہا جا سکتا...... اور یہ چوتھا منظر مہاراج کی خواب گاہ کے دروازے کا ہے یہاں بھی چوبیس گھنٹے دو دربان موجود رہتے ہیں۔ محل کی عمارت کا آخری حصہ زنان خانے کا ہے اور محل کا بایاں حصہ مہمانوں کے رقص و سرور کی محفلوں کے لئے مخصوص ہے۔''

مہر جی ایک ٹرے میں کافی کے کپ رکھ لائی تھی سو چند لمحوں کے لئے ہمارا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ ہم نے ایک ایک کپ اٹھا لیا۔ شلندر کو کپ پکڑانے کے بعد مہر جی ایک کپ سنبھال کر اپنی جگہ بیٹھ گئی تو شلندر دوبارہ گویا ہوا۔

''اب ذرا راج محل کے باسیوں سے تعارف حاصل کرتے ہیں۔'' شلندر نے مسکراتے ہوئے کہا اور دوبارہ بٹنوں کی جانب متوجہ ہو گیا۔

''درمیانی اسکرین پر ایک ساتھ پینسٹھ سالہ شخص کا چہرہ آ گیا۔ انتہائی گھنی اور موٹی موٹی بھنویں، ہلکی ہلکی کھچڑی داڑھی، موٹے اور بھدے ہونٹ، آنکھوں میں خباثت اور چہرے پر کرختگی کے تاثرات جیسے ثبت ہو کر رہ گئے تھے۔ اس کی زلفیں اس کے کندھوں کو چھو رہی تھیں۔

''یہ ہیں ''مہاراج رام پرشاد''۔ ریاست رام پور کے مہاراجہ۔'' شلندر نے چند بٹن اور پریس کئے تو باقی چاروں اسکرینوں پر بھی چہرے دکھائی دینے لگے۔

''چار اہم عورتیں۔'' شلندر نے ہماری طرف رخ بدلتے ہوئے کہا اور پھر پہلی اسکرین کی طرف اشارہ کیا۔

''مہارانی'' ''کملاوتی'' جس کا کہا مہاراج بھی پوری توجہ سے سنتے ہیں۔ نیچے مہاراج کی سسٹر ''نرتا دیوی'' ہر دل عزیز شخصیت۔ تیسرے نمبر پر ''امرتا'' مہاراج کی رکھیل، جس کی اجازت کے بغیر سانس لینا بھی مہاراج پاپ سمجھتے ہیں۔ بہت شاطر اور مکار عورت ہے۔ چوتھے نمبر پر مہاراج کی چھوٹی بیٹی ''پاروتی'' سبھی کی لاڈلی اور سر چڑھی۔'' شلندر نے رخ بدل کر چند بٹن پریس کیے اور عورتوں کی جگہ چار مردوں کے چہرے آ گئے۔

''یہ پہلے نمبر پر ''شام پرشاد جی'' ہیں، مہاراج کے بعد راج پاٹ پر انہی کا حق ہوگا۔ انتہائی شرابی اور کم ظرف سا انسان ہے۔ آگے مہاراج کا سر چڑھا ''خواجہ سرا'' ہے۔ آگے ''بھیم سنگھ'' محل کے اندرونی انتظامی امور اس کے ذمے ہیں۔ بہت کڑک قسم کا......'' ایک کرخت سی گھنٹی کی آواز نے شلندر کو جملہ پورا نہیں کرنے دیا۔ شلندر نے چونک کر دائیں طرف دیکھا۔ بیل ایک بار پھر بجی۔ شلندر نے ہاتھ بڑھا کر سرخ ٹیلی فون کا ریسیور اٹھا لیا۔

''بولو......!'' اس نے ریسیور اٹھا کر کہا۔ کچھ دیر سنتا رہا پھر گویا ہوا۔ اس نے مزید کچھ کہا...... کچھ دیر کی خاموشی۔

''ٹھیک ہے......! ڈائننگ ہال میں پہنچا دو۔'' پھر اس نے ریسیور رکھ دیا۔

''انکل......! خیریت ہے......؟'' مہر جی نے فوراً پوچھا۔ شلندر کے چہرے پر قدرے فکرمندی کے تاثرات پھیل گئے تھے۔

''کوئی شخص چوکیدار کو میرے نام کا پیکٹ دے کر گیا ہے...... وہ ڈائننگ ہال میں پہنچ رہا ہے...... تم جا کر یہیں اٹھاؤ لاؤ۔''

''او کے......!'' مہر جی فوراً اٹھ کر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گی۔ اور شلندر کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ مہر جی کے آنے تک ہمارے درمیان کوئی بات نہ ہوئی۔ تقریباً پانچ منٹ بعد جب وہ واپس آئی تو اس نے کوئی دو مربع فٹ گتے کا

ایک کارٹون اٹھا رکھا تھا۔ وہ اس نے ٹیبل پر لا رکھا۔ شلندر اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کارٹون کے قریب پہنچا تو ہم بھی اٹھ کر ٹیبل کے قریب جا کھڑے ہوئے۔

اس کے اوپر جلی حروف میں لکھا ہوا تھا۔

''عظیم جاسوس مہاراج شلندر سرائے ہر یجہ کے لئے......!''

اس کے نیچے لکھا تھا۔

''آئی وِش یو......!'' (I wish you)

شلندر نے ٹیپ ہٹائی اور اس کا منہ کھول دیا۔ اس کے اندر بھی کوئی ڈبہ نما چیز تھی جس پر کالے رنگ کا کپڑا لپٹا ہوا تھا۔ شلندر نے ایک لمحے کو سوچا اور وہ بھی ڈبہ نکال لیا۔ مہر جی نے کارٹون اٹھا کر ایک طرف پھینک دیا اور شلندر نے وہ ڈبہ ٹیبل پر رکھ دیا۔ کوئی ٹھوس اور سخت چیز تھی شاید لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ شلندر نے اس کے نیچے سے کپڑے کو نکالا اور کپڑا ہٹا دیا۔

اُف توبہ......! خدا کی پناہ......! کتنا بھیانک نظارہ تھا وہ......کس قدر قبیح منظر تھا...... بے اختیار میں جھرجھری سی لے کر رہ گیا۔ سب کے چہرے فق رہ گئے تھے۔ خود شلندر اور مہر جی پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

وہ ایک شیشے کا خوب صورت کیس بنا ہوا تھا اور اس کے اندر دو خون آلودہ انسانی سر رکھے ہوئے تھے۔ کندھوں کے ساتھ سے اتارے گئے تھے۔ گردن میں سے شہ رگ بھی دکھائی دے رہی تھی۔ دونوں سر جوان آدمیوں کے تھے۔ ان کی آنکھیں خوفناک حد تک پھیلی ہوئی تھیں اور زبانیں دانتوں میں دبی ہوئی تھیں۔

کیس کی نچلی سطح خون سے رنگین تھی اور اطراف کے شیشوں پر بھی سرخ سرخ دھبے پڑے ہوئے تھے۔ کیس کے اوپر ایک سفید لفافہ کسی چیز کی مدد سے چپکایا گیا تھا جس پر شلندر کا نام لکھا ہوا تھا۔ کچھ دیر کے لئے ہم بھی سکتے کی سی کیفیت کا شکار ہو گئے۔ یقیناً شلندر اور مہر جی کو تو توقع نہ تھی کہ اس پیکٹ میں کچھ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ انہیں کتنا زبردست شاک پہنچا تھا اس کا اندازہ ان کے چہروں کے تاثرات دیکھ کر ہو رہا تھا۔

''خون......!'' پروفیسر زیر لب بڑبڑائے۔ اس داستان کا آغاز ہی موت اور خون سے ہوا تھا...... کوئی مانے نہ مانے...... ابھی بہت مریں گے بہت خون بہے گا...... بہت خون بہے گا۔ ان کی بڑبڑاہٹ اتنی مدھم تھی کہ کوئی بھی ان کی جانب متوجہ نہیں ہوا۔

شلندر نے خود کو سنبھالا اور کیس پر چپکا ہوا لفافہ اٹھا لیا۔ اس نے لفافہ چاک کیا اور اس میں موجود کاغذ نکال کر پڑھنے لگا۔ وہ خط پڑھنے کے بعد اس نے مہر جی کی طرف بڑھا دیا۔ خط پڑھنے کے بعد مہر جی سوالیہ نظروں سے شلندر کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کی سوالیہ نظروں میں چنگاریاں سی بھری ہوئی تھیں۔ شلندر کے جبڑے بھی سختی سے بھینچے ہوئے تھے۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر وہ خط مہر جی کے ہاتھ سے لے لیا۔ وہ شلندر کے نام تھا۔

''مہاراج شلندر رائے ہریجہ......!

نمستے......!

پہلی جیت کی بہت بہت بدھائی ہو۔ اس جیت پر ہماری طرف سے یہ حقیر سا تحفہ سویکار کیجئے۔ بہت بڑھیا کھیل کھیلے ہیں۔ آپ ہمیں بھی ایسے کھیلوں میں بڑا آنند ملتا ہے۔ سات آپ نے مارے تو دو پیادے ہم نے بھی مار ڈالے۔ ہماری آنکھیں تو کھل گئی ہیں وشواس ہے کہ اب آپ بھی آنکھیں کھول کر کھیلیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ ہم کو خبر بھی نہ ہوتی اور آپ ہمیں مات دے جاتے مگر آپ نے اس کڑکتی بجلی کو درمیان میں لا کر غلطی کی۔ وہ محل تک رہتی تو آپ کے حق میں بہتر تھا۔ ہم پورے دیش کو تو نہیں جانتے نا......! مگر باہر کی دنیا میں تو جان پہچان نکل ہی آتی ہے۔ ہے نا......؟ بہرحال کھیل کا آرمبھ (آغاز) ہو گیا ہے۔ آپ کی آئندہ چال کا انتظار رہے گا۔

بھگوان آپ کی سہامتا کرے......!''

(شاہ)

خط میرے ہاتھ سے عقیل نے لے لیا۔ میں نے شلندر کی طرف دیکھا کہ اا

کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔ وہ یک ٹک ٹیبل پر پڑے کیس کو گھور رہا تھا۔ میں بخوبی اندازہ کرسکتا تھا کہ اس وقت اس کی ذہنی کیفیت کیا رہی ہوگی مگر میں کوئی رسمی سا جملہ کہہ کر تکلف کی کوئی دیوار نہیں اٹھانا چاہتا تھا۔ سو خاموشی سے اپنی جگہ واپس بیٹھ گیا۔ باقی کے سب بھی بیٹھ گئے۔ البتہ مہر جی اپنی جگہ کھڑی تھی۔ کچھ دیر بعد اس نے وہ کیس اٹھا کر وہاں سے ہٹانا چاہا تو شلندر جلدی سے بول پڑا۔

''اونہوں...... پڑا رہنے دو۔'' شلندر کی آواز میں غضب کا ٹھہراؤ تھا۔

''تو کیا اب آپ اپنا خون جلاتے رہیں گے......؟'' مہر جی نے کہا۔

''تمہیں کہا نا...... اسے یہیں پڑا رہنے دو...... آؤ...... ادھر آؤ اور اپنی جگہ پر بیٹھ جاؤ......'' مہر جی خاموشی سے اپنی جگہ آ بیٹھی۔ کافی دیر ہمارے درمیان خاموشی رہی یہاں تک کہ بوجھل خاموشی گراں گزرنے لگی تو میں بول پڑا۔

''شلندر صاحب......! مجھے افسوس ہے کہ ہماری وجہ سے آپ کے دو آدمی موت کا شکار ہوگئے۔''

''نہیں......!'' شلندر نے میری بات کاٹ دی۔

''شکیل صاحب......! ایسی تکلفانہ باتیں نہیں کریں۔'' وہ ایک ذرا خاموش ہوا اس کے ہونٹوں پر ایک تلخ مسکراہٹ اتر آئی۔

''کھیل میں ہار جیت تو ہوتی رہتی ہے، پیادے پٹتے ہیں مگر ہار جیت کا فیصلہ اس وقت تک نہیں ہوتا جب تک کسی ایک حریف کو شہ مات نہ ہو جائے...... اس کے بعد باری ہماری ہے اور ہم دو پیادوں کے بدلے سیدھی شہ مات کی چال چلیں گے۔'' شلندر کا لہجہ بہت زہریلا ہوگیا تھا۔

''انکل......! رام پرشاد کی گردن میں اپنے ہاتھوں سے مروڑوں گی۔'' مہر جی نے سلگتے ہوئے لہجے میں کہا تو شلندر کی مسکراہٹ مزید گہری ہوگئی۔

''نہیں بیٹا......! ایسے کھیل جذباتی ہو کر نہیں کھیلا کرتے۔ مہاراج نے مجھے چیلنج کیا ہے اب ہم ڈھائی گھر کی چال چلیں گے اس بار پیادے سامنے نہیں آئیں گے ''سوار'' میدان مارے گا۔'' شلندر نے ایک نظر ہماری طرف دیکھا اور مسکراتے

ہوئے بولا۔

''آپ لوگ اب جا کر آرام کریں۔ عقیل بن عاص...... میرا مشورہ مانیں تو آپ لوگ اب ایک طرف بیٹھ کر کھیل دیکھیں اور مجھے تنہا کھیلنے دیں چند روز...... صرف چند روز میں تابوت اور ممی آپ لوگوں کی تحویل میں ہوگی۔'' عقیل کے بولنے سے پہلے ہی میں بول پڑا۔

''شلندر صاحب......! یہ کسی صورت ممکن نہیں، ہم مصر سے یہاں تک کا سفر طے کر کے صرف بیٹھنے نہیں آئے ہم ہر قدم آپ کے ساتھ طے کریں گے اور اگر آپ ہمیں ساتھ نہیں رکھنا چاہیں گے تو ہم صبح ہی واپس چلے جائیں گے۔''

''شکیل درست کہہ رہا ہے۔ ہم بیٹھ کر کھیل نہیں دیکھیں گے بلکہ تمہارے ساتھ یہ کھیل کھیلیں گے۔'' ڈاکٹر عقیل نے کہا تو شلندر نے کندھے اچکا دیئے۔

''جیسے آپ لوگوں کی مرضی......! فی الحال تو آرام کریں میں نے پورا پلان بدل دیا ہے۔ اب نئی بساط بچھائی ہے اور ابھی مجھے اس پر مہرے ترتیب دینے ہیں۔ صبح ہم رام پور جا رہے ہیں ممکن ہے کہ وہاں پہنچنے کے بعد ہمیں آرام کا ذرا بھی موقع نہ ملے۔''

پھر وہ رخ بدل کر مہر جی سے مخاطب ہوا۔

''مہر......! انہیں ان کے کمروں تک چھوڑ آؤ۔ آج کی رات بے فکری سے گزار لیں۔'' شلندر ہماری طرف دیکھ کر مسکرایا اور ہم سب اٹھ کھڑے ہوئے اور جب جانے کے لئے مڑ کر مہر جی کے پیچھے چلے تو شلندر نے کہا۔

''خدا حافظ......! شب بخیر......!'' بے اختیار میں ٹھٹک کر رک گیا۔ میں نے پلٹ کر حیرت سے شلندر کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا دیا۔ میری متحیر اور سوالیہ نظروں کو دیکھتے ہوئے بولا۔

''میں بنیاد پرست لوگوں میں سے نہیں ہوں، میرا اصول ہے کہ جس رنگ کا کوئی ملے اسے اسی رنگ میں ملوں۔'' اس کی بات کو سمجھتے ہوئے میں نے مسکرا کر قدم آگے بڑھا دیئے۔ ہم مقبرے سے باہر نکل آئے ہمارے کمروں تک مہر جی

ہمارے ساتھ آئی جب وہ واپس جانے لگی تو اس نے پلٹتے ہوئے اختر کی طرف دیکھا، اختر بھی کچھ کہنا چاہتا تھا لاشعوری طور پر مہر جی کے قدم رک گئے جیسے اسے یقین تھا کہ اختر اپنی عادت کے مطابق ضرور کوئی نہ کوئی شگوفہ چھوڑے گا مگر وہ نجانے کیا سوچ کر مہر جی کی طرف دیکھتے ہوئے صرف مسکرا کر رہ گیا اور مہر جی برا سا منہ بنا کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

عارب، عقیل اور اختر تو ساتھ والے کمرے میں چلے گئے، میں اور پروفیسر اسی کمرے میں لیٹ گئے۔ ہمارے درمیان کوئی خاص بات نہ ہوئی لیکن نیند جلد نہ آئی غالباً نصف رات گزر چکی تھی جب نیند کی دیوی مہربان ہوئی۔

صبح ابھی دن کا اجالا نہیں پھیلا تھا ایک تیز گھنٹی کی آواز نے ہماری نیند غارت کر دی۔ میرے ساتھ ساتھ پروفیسر بھی بیدار ہو گئے۔ گھنٹی کی آواز ایک تسلسل کے ساتھ کمرے ہی کے کسی گوشے سے بلند ہو رہی تھی مگر یہ سمجھ نہ آ رہی تھی کہ یہ آواز کہاں سے آ رہی ہے کچھ دیر بعد آواز آنا بند ہو گئی۔ ٹھیک اسی وقت دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور ایک پختہ عمر عورت دروازہ کھول کر اندر آ گئی۔ میں اسے پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ وہ ہماری طرف دیکھ کر مسکرائی اور جب بولی تو میں ششدر رہ گیا۔

''آپ لوگ فریش ہو جائیں۔ کچھ دیر بعد ہم رام پور کے لئے روانہ ہو رہے ہیں۔'' وہ آواز سو فیصدی مہر جی کی تھی۔ ٹھیک اسی وقت اختر درمیانی دروازے سے اندر داخل ہوا۔ اس عورت اور اس کی آواز پر ایک لمحے کو وہ ٹھٹکا پھر مسکراتے ہوئے فریفتہ انداز میں بولا۔

''آپ جس روپ میں بھی آئیں گی ہم قبول کریں گے۔'' عورت نے جو یقیناً مہر جی تھی اور جس نے میک اپ میں اپنی اصل صورت چھپا لی تھی بڑی خونخوار نظروں سے اختر کو گھورا۔

''لگتا ہے کہ تم حرام موت مرنا چاہتے ہو۔''

''زہے نصیب......! اگر آپ کے ہاتھوں موت ملے۔'' اختر نے خوش دلی سے کہا۔

''منہ بند رکھو......!''

''آپ کے لئے ہم نے اپنے دل کے دروازے کھول رکھے ہیں۔ کبھی اس دل کو عزت بخشیں ناں......!''

''میں گندے مقامات کو عزت بخشنے کی عادی نہیں۔''

''آپ اپنا شیڈول بتائیں ہم جھاڑو پونچھا کر لیں گے۔'' اختر نے بے ساختہ کہا تو مجھے ہنسی آ گئی۔

''تم انتہائی نامعقول انسان ہو۔''

''آپ نے کب پرکھا......؟''

''بدتمیز......! میں کہتی ہوں بکواس بند کر لو۔''

''پہلے آپ تمیز سکھائیں۔''

''مائی فٹ......!'' مہر جی پاؤں پٹختی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی۔ اختر مسکراتا ہوا آگے بڑھ آیا۔ اس کے عقب میں عقیل اور عارب بھی آ گئے۔ عارب نے ہنستے ہوئے کہا۔

''کیوں......اس بیچاری کو زچ کرنے پر تلے رہتے ہو......؟''

''اس کم بخت دل کے ہاتھوں مجبور ہوں۔'' اختر نے ایک سرد آہ بھری۔

''اور جس دن وہ دل کے ہاتھوں مجبور ہو گئی اس دن تمہاری ہڈی پسلیوں کی کوئی ضمانت نہیں لے گا۔ یہ بھی یاد رکھنا۔''

''وہ کبھی مجھ پر ہاتھ نہیں اٹھائے گی۔'' اختر نے الوہی یقین سے کہا۔

''تم جس قدر اسے زچ کر رہے ہو اس میں ایسی خوش فہمیوں کو نہیں پالو۔''

''یہ خوش فہمیاں نہیں میرا یقین ہے۔''

''تم کیا یہاں لڑکیاں پھانسنے آئے ہو......؟'' ڈاکٹر عقیل نے ناگواری سے کہا۔

''سیدھی سی بات ہے عقیل صاحب......! کہ وہاں مصر میں تو کسی نے ہمیں رشتہ دینا نہیں...... یہاں اگر ہماری دال گل جائے تو آپ کو کیا اعتراض ہے......؟''

''تو ٹھیک ہے...... بھائی......! گلاتے رہو دالیں...... ہم کیوں اعتراض کرنے لگے......؟'' اس کے بعد ہم سب نے باری باری غسل کیا اور ڈریس چینج کر کے بیٹھ گئے۔ وہی کل والی عورت آئی اور ہمیں ڈائننگ ہال تک لے گئی۔

شلندر پہلے سے وہاں موجود تھا مگر گزشتہ رات والے شلندر سے بالکل مختلف۔ اس نے بھی اپنی اصل صورت میک اپ کی تہہ کے نیچے چھپائی ہوئی تھی۔ ناشتے کے بعد وہ ہمیں مقبرے میں لے گیا۔ ہمارے بوتھوں پر اس نے تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ محنت کی اور کافی حد تک ہماری صورتیں بدل گئیں۔ طے یہ پایا تھا کہ شلندر، ڈاکٹر عقیل اور عارب یہاں سے ویگن میں نکلیں گے جبکہ میں، پروفیسر، اختر اور مہر جی ہم لینڈ کروزر میں روانہ ہوں گے اور دونوں گروپ الگ الگ مرکز تک پہنچیں گے۔ ایک طرف کمانڈر شلندر خود تھا۔ دوسری طرف مہر جی، اختر کی ہمراہی کی وجہ سے مہر جی نے کچھ حیل و حجت کی مگر شلندر کے دو الفاظ پر خاموش ہو رہی۔

''مہر......! ہم ایک مہم پر نکل رہے ہیں، پکنک کے لئے نہیں۔ ذہن و دل پر قابو پانا سیکھو۔ تمہارا کمزور پہلو صرف یہی ہے۔'' اس کے بعد وہ کچھ نہیں بولی۔

''آپ سب ذہنی طور پر تیار ہیں......؟'' شلندر نے ہمیں مخاطب کیا۔ اس کا لب و لہجہ بھی تبدیل ہو چکا تھا۔

''پوری طرح......!'' ڈاکٹر عارب نے کہا۔

''ہوں......! مہر......! ہم لوگ نکل رہے ہیں...... ٹھیک پندرہ منٹ بعد تم بھی چل دینا۔''

''اوکے......!'' مہر جی نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ شلندر نے ایک بریف کیف اٹھایا اور ایک بیگ کندھے سے لٹکاتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ ڈاکٹر عقیل اور عارب بھی اس کے ساتھ ہی کھڑے ہو گئے۔ وہ باہر نکل گئے تو مہر جی نے دزدیدہ نظروں سے اختر کی طرف دیکھا۔ وہ لاتعلق ہوا بیٹھا تھا۔ میں نے پروفیسر کی طرف دیکھا۔ وہ قدرے متذبذب نظر آ رہے تھے۔

''پروفیسر......! کیا بات ہے......؟ آپ کچھ پریشان دکھائی دے رہے

ہیں۔'' میں نے انہیں مخاصب کیا۔

''ہاں...... کہہ سکتے ہو۔'' انہوں نے ایک گہری سانس لی۔

''کیا...... کوئی اندیشہ محسوس کر رہے ہیں آپ......؟''

''میں کچھ نہیں کہہ سکتا...... بس میرا وجدان مجھے کسی ان دیکھی مصیبت کا احساس دلا رہا ہے...... ایک...... ایک ایسی مصیبت جس میں ہم الجھنے والے ہیں۔''

''کوئی بات نہیں پروفیسر......! خدا بہتر کرے گا۔''

''خدا کی مرضی......! وہ کیا کرنے والا ہے۔'' پروفیسر نے عجب سے انداز میں کہا۔

جب ہم لینڈ کروزر میں بیٹھ کر نکلے اس وقت مشرق سے شاہ خاور سر اٹھا رہا تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ میں نے سنبھال لی تھی۔ پروفیسر میرے برابر بیٹھے تھے۔ اختر اور مہر جی عقبی سیٹوں پر۔ وہ مجھے راستوں کا بتاتی جا رہی تھی اور میں گاڑی کو اڑائے لئے جا رہا تھا۔

تقریباً دس منٹ کی ڈرائیونگ کے بعد میں نے نوٹ کر لیا کہ ہم کسی مخصوص سمت سفر طے نہیں کر رہے بلکہ مہر جی یونہیں ادھر ادھر گاڑی بھگوا رہی ہے۔ غالباً وہ تعاقب کا اندازہ لگا رہی تھی جب اسے پوری طرح اطمینان ہو گیا کہ کوئی ہمارا تعاقب نہیں کر رہا تو اس نے مطمئن انداز میں کہا۔

''ٹھیک ہے......! اب رائٹ ہینڈ ٹرن لیں اور سیدھے چلتے رہیں۔'' میں نے اس کی ہدایات پر عمل کیا اور گاڑی کو دائیں ہاتھ آنے والی سڑک پر ڈال دیا۔ یقیناً یہ سڑک شہر سے باہر جاتی تھی۔ کیونکہ اس سڑک پر زیادہ تر ہیوی ٹرانسپورٹ ہی آ جا رہی تھی۔ آدھے گھنٹے بعد ایک اور سڑک پر ٹرن لیا گیا۔

''بس اب سیدھے چلتے جائیں۔'' مہر جی نے کہا اور میں نے سر ہلا دیا۔ اتنی دیر اختر پہلی بار مہر جی سے مخاطب ہوا۔

''مہر جی......! آپ کا پورا نام کیا ہے......؟'' اس کا انداز بہت سنجیدگی لئے ہوئے تھا۔

''کیوں......؟''

''بس یونہی...... جاننا چاہتا ہوں۔''

''تمہیں میرے نام سے کیا مطلب......؟''

''مہر جی......! میں تسلیم کرتا ہوں کہ میں اپنی فضول باتوں سے بہت زیادہ پریشان کرتا ہوں اگر میرے الفاظ سے آپ کی دل آزاری ہوتی رہی ہے تو میں معذرت خواہ ہوں کہ میرا ایسا کوئی مقصد نہیں تھا۔''

خلاف توقع اختر سنجیدہ لہجے میں بول رہا تھا اور یہ انہونی تھی۔ میں نے بیک مرران کی جانب سیٹ کر لیا۔ مہر جی بڑی گہری نظروں سے اس کے تاثرات کا جائزہ لے رہی تھی۔

''میں ایسی باتیں محض اس لئے کرتا رہا ہوں کہ طبیعت ذرا فریش رہے۔ ذہن و دل پر کوئی بوجھ نہ پڑے۔ میری آپ سے درخواست ہے کہ آپ ان باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے رویے میں ذرا لچک پیدا کریں۔ کیونکہ آپ کے ایسے سرد مہر اور کرخت رویے سے میری دل آزاری ہوتی ہے۔ رہی بات یہ کہ مجھے آپ کے نام سے کیا مطلب تو میرا خیال ہے کہ میں نے ایسی کوئی بات یا خواہش نہیں کی جو غیر اخلاقی ہونے کے باعث آپ کی ناگواری کا باعث بنے۔'' اختر بڑا نیک پروین بنا بیٹھا تھا۔

''سوری......! جب انکل نے میرا نام آپ لوگوں کو بتانا مناسب نہیں سمجھا تو میں بھی نہیں بتا سکتی۔'' مہر جی نے سپاٹ انداز میں کہا۔

''اچھا چلیں...... یہ بتائیں کہ آپ نے مجھ میں کوئی ایسی بری عادت دیکھی جس سے آپ کو یہ اندازہ ہوا ہو کہ میں ایک بدقماش انسان ہوں......؟ یا میرے کردار میں کوئی خامی نظر آئی ہو......؟ یا...... میں نے کوئی غیر اخلاقی اور گری ہوئی بات یا حرکت کی ہو آپ سے......؟''

''نہیں......!'' مہر جی کا لہجہ محتاط تھا۔

''پھر براہ کرم میرے ساتھ اپنا رویہ درست کر لیں۔ میں بھی اب کوئی ایسی

بات نہیں کروں گا جو آپ کو ناگوار گزرے۔'' مہر جی چند لمحے اختر کو نظروں ہی نظروں میں ٹٹولتی رہی پھر بولی۔

''لگتا ہے کہ اب تم انسانوں کی جون میں آ رہے ہو......؟''

''شکریہ......! اب ایک سوال کا جواب دیں۔''

''بولو......!''

''اگر میں آپ کو ''پرپوز'' کروں تو آپ غصہ تو نہیں ہوں گی......؟''

''شٹ اپ......!'' مہر جی یک دم بھڑک اٹھی۔ اور اختر اپنی سیٹ پر اچھل کر رہ گیا۔

''عجیب تماشا ہے...... ذرا دھیمے سے شٹ اپ کہہ لیں۔ کانوں کے پردے کیوں پھاڑ رہی ہیں......؟ میں نے شادی ہی کا تو پوچھا ہے......کوئی ایٹم بم تو آپ کی گود میں نہیں ڈال دیا......؟''

''تم کتے کی دم سے بھی زیادہ ڈھیٹ ہو......کبھی انسان کے بچے نہیں بنو گے۔'' مہر جی نے بھنائے ہوئے انداز میں کہا۔ بے اختیار میں مسکرا دیا۔ مجھ سے پہلے ہی اختر کی سنجیدگی ہضم نہیں ہو رہی تھی۔

''اب میں خود انسان بننا چاہتا ہوں، بچپنا گزر گیا ہے میرا...... انسان بننے میں، کیا آپ میری کچھ مدد کریں گی......؟'' اختر کا جملہ بڑا گہرا معنی خیز تھا۔

مہر جی صرف اسے گھورتی رہی۔

''کمال ہے......! آپ ایسے کیوں گھور رہی ہیں مجھے......؟ کیا محبت کرنا یا شادی کرنا کوئی گناہ یا جرم ہے......؟''

''جو جی میں آئے کرو مگر مجھ سے اس طرح کی بیہودہ بکواس نہیں کرو...... سمجھے......؟''

''تو پھر کس قسم کی بکواس کروں......؟ آپ ہی بتا دیں......!''

''یہ سڑک چھاپ عاشقوں والی حرکتیں مجھے زہر سے بھی زیادہ بری لگتی ہیں۔''

''آپ کو عاشقوں کی کون سی کیٹگری پسند ہے......؟ آپ بتا دیں میں اپنی ٹیوننگ کروالوں گا۔''

''تم یہ عاشقی معشوقی کی بکواس ختم کر دو۔''

''لگتا ہے کہ آپ ''بکواس فوبیا'' کی مریضہ ہیں تبھی آپ کو میری ایسی فصیح و بلیغ گفتگو بھی بکواس معلوم ہو رہی ہے۔ آپ کو تو میرا شکرگزار ہونا چاہئے، خوش ہونا چاہئے کہ کوئی عقل کا اندھا آپ سے اظہار محبت کر رہا ہے۔ ورنہ کون پاگل کا پتر ہوگا جو خود سے، اپنی ہڈیوں پسلیوں سے دشمنی کرتا ہو آپ جیسی ''بروسلا'' قسم کی لڑکی سے اظہار محبت کرے گا اور آپ ہیں کہ الٹا مجھے جھاڑ جھنکار پلا رہی ہیں۔ افسوس ہے...... بخدا......! ڈوب مرنے کا مقام ہے۔'' اختر نے حد درجہ اداسی سے کہا۔

''تو ڈوب مرو کہیں...... احسان ہوگا تمہارا مجھ غریب پر۔''

''یہ ڈوب مرنے کی بات میں نے اپنے لئے نہیں کہی۔'' اختر نے جیسے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔ مہر جی دانت کچکچا کر رہ گئی۔ وہ ضبط کر رہی تھی اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اختر کو چلتی گاڑی سے اٹھا کر باہر پھینک دیتی۔ اختر خاموش ہو گیا۔

دو گھنٹے کی مسافت کے بعد مہر جی نے گاڑی بائیں رخ موڑنے کو کہا۔

''یہ سڑک ہمیں رام پور لے کر جائے گی۔'' میں نے گاڑی اس سڑک پر ڈال دی۔ سامنے کچھ دوری پر پہاڑ دکھائی دے رہے تھے۔ اچھا خاصا پہاڑی سلسلہ معلوم ہو رہا تھا۔

''آگے پہاڑی علاقہ شروع ہو رہا ہے اور یہاں سے ریاست رام پور قریباً بارہ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ ریاست ایسے ہی پہاڑوں میں گھری ہوئی ہے۔ رام پور سے پہلے ایک قصبہ آتا ہے جسے ''بستی گجہ'' کہا جاتا ہے۔ گاڑی ہم وہاں چھوڑ دیں گے۔ ہمارا آدمی وہاں پہلے سے موجود ہوگا۔ اس سے آگے کوئی چار کلومیٹر کا سفر ہے جو ہم ''لوکل'' بس کے ذریعے طے کریں گے۔'' مہر جی نے کہا۔

یہ سڑک تقریباً ویران تھی، کوئی بھولی بھٹکی گاڑی دکھائی دے رہی تھی اسی لئے

میں اچھی خاصی سپیڈ سے ڈرائیو کر رہا تھا۔ چار پانچ منٹ میں ہی ہماری گاڑی پہاڑی سلسلے میں داخل ہوگئی۔ بھورے رنگ کے بلند و بالا پہاڑ جو قدرتی طور پر جھاڑیوں سے لدے ہوئے تھے۔

میری دھڑکنوں کی رفتار تیز ہوتی جا رہی تھی۔ مریاقس کا وجود مجھ سے چند میل کی دوری پر تھا اور ہر لحظہ یہ فاصلہ سمٹتا جا رہا تھا۔ صرف چند روز کی بات تھی پھر وہ میری دسترس میں ہوتا۔ ایک خمار سا تھا جو میرے وجود کو اپنے حصار میں جکڑتا جا رہا تھا۔

اچانک ایک دھماکہ ہوا اور اسٹیئرنگ میرے ہاتھوں میں سے خود بخود دائیں طرف کو گھوم گیا۔ کسی ان دیکھے دشمن نے گولی چلا کر گاڑی کا عقبی دایاں ٹائر برسٹ کر دیا تھا۔ مجھ سمیت کوئی بھی اس افتاد ناگہانی کے لئے تیار نہ تھا۔ اس لئے ہم سبھی بوکھلاہٹ کا شکار ہوگئے۔ میری ذرا سی غفلت سب کو موت کے حوالے کر سکتی تھی کیونکہ گاڑی برق رفتاری سے آگے بڑھ رہی تھی ایسے میں اگر میں بریک لگانے کی کوشش کرتا تو گاڑی الٹ جاتی اور کم از کم آٹھ دس پلٹیاں کھاتی ہوئی کسی پہاڑ سے ٹکرا جاتی اور ہم سب کا گاڑی کے اندر ہی قیمہ بن جاتا۔

گاڑی سڑک سے نیچے اتر کر پتھروں میں گھس گئی مگر میں نے بریک پر پاؤں نہیں رکھا البتہ ایکسی لیٹر سے پاؤں اٹھا لیا، اور ہیوی انجن لینڈ کروزر پتھروں پر اچھلتی ڈگمگاتی آگے بڑھتی چلی گئی۔

مجھے کسی قدر اندازہ تھا کہ گولی کس طرف سے چلائی گئی ہے اس لئے میں نے گاڑی کا رخ قدرے ترچھا کر دیا۔ یہ پہاڑ قدرتی طور پر اس انداز میں کھڑا تھا کہ نوے کا زاویہ بنا رہا تھا اور دوسری سمت کونے کے ساتھ سے ایک اور پہاڑ سے متصل ہوتا تھا جو محض چند قدم کے فاصلے پر تھا اور میں نے گاڑی کا رخ اسی سمت کر رکھا تھا۔ اس طرح ان دو پہاڑوں کے اتصال سے دونوں کے درمیان ایک خلیج کی سی صورت پیدا ہوگئی تھی۔ یہ خلیج دونوں پہاڑوں کے اندر کافی آگے تک چلی گئی تھی۔

ہم سب وقتی طور پر اس خلیج نما درے میں گھس کر خود کو اپنے دشمن کی گولیوں

سے محفوظ کر سکتے تھے۔ میں نے آئینے میں سے عقبی سیٹوں کا جائزہ لینا چاہا، اسی وقت گاڑی ایک بڑے پتھر سے اچھلی۔ بس ایک جھلک...... میں ایک جھلک ہی دیکھ پایا تھا۔ اختر مضبوطی سے سیٹ تھامے ہوئے تھا جبکہ مہر جی کے ہاتھ میں پسٹل تھا اور اس کا رخ دائیں طرف کے شیشوں کی جانب تھا۔ غالباً وہ فائر کرنے والے کو دیکھ چکی تھی۔ یہ سب میں نے ایک ہلکی سی جھلک کے دوران ہی دیکھ لیا تھا۔ آئندہ ہی پل مہر جی نے کسی پر گولی چلا دی۔ پتھروں میں سے اتر آنے کے باعث گاڑی کی سپیڈ از خود بہت کم ہوگئی تھی۔ پہاڑ بالکل سامنے آگیا تھا جب محض چند فٹ کا فاصلہ رہ گیا تو میں نے بریک پر پاؤں رکھ دیا۔

ایک جھٹکا، ایک ہلکا سا دھماکہ، گاڑی پہاڑ سے ٹکرا گئی۔ اس کے سیف گارڈ اور بونٹ وغیرہ پچک گئے۔ جھٹکے کے باعث پروفیسر اچھلے، ان کی ڈیش بورڈ سے اچھی خاصی ٹکر ہوگئی تھی۔ میں نے اترنے میں دیر نہیں کی اور ساتھ ہی چیختے ہوئے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کیا۔

''اترو......! جلدی اترو......!'' مہر جی اور اختر تو جیسے گاڑی رکنے کے ہی منتظر تھے۔ پروفیسر بھی پیشانی مسلتے ہوئے اتر آئے۔ ٹکر کی وجہ سے ان کی پیشانی پر آلو سا ابھر آیا تھا۔

''ادھر اس طرف......!'' میں نے تیز لہجے میں کہا اور خلیج نما درے کی جانب دوڑ پڑا۔ وہ سب بھی میرے پیچھے تھے۔ دونوں پہاڑوں کے درمیان یہ راستہ کوئی نصف فرلانگ تک اندر چلا گیا تھا اور آگے جا کر دونوں پہاڑ آپس میں مل گئے تھے۔ چند قدم دوڑنے کے بعد مہر جی کسی خیال کے تحت رک گئی۔ اس کے رکتے ہی ہم تینوں بھی رک گئے۔ یہاں ہم تین اطراف سے محفوظ تھے۔ دشمن صرف سڑک کی، پہاڑ کی چوٹی سے نیچے کی طرف ہمارا نشانہ لے سکتا تھا۔

''تم تینوں اوپر چڑھنے کی کوشش کرو۔ میں ان کا راستہ روکتی ہوں۔'' مہر جی نے ہمیں مخاطب کیا۔

''تم بھی ہمارے ساتھ چلو......!'' اختر نے جواب دیا۔

''اکٹھے جائیں گے تو چاروں مارے جائیں گے۔ میں یہاں رک کر وقفے وقفے سے فائر کروں گی تو ان کی آگے بڑھنے کی ہمت نہیں ہوگی۔''

''تو پھر پسٹل مجھے دو...... یہ کام میں کروں گا......تم اوپر چڑھنے کی کوشش کرو۔'' اختر نے آگے بڑھ کر مہر جی کا پسٹل والا ہاتھ پکڑ لیا۔

''پاگل نہیں بنو...... جو کہہ رہی ہوں وہ کرو...... یہ کام میں تم سے بہتر کر سکوں گی۔'' مہر جی نے اختر کا ہاتھ جھٹک دیا۔

''مہر جی......! کیا ہمارے پاس اور اسلحہ نہیں ہے......؟'' میں نے کہا۔

''ہے مگر گاڑی کے خفیہ خانوں میں...... وہاں سے اسلحہ نکالنے کے لئے تھوڑا سا وقت چاہئے اور ہم پر کوئی ایک لمحہ بھی موت بن کر جھپٹ سکتا ہے۔ اس لئے وہ نہیں نکالا جا سکتا۔''

''کیا تم نے گولی چلانے والے کو دیکھا تھا......؟''

''ہاں...... ہماری پوزیشن بہت خراب تھی ورنہ اسے تو میں نے ڈھیر کر دیا ہوتا۔ پانچ افراد کو تو میں نے دیکھا ہے۔ مقامی ہی ہیں ویسے مجھے یقین ہے کہ ان کی تعداد اچھی خاصی ہوگی۔'' اس نے ایک نظر اختر کو دیکھا جو یک ٹک اسے دیکھے جا رہا تھا پھر وہ نظریں چراتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوئی۔

''پلیز شکیل صاحب......! آپ لوگ جائیں۔ آپ کا واسطہ پہلی دفعہ ایسے حالات سے پڑ رہا ہے۔ جب کہ میں یہ سب بیسیوں دفعہ فیس کر چکی ہوں۔ آپ لوگ چوٹی پر چڑھنے کی کوشش کریں کچھ دیر بعد میں بھی آپ لوگوں سے آملوں گی۔''

''ٹھیک ہے......! اختر......!'' میں نے اختر کو آواز دی مگر وہ اسی انداز میں کھڑا مہر جی کو دیکھتا رہا۔

''اب جاؤ بھی...... میری صورت کیا تک رہے ہو......؟ احمق انسان......!'' مہر جی نے غصیلے لہجے میں کہا۔ نہ جانے مجھے ایسا کیوں لگا کہ اس کا غصیلہ لہجہ کھوکھلا سا ہے۔

''آپ......! بہت سندر ہیں۔'' اختر نے مسکراتے ہوئے سنجیدگی سے کہا اور

ہماری طرف پلٹ پڑا۔ مہر جی تو واپس دوڑ پڑی جبکہ ہم تینوں درے کی اندرونی جانب بڑھ گئے۔

''پروفیسر......! آپ ٹھیک ہیں نا......؟'' مجھے پروفیسر صاحب کی طرف سے فکر ہو رہی تھی۔

''ہاں......! میں ٹھیک ہوں...... مجھے کیا ہونا تھا......؟'' پروفیسر نے مضبوط لہجے میں کہا۔ یہ راستہ جیسے جیسے آگے بڑھ رہا تھا آگے سے تنگ ہو رہا تھا۔ چند قدم کے بعد میں رک گیا۔

''میرا خیال ہے یہاں سے ہمیں اوپر کی جانب چڑھنا چاہئے۔'' اسی وقت گولی چلنے کی آواز درے میں گونج اٹھی۔ مہر جی نے فائر کیا تھا۔ ہم تینوں نے پلٹ کر دیکھا۔ جہاں سے ہم اس درے میں داخل ہوئے تھے اس جگہ وہ ایک بڑے پتھر کی اوٹ میں بیٹھی تھی۔ اس کے فائر کے جواب میں یکے بعد دیگرے چار پانچ گولیاں چلیں اور اسی پتھر سے ٹکرائیں۔ کچھ سنگریزے اور پتھر کا برادہ سا اڑا تھا۔ مجھے اس کی طرف سے تشویش ہونے لگی وہ تنہا تھی اور اس کے پاس تھا بھی صرف ایک پسٹل جبکہ دشمن تعداد میں بھی زیادہ تھے اور یقیناً وہ تھے بھی جدید اسلحہ سے لیس۔

ہمیں اپنی طرف دیکھتا پا کر اس نے ہمیں اوپر چڑھنے کا اشارہ کیا اور خود پتھر کی اوٹ سے دوسری سمت جھانکنے لگی...... بجلی کے کوندے کی طرح اٹھی اور فائر کر کے دوبارہ بیٹھ گئی۔ تین گولیاں ضائع...... اب پسٹل میں زیادہ سے زیادہ چھ گولیاں باقی تھیں۔

''آؤ......!'' میں نے پروفیسر اور اختر کو مخاطب کیا اور ہم تینوں اوپر کی جانب چڑھنے کی کوشش کرنے لگے۔ گو کہ پہاڑ کا یہ حصہ زیادہ ڈھلوان میں نہ تھا اور یوں اوپر چڑھنا خطرناک ثابت ہوسکتا تھا مگر ہمارے پاس اور کوئی راستہ نہ تھا اس لئے ہم احتیاط مگر ممکنہ تیزی سے اوپر چڑھتے رہے۔

ہمارے سانس بری طرح پھول گئے مگر ہم لحظہ بھر کو بھی نہیں رکے اور بیس منٹ بعد پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ گئے۔ سانس دھونکنی کی طرح چل رہے تھے اور پسینے

سے ہم تینوں کی حالت تو اتنی دگرگوں تھی کہ وہیں لمبے لیٹ کر گہری گہری سانسیں لینے لگے۔ میں نے ایک نظر دیکھا۔ مہر جی اسی پتھر کی اوٹ میں دبکی بیٹھی تھی۔ میرے ذہن میں ایک خیال آیا اور میں چونک پڑا۔

''پروفیسر......! اٹھیں...... جلدی...... یہاں رکنا ہمارے لئے خطرناک ہوگا۔''

میں نے تیز لہجے میں کہا اور پروفیسر جیسا بوڑھا آدمی بھی جس تیزی سے اٹھا وہ قابل دید تھا۔

میرے ہونٹوں کی ہلکی سی مسکراہٹ دیکھ کر پروفیسر فوراً بولے۔

''میں اپنے شوق سے اس مہم پر نکلا تھا کہیں بھی تمہارے لئے پریشانی کا باعث نہیں بنوں گا اور نہ تم مجھے اپنے سے پیچھے پاؤ گے۔''

''شکریہ......! آئیں میرے ساتھ......!'' میں پہاڑ کی دوسری سمت کی ڈھلان کی جانب بڑھ گیا۔ میرے ذہن میں خیال آیا تھا کہ دشمن بھی ہماری طرح پہاڑ کے اوپر آسکتا ہے تاکہ ہمارا شکار پورے اطمینان سے کر سکے۔

''شکیل صاحب......! مہر جی......'' اختر اتنا ہی کہہ پایا۔

''اس بیچاری کی زندگی چاہتے ہو تو جیسا کہہ رہا ہوں ویسا کرو۔'' اختر خاموش ہو رہا۔ ڈھلوان شروع ہوتے ہی ہم تینوں گھنی جھاڑیوں کے جھنڈ کے عقب میں بیٹھ گئے۔ یہاں بیٹھ کر ہم اطراف کی تمام پہاڑیوں کا بخوبی جائزہ بھی لے سکتے تھے اور جھاڑیاں اس قدر گھنی تھیں کہ ہمیں دیکھ لئے جانے کا اندیشہ بھی نہیں تھا۔

وہاں بیٹھے ہمیں بمشکل چند لمحے ہی گزرے تھے کہ میرا اندیشہ درست ثابت ہوگیا۔ درے کی دوسری جانب سے دو آدمی اوپر چڑھ آئے تھے۔ دونوں نے کندھوں سے جھولتی رائفلیں اتار کر ہاتھوں میں تھام لیں۔ اگر ہمیں چند لمحے یہاں چھپنے میں دیر ہو جاتی تو وہ بآسانی ہمارے جسموں میں سوراخ کر دیتے۔ اب بھی وہ اوپر سے بڑی آسانی کے ساتھ مہر جی کے وجود میں بارود اتار سکتے تھے۔

''پروفیسر......! آپ یہیں بیٹھیں۔ اختر......! تم میرے ساتھ آؤ......!'' میں محتاط انداز میں آہستہ آہستہ عقبی جانب ڈھلان میں اترنے لگا۔ اختر بھی میری تقلید کر

رہا تھا۔

''احتیاط سے ان کی نظر نہ پڑ جائے۔'' چند گز اترنے کے بعد میں بے ترتیب پتھروں پر کھڑا ہو گیا۔ اب ہمارے دیکھ لئے جانے کا خطرہ نہیں تھا۔

''آؤ......!'' میں نے اختر سے کہا اور جھکے جھکے انداز میں آگے بڑھنے لگا۔ اختر میرے پیچھے تھا۔ اچانک اس کا پاؤں لگنے سے ایک چھوٹا سا پتھر نیچے لڑھک گیا۔

''احتیاط......! آنکھیں کھلی رکھو...... اگر ان کو ذرا بھی آہٹ سنائی دے گی تو یہاں ہماری لاشوں کو گدھ نوچیں گے۔'' اختر بولتے بولتے چپ کر گیا۔ اسے بھی صورت حال کی سنگینی کا پورا احساس تھا۔ ہم اندازے سے پہاڑ کے گرد ایک مخصوص فاصلے تک آگے بڑھنے کے بعد رک گئے۔ میں نے اختر کو پوری احتیاط کا اشارہ کیا اور دھڑکتے دل کے ساتھ ایک ایک قدم اوپر چڑھنے لگے۔ خون کی گردش کنپٹیوں میں ٹھوکریں مار رہی تھی۔ اور اعصاب ایک تناؤ کا شکار تھے۔ میں نے اختر کو رکنے کا اشارہ کیا اور خود مزید ایک قدم اوپر چڑھ کر دیکھا۔ دونوں درے کے اوپر پہنچ کر نیچے جھانک رہے تھے۔

ہماری خوش قسمتی تھی کہ ان کی پشت ہماری سمت تھی۔

''ارے...... یہ جناور کی بچی تو تنہا بیٹھ کر گولیاں چلائے ہے...... ای کے باقی یار کدروے......؟''

''ہوویں گے یہیں کہیں پتھراں میں چھپے، دیکھ جر گور سے دیکھ۔''

''ارے ناہیں ہیں نا...... ہویں تو کا نجر نہ آویں گے۔''

''اچھا رک جرا پہلے مائیں ای کتیا کا بھیجا تو باہر نکالوں...... ای کے یاروں کی بعد ماں دیکھ لئی گے۔''

میں نے اختر کو اشارہ کیا اور دبے پاؤں آگے بڑھنے لگا۔ میری نگاہیں ان دونوں پر جمی ہوئی تھیں۔

''ارے رک......! کوڑھ مغج پہلے ای کے عاشقاں کو دیکھ۔'' دوسرے نے مہر

جی کی طرف اٹھی اپنے ساتھی کی رائفل نیچے کر دی۔ ہم بالکل ان کے سر پر پہنچ چکے تھے اور ہم نے کوئی آواز بھی پیدا نہیں ہونے دی تھی مگر شاید ان کی چھٹی حس نے انہیں اپنے عقب میں ہماری موجودگی کا احساس دلا دیا تھا۔

دونوں ایک ساتھ ہی پلٹے تھے۔ انہوں نے رائفلیں سیدھی کرنا چاہیں، ہم نے ان کی رائفلوں پر ہی ہاتھ ڈالے کیونکہ سارا خطرہ انہی کا تھا، میں نے بایاں ہاتھ رائفل پر ڈالا اور دائیں ہاتھ کا گھونسہ اس کے چہرے پر رسید کر دیا مگر بہت ڈھیٹ تھا صرف ایک قدم لڑکھڑایا۔ اس کی ناک سے خون بہہ نکلا تھا۔ ادھر اختر اور اس کے حریف کے درمیان رائفل کی کھینچا تانی ہو رہی تھی۔

اچانک اختر نے اپنے حریف کے زیریں ناف پوری قوت سے گھٹنا جما دیا۔ رائفل اس کے ہاتھ سے نکل گئی اور وہ منہ سے ''اوخ'' کی آواز نکالتا ہوا دونوں ہاتھ اپنے زیریں ناف رکھ کر رکوع کے بل ہوگیا۔ اختر نے آئندہ پل اس کی گردن پر لات ماری اور وہ لڑکھڑاتا ہوا ایک طرف گر پڑا۔ اس کی بدقسمتی کہ وہ درے کے کنارے گرا اور پلٹا کھا گیا۔ سنبھلنے کی کوشش تو اس نے کی مگر سنبھل نہ پایا اور نیچے لڑھک گیا۔ اس کی دہشت ناک چیخ سے پہاڑ گونج کر رہ گئے۔

اختر نے میرے مدمقابل پر رائفل سیدھی کی تو اس نے مجھے جھٹکا دے کر اپنے سامنے کر لیا۔ اختر نے رائفل کو نال کی طرف سے پکڑ لیا اور لاٹھی کی طرح رائفل اس کے سر میں مارنا چاہتا تھا کہ اس نے دوبارہ مجھے سامنے کر دیا۔ خبیث میں گینڈے کی سی طاقت تھی۔ اختر نے رائفل کچھ فاصلے پر رکھی اور عقب میں آکر دونوں ہاتھوں سے اس کی گردن دبوچ لی۔ اختر نے مجھے اشارہ کیا اور ہم اسے دھکیلتے ہوئے درے کے کنارے لے گئے۔ اس کے چہرے پر قدرے خوف کے تاثرات ابھر آئے۔ اختر کی گرفت کے باعث اس کی رگیں پھول گئیں اور چہرہ سرخ پڑ گیا تھا۔

اچانک اس نے رائفل چھوڑی اور ایک بھرپور لات میرے پیٹ میں ماردی مجھے اس کی توقع نہیں تھی اس لئے میں چند قدم لڑکھڑا کر پشت کے بل گر گیا۔ اس

گینڈے نے اختر کے ہاتھ گرفت میں لینا چاہے تھے مگر اختر زیادہ پھرتیلا نکلا اس نے ایک ذرا رخ بدلتے ہوئے اسے جھٹکا دے کر چھوڑ دیا اور وہ بھی چیختا ہوا درے کی گہرائیوں میں لڑھک گیا۔

اختر نے فوراً رائفل اٹھا لی، جدید ترین رائفلیں تھیں۔

ہم نے تیزی سے آگے بڑھ کر نیچے جھانکا دونوں نیچے گہرائیوں میں بے حس وحرکت پڑے تھے۔ مہر جی کی طرف نظر اٹھی تو ہمارے دل دھک سے رک گئے۔ وہ پتھر کے ساتھ دبکی بیٹھی تھی اور پتھر کی دوسری سمت سے چھ سات مسلح افراد اس کی سمت بڑھ رہے تھے اور غالباً وہ ان کی موجودگی سے بے خبر تھی۔

ہم پر نظر پڑتے ہی اس نے گہرائی میں بے حس وحرکت پڑے ان دونوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شکریہ کا سلام کیا پھر پسٹل دکھا کر ہاتھ ہلانے لگی۔ یقیناً گولیاں ختم ہو چکی تھیں۔ مگر ہم اس کی طرف زیادہ دیر توجہ نہ کر پائے۔ بیک وقت ہم دونوں نے رائفلیں سیدھی کیں۔ بیک وقت ہی دو دھماکے ہوئے تھے۔ نشانہ تو کسی کا کیا لینا تھا، بس ان شکاری کتوں کا راستہ روکنا مقصود تھا۔

یہ اتفاق تھا کہ ان میں سے ایک پلٹ کر گر پڑا۔ اب یہ خدا بہتر جانے کہ اس کے قتل کا گناہ میرے سر پڑا یا اختر کے۔ ایک گرا تو باقی بدحواس ہو کر واپس بھاگ پڑے۔ مہر جی کچھ مزید دبک کر بیٹھ گئی۔

''اختر......! تم یہیں ٹھہرو۔ میں دوسری سمت جاتا ہوں۔'' میں نے تیز لہجے میں کہا اور درے کے گرد چکرا کر درے کی دوسری سمت آ گیا اور رکنے کی بجائے جہاں سے درہ شروع ہوتا تھا اس طرف بڑھ گیا۔

پہاڑ کے کنارے پہنچ کر میں نے نیچے جھانکا۔ ایک طرف ہماری خستہ حال گاڑی کھڑی تھی تو دوسری طرف قدرے درے کی اندرونی طرف مہر جی پتھر کی اوٹ لئے بیٹھی تھی اور سر اٹھائے اوپر کی جانب دیکھ رہی تھی۔ میں بھی ایک پتھر کی اوٹ میں بیٹھ گیا۔ میری اور اختر کی پوزیشن اب ایسی ہوگئی تھی کہ ہم دونوں مل کر مہر جی کو اطمینان سے اوپر آنے میں سپورٹ کر سکتے تھے۔

پتھر کی اوٹ میں بیٹھنے کے بعد میں نے اسے اشارہ دیا تو وہ اٹھ کر درے کی اندرونی جانب دوڑ پڑی۔ میں عقابی نظروں سے نیچے کا جائزہ لینے لگا۔ بائیں ہاتھ کے پہاڑ کی اوٹ سے آہستہ آہستہ ایک آدمی نے جھانکا اور میں ایک خیال کے تحت پوری طرح پتھر کی اوٹ میں ہوگیا۔ مہر جی رکتے ہوئے بلندی کا جائزہ لے رہی تھی وہ اوپر چڑھنے کے لئے آگے بڑھی تو میں دوبارہ نیچے کا جائزہ لینے لگا۔ بائیں طرف سے آٹھ افراد نکل آئے تھے مگر ابھی وہ درے کے سامنے نہیں آئے تھے اور اپنی دانست میں اوٹ لئے کھڑے تھے۔ ویسے اختر کے لئے وہ اوٹ ہی میں تھے مگر میرے سامنے تھے۔

میں نے اچانک رائفل سیدھی کی اور یکے بعد دیگرے تین فائر کر دیئے۔ اس بار بھی آٹھ کے مجمعے میں سے ایک گر پڑا تھا۔ ٹھیک اسی وقت دائیں طرف کی پستیوں سے چار پانچ گولیاں چلیں اور جہاں میں چھپا بیٹھا تھا اس پتھر سے آٹکرائیں۔

ٹھک ٹھک...... ٹھک ٹھک...... سنگریزے اڑے اور گولیاں زوں زوں کی آواز سے دائیں بائیں نکل گئیں۔ یقیناً گولیاں چلانے والوں کو اختر نے دیکھ لیا تھا جو اس نے فائر کھول دیا۔ اس کے بعد پتھریلی فضا میں سناٹا پھیل گیا پہاڑوں پر ایک سکوت طاری ہوگیا۔

میں نے مہر جی کی طرف دیکھا تو میری آنکھیں حیرت و بے یقینی سے پھیل کر گدی کی طرف رینگ گئیں۔ وہ ایسی برق رفتاری سے بلندی کی جانب چڑھ رہی تھی کہ یقین نہ آئے یوں جیسے وہ ہموار اور سیدھی سڑک پر دوڑ رہی ہو، ایک بجلی سی چھوٹے بڑے پتھروں کے درمیان چمکتی ہوئی بلندی کی جانب آ رہی تھی۔ میری طرح اختر بھی حیرت کے عالم میں وہ منظر دیکھ رہا تھا اور کچھ ہی دیر بعد وہ پہاڑ کی چوٹی پر کھڑی تھی۔

”یا الٰہی......! یہ تو نے لڑکی بنائی ہے یا کوئی بلا......؟“ میں بے اختیار زیر لب بڑبڑایا۔

میں نے ایک ذرا دوبارہ جائزہ لیا اور اٹھ کر مہر جی کی طرف بڑھ گیا۔ اختر نے بھی اپنا مورچہ چھوڑ دیا۔

پروفیسر جھاڑیوں کی اوٹ سے نکل آئے۔

''آئیں اب جلد از جلد ہمیں اس جگہ سے دور نکلنا ہے۔'' ہمارے قریب پہنچتے ہی مہر جی نے تیز لہجے میں کہا۔

''ہمارا یہاں ایک لمحے کے لئے رکنا بھی خطرے سے خالی نہیں۔ دشمن تیس پینتیس کی تعداد میں ہیں۔'' وہ تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ اس کا آتشیں رنگ و روپ کچھ اور دہک اٹھا تھا۔

موٹی سیاہ ناگن کی سی چٹیا اس کی کمر سے بھی نیچے جھول رہی تھی۔ پسینے کے باعث اس کی پیشانی اور کنپٹیوں سے چپکے ہوئے چند بال اتنے بھلے لگ رہے تھے کہ انسان بے خودی کا شکار ہو کر...... شکار ہو کر...... بس کٹ مرے...... اپنا سر اتار کر اس کے قدموں میں ڈال دے۔ وہ کیا چیز تھی اسے خود احساس نہ تھا۔ وہ تو پہلے ہی اختر نے اپنے تمام جملہ حقوق اس کے نام کر دیئے تھے وگرنہ شاید یہ کوشش میں کر ڈالتا۔

''ادھر اس طرف سے نیچے اترتے ہیں۔'' اختر نے ایک قدرے صاف اور کم دشوار گزار ڈھلوان کی طرف اشارہ کیا تو مہر جی نے اس کی رائے رد کر دی۔

''نیچے اترنے کی حماقت نہیں کرنی ہمیں...... بس یونہی آگے بڑھتے رہو۔'' تیز رفتاری سے چلتے ہوئے مہر جی جوگنگ والے انداز میں دوڑنے لگی اور میں ششدر ہو کر رہ گیا۔

ان لمحات میں میرے ذہن و دل کی حالت کیسی ناگفتہ بہ رہی ہوگی اس کا اندازہ صرف وہی شخص لگا سکتا ہے جسے کسی پر فضا پہاڑی مقام میں کسی بلند و بالا پہاڑ کی ناہموار اور چھوٹے بڑے پتھروں سے اٹی چوٹی پر کسی خوب صورت اور مقناطیسی حسن کی حامل لڑکی کے ساتھ ساتھ جوگنگ کرنے کا اتفاق پیش آیا ہو۔ اور لڑکی بھی کوئی جو چھتیس، چوبیس، چھتیس نہیں...... بلکہ اڑتیس، بائیس، اڑتیس کے قیامت خیز

سراپے کی مالک ہو اور جلتی پر تیل یہ کہ اس نے سکن ٹائٹ لباس کے اوپر ایک چمڑے کی جیکٹ نما کوئی چیز پہن رکھی ہو۔ جس کی کشارہ پیشانی پر روشنیاں رقص کرتی محسوس ہوں۔ موٹی موٹی آنکھوں میں پگھلی ہوئی چاندی کی سی چمک ہو اور اس چمک میں سرمگیں پتلیاں، لمبی گھنی اور سیاہ پلکیں ہوں کمانوں جیسے ابرو جن میں تلوار کی سی کاٹ معلوم ہو جس کے ہونٹ دیکھتے ہی ذہن میں دیار چمن کے سرخ عقیق گردش کرنے لگیں، جس کے گال مکھن کی طرح نرم و ملائم، قندھار کے اناروں کی طرح سرخ اور انگاروں کی طرح دہکتے ہوں اور جوگنگ کے باعث ان گالوں میں ایک ایسا ارتعاش بپا ہو کہ نظر پڑے...... تو پھسل جائے...... نظر پڑے تو پھسل جائے...... بس...... نظر اور پھسل...... بس...... جس کے ساتھ ایسا اتفاق پیش آیا ہوگا میری اس وقت کی کیفیت کا اندازہ صرف وہی کر سکتا ہے۔

برا ہو اختر کا جو میرا راستہ کاٹ گیا تھا۔

اس آتشیں پیکر کے کندھے سے کندھا ملا کر بھاگنا میرے بس کی بات نہ تھی سو میں چند قدم آگے نکل گیا۔ ایک رائفل میرے ہاتھ میں تھی اور دوسری اختر کے۔

''پروفیسر......!'' بھاگنے کے دوران ہی اختر نے اپنے برابر بھاگتے پروفیسر صاحب کو مخاطب کیا۔

''شکیل صاحب بہت سمجھدار ہیں۔ آپ بھی کچھ سمجھداری کا ثبوت دیں۔''

''برخوردار میں حافظ قرآن ہوں۔ شرعی مسائل سے بھی پوری طرح واقف ہوں۔ الحمدللہ کلمے بھی مکمل اور تمام آتے ہی۔ تالی بجانا چاہتے وہ تو دوسرا ہاتھ تو ہاتھ کے برابر لاؤ پھر ہم سمجھداری کا ثبوت بھی دیں گے۔'' پروفیسر نے فصاحت سے جواب دیا۔ مہر جی شاید پروفیسر کی بات کے معنی نہ سمجھ سکی تھی جبکہ اختر مسرت سے قلقاریاں مارنے لگا۔

''مولا آپ کو خوش رکھے پروفیسر......! یہ ممی کا مسئلہ حل کر لیں پھر یہ معمہ حل کرنے کی کوشش کریں گے۔'' مہر جی اختر کی بات کاٹتے ہوئے بولی۔

''اختر......! فار گاڈ سیک......! اس وقت اپنی چونچ بند کر لو...... میری ا

حالت بہت خراب ہے۔ خدا جانے انکل صحیح سلامت مقررہ مقام تک پہنچ پائے ہیں یا نہیں......؟'

''اوکے......! ایز یو وِش......!'' اختر خاموش ہوگیا۔ ہم اسی انداز میں آگے بڑھتے رہے۔ سورج عین سروں کے اوپر پہنچ آیا تھا اور ماحول اچھا خاصا تپ گیا تھا۔ پیاس سے حلق خشک ہوگیا تھا اور پسینے سے کپڑے جسم کے ساتھ چپک کر رہ گئے تھے۔

وقفے وقفے سے ہم پلٹ کر پیچھے دیکھ لیتے۔ دشمنوں کا کہیں نام و نشان دکھائی نہ دے رہا تھا۔ کبھی تو ہم تیز تیز چلنے لگتے کبھی آہستہ آہستہ دوڑنے لگتے۔ اسی انداز میں آگے بڑھتے ہوئے ہم چار پہاڑوں کا فاصلہ طے کر آئے۔ آدمی ہونے کے باوجود ہماری ہمتیں جواب دے گئیں۔ ٹانگیں بے جان ہوگئیں اور سانس بغاوت کرنے پر اتر آئی مگر مہر جی......کم بخت نہ جانے کس ڈھیٹ مٹی کی بنی ہوئی تھی بالکل تازہ دم اور چاق و چوبند دکھائی دے رہی تھی۔

ہم پانچویں پہاڑ کی ڈھلوان پر اتر رہے تھے کہ قدرتی طور پر ایک ایسے وسیع کٹاؤ پر پہنچ گئے جہاں اچھا خاصا سایہ تھا، پروفیسر بے دم سے ہوکر بیٹھ گئے۔

''مہر جی......! آپ اتنا سفر کر کے تھک تو نہیں گئیں......؟'' اختر نے مہر جی کو مخاطب کیا۔

''بالکل نہیں......!''

''مجھ سا سیاہ بخت بھی کوئی نہیں ہوگا۔'' اختر نے گہری یاسیت سے کہا۔

''کیوں بھئی......! اب کیا ہوگیا......؟'' میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''ہونا کیا ہے شکیل صاحب......! سوچا تھا کہ مہر جی ان پہاڑوں کی بھاگ دوڑ سے تھک گئی ہوں گی ...... سو اسی بہانے انہیں کندھوں پر بٹھا کر چل لیں گے مگر لگتا ہے کہ یہ ضرورت سے زیادہ ڈھیٹ مٹی کی واقع ہوئی ہیں۔''

''خیال کرنا اپنی عزت اپنے ہاتھ میں ہوتی ہے اور مجھے لگتا ہے کہ تم میرے ہاتھوں اپنی مٹی خراب کروا کر ہی دم لو گے۔'' مہر جی کا انداز تنبیہی تھا۔

''یہ شرف آپ ہمیں کب بخش رہی ہیں......؟''

''اگر تمہارا حال یہی رہا تو بہت جلد......!''

''ترے وعدے پہ جیئے تو یہ جان جھوٹ جاناں...... کہ خوشی سے مر نہ جاتے جو اعتبار ہوتا۔''

''اور جو درگت تمہاری میں بناؤں گی اس کے بعد تم کہا کرو گے......؟ ہمیں یہ بھی تھا غنیمت جو کوئی شمار ہوتا، ہمیں کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا۔''

''نہیں......! مجھے یقین ہے کہ آپ کے ہاتھوں درگت بننے کے بعد ہم کچھ یوں گویا ہوا کریں گے۔

عشق نے یک ٹنگا غالب کر دیا، ورنہ ہم بھی آدمی دو ٹانگ کے۔'' اس کے انداز پر بے اختیار مہر جی ہنس پڑی۔ اس کے خوب صورت گالوں میں نمودار ہونے والے بھنور بڑے دلکش تھے۔

''پروفیسر صاحب......! لڑکی ہنس پڑی...... آپ کا تجربہ کیا کہتا ہے......؟'' اختر نے جلدی سے پروفیسر کو مخاطب کیا۔

''دو باتیں...... نمبر ایک پتھر دل میں جونک لگ رہی ہے اور نمبر دو کہ ''بجی'' دکھا کر ''کھبی'' مارے گی اور چودہ طبق روشن کر دے گی۔''

''یعنی...... ففٹی ففٹی چانس......!''

''یس......! کوشش جاری رکھو۔ ہمت مرداں مدد خدا۔'' شاید پروفیسر بھی اب ان دونوں کی نوک جھونک سے محظوظ ہونے لگے تھے۔ پروفیسر کی بات پر مہر جی نے مصنوعی غصے سے انہیں گھورا۔

''پروفیسر......! آپ بھی اس شیطان کے ساتھ مل گئے......؟''

''نہیں بھئی......! وہ تو بچے نے ایک سوال پوچھا اور ہم نے اپنے تجربے کی روشنی میں اسے جواب دے دیا۔''

''ہاں......! اور جواب کے ساتھ ساتھ ایک عمدہ مشورہ بھی ''ہمت مرداں مدد خدا۔'' میں نے ایک بھرپور قہقہہ لگایا۔

''تو کیا فرق پڑ گیا پروفیسر نے مشورہ ہی دیا ہے نہ کوئی تعویذ تو نہیں دے دیا۔''

''پروفیسر کے مشوروں پر عمل کرو گے تو کچھ نہیں ہونے والا کیونکہ پروفیسر اگر ایسے کاموں کے متعلق کچھ جانتے ہوتے تو آج تک کنوارے نہ بیٹھے ہوتے۔''

''سچ پروفیسر......! کیا آپ نے شادی نہیں کی......؟'' مہر جی نے شدید حیرت سے پوچھا۔

''ہاں......! ہم نے بھی محبت کی تھی۔ اس حسن کی دیوی سے شادی ہوئی نہیں اور کسی سے شادی کرنے کی ہمت ہی نہیں ہوئی۔ سو آج تک کنوارے ہیں۔''

''اور جس سے آپ نے محبت کی تھی کیا وہ بھی آپ سے محبت کرتی تھیں......؟''

''میری محبت سے دو گنا زیادہ...... کہتی تو وہ یہی تھی۔''

''پھر اب وہ کہاں ہیں......؟'' پروفیسر نے ایک گہری سانس لی۔

''چودہ بچوں کے ہجوم میں...... آج کل پندرھویں کے استقبال کی تیاریوں میں مگن تھی۔''

''پروفیسر کا لہجہ ایسا غم ناک ہوگیا کہ اختر اور مہر جی دونوں ہی سنجیدہ اور افسردہ سے ہوگئے۔ جبکہ پروفیسر کی ایسی شاندار اداکاری پر میرے لئے ہنسی ضبط کرنا مشکل ہوگیا۔

''میرا خیال ہے اب ہمیں آگے بڑھنا چاہئے۔'' اختر نے گہری سنجیدگی سے کہا تو مہر جی نے ایک جھٹکے سے اس کی طرف دیکھا مگر منہ سے کچھ بولی نہیں اور پھر ہم سب اٹھ کر آگے کے سفر پر چل پڑے۔ تا حد نظر پہاڑوں کے علاوہ کچھ دکھائی نہ دے رہا تھا۔ نہ کوئی جانور نہ پرندہ نہ ہی کوئی انسان۔

''لگتا ہے کہ ہم راستہ بھٹک گئے ہیں۔'' مہر جی نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔

''کیا مطلب......؟''

''کسی غلط سمت نکل آئے ہیں۔ ذرا غور کریں سڑک کا بھی کہیں نام ونشان تک دکھائی نہیں دے رہا۔ رام پور بائیں ہاتھ آتا ہے اور یہ سڑک رام پور تک ہی جاتی ہے۔ اب یہ بھی ممکن ہے کہ سڑک کہیں پیچھے سے بائیں ہاتھ ٹرن کر گئی ہو اور ہم اس راستے سے آگے نکل آئے ہوں۔''

''بالکل ممکن ہے...... بے دھیانی میں ہم لوگوں نے سفر بھی تو اچھا خاصا طے کر لیا ہے اور مجھے تو پیاس بھی لگی ہوئی ہے۔'' پروفیسر نے کہا۔

''یہاں پانی ملنا مشکل ہے...... آئیں سڑک کی تلاش کرتے ہیں۔'' ہم چاروں بائیں طرف کو چل پڑے کبھی ہم کسی پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ جاتے اور کبھی ڈھلوانوں کا سفر طے کرنے لگتے۔ خودرو پہاڑی جھاڑیاں کہیں تو بالکل ہی کم ہو جاتیں اور کہیں کہیں اس درجہ گھنی ہو جاتیں کہ آگے بڑھنا انتہائی دشوار ہو جاتا۔ بعض مقامات پر یہی جھاڑیاں بلند و بالا درختوں کی صورت اختیار کر جاتیں۔ ہم مسلسل تین گھنٹے چلتے رہے مگر سڑک کا کہیں نام ونشان تک نہیں تھا۔ ایسے لگتا تھا کہ سڑک کو یہ بلند و بالا پہاڑ نگل گئے ہیں۔

دور افق پر سورج پہاڑ کی فلک بوس چوٹیوں کے عقب میں اتر رہا تھا۔ پہاڑوں پر ایک مضمحل اور اداس سی خاموشی مسلط تھی۔ ہم چاروں ایک جگہ پتھروں پر نڈھال سے بیٹھ گئے۔ ہم سب کی حالت خراب تھی، جسم تھے کہ پھوڑا بنے ہوئے تھے، کپڑوں سے پسینے کی بو کے بھبکے سے اٹھ رہے تھے اور بھوک پیاس نے ایک مردنی طاری کر رکھی تھی۔

''دیوی جی......! کیا دنیا کے آخری کونے تک جانے کا ارادہ ہے......؟'' اختر نے مضمحل انداز میں کہا۔

''ہم راستہ بھٹک کر اس مقام سے کافی آگے نکل آئے ہیں جہاں سے سڑک رام پور کی طرف گھومتی ہے اور جتنا سفر ہم طے کر چکے ہیں، میرا اندازہ ہے کہ ہم رام پور کے گرد و نواح میں ہی کہیں موجود ہیں۔'' مہر جی نے پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔

''تو کیا رام پور کی بجائے رام پور کے گرد و نواح میں ہی ذلیل ہو کر گزارہ کرنے کا ارادہ ہے......؟ مجھے تو بھوک بھی انتہائی لگ رہی ہے۔''

''فی الحال تو پتھر کھا کر ہی صبر و شکر کرو کیونکہ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کیا جا سکتا۔''

''میرا خیال ہے کہ اب ہم ذرا سا رخ ترچھا کر کے سفر کریں کم از کم سڑک تک تو پہنچیں پھر آگے کا کچھ سوچیں گے۔'' میں نے تجویز پیش کی۔

''تین گھنٹے سے مسلسل چل رہے ہیں ابھی تو فی الحال ہم کسی طرف کو بھی رخ کرنے کے حق میں نہیں ہیں۔'' پروفیسر نے ہاتھ کھڑے کر دیئے۔

''کچھ دیر ستا لینے میں کوئی حرج نہیں۔'' مہر جی نے کہا اور چونک پڑی۔ اس کی نظر جنوبی مغربی سمت اٹھی ہوئی تھیں۔ میں نے اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا تو مہر جی کے چونکنے کی وجہ میری سمجھ میں آ گئی۔ دور ایک پہاڑ کی چوٹی پر ایک دھندلی سی عمارت کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔

''یہ...... یہ کیا ہے......؟'' میں نے کہا۔ اختر اور پروفیسر بھی اسی جانب متوجہ ہو گئے۔ مہر جی اپنی جگہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

''یہ تو غالباً کوئی عمارت ہے۔'' پروفیسر نے اپنی رائے دی۔

''ہمیں جلد سے جلد وہاں تک پہنچنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ یقیناً اس طرف قریب ہی کوئی آبادی ہو گی اور بہتر ہو گا کہ ہم لوگ اندھیرا پھیلنے سے قبل کسی آبادی تک پہنچ جائیں۔'' مہر جی نے اضطراری لہجے میں کہا۔ اس کا جملہ پورا ہوا ہی تھا کہ جنوبی مشرقی سمت سے فائرنگ کی آواز بلند ہوئی۔ پہاڑوں کا سکوت کرچی کرچی ہو گیا۔ مہر جی کے حلق سے گھٹی گھٹی سی کراہ خارج ہوئی اور وہ لڑکھڑا کر منہ کے بل گر پڑی۔ ایک گولی سائیں کی آواز سے میرے کان کے قریب سے گزری اور میں لاشعوری طور پر عقبی جانب لیٹے ہوئے ڈھلوان کی سمت لڑھک گیا۔ پروفیسر اور اختر نے بھی اسی ترکیب پر عمل جبکہ مہر جی ہم سے پہلے ہی پتھروں میں پلٹنیاں کھاتی ہوئی ڈھلوان میں کافی نیچے چلی گئی تھی یقیناً اسے گولی لگ گئی تھی۔

لیٹتے وقت میں نے ایک ذرا دیکھا تھا فائرنگ کرنے والے دس سے کسی طرح بھی کم نہ تھے۔ وہی دشمن تھے جن کے چنگل سے نکل کر ہم یہاں تک پہنچے تھے۔

چند پلٹنیوں کے بعد ہم چاروں مختلف پتھروں کی اوٹ میں ہو گئے۔ ٹھیک اسی وقت عقبی سمت سے بھی گولیوں کا ایک قافلہ ہماری سمت بڑھا اور پتھروں سے ٹکرا کر رخ بدل گیا۔ اختر جو اٹھ کر مہر جی کی طرف بڑھنا چاہتا تھا، اپنی جگہ دبک کر رہ گیا۔ دشمن نے دو طرف سے گھیراؤ کیا تھا۔ مہر جی دو بڑے پتھروں کی آغوش میں پڑی تھی۔ اس کی لمبی ناگن سی چوٹی اس کی کمر کے گرد کسی ناگن کی طرح ہی لپٹی ہوئی تھی۔

''مہر جی آپ...... آپ ٹھیک تو ہیں......؟'' اختر نے مضطرب لہجے میں کہا۔ ہم تینوں کی نظریں مہر جی کے وجود کو ٹٹول رہی تھیں۔ میری نظریں اس کے دائیں پاؤں سے چپک کر رہ گئیں جو جوتے سمیت سرخ ہو رہا تھا۔ اور پھر وہاں سے رینگتی ہوئیں اس کی ران پر آ کر ٹھہر گئیں۔ گولی اس کے دائیں گھٹنے سے تھوڑا اوپر ران میں لگی تھی اور وہاں سے بہنے والا خون اس کی پینٹ کو رنگین کرتا ہوا پاؤں تک نچڑ رہا تھا اور نیچے پتھر بھی سرخ ہو رہے تھے۔

مہر جی ایک پتھر سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ اس نے نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا رکھا تھا۔

''ہاں بچت ہو گئی ہے۔'' اس نے مسکرانے کی ناکام کوشش کی۔ اختر چند لمحے گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر رائفل سنبھالتا ہوا محتاط انداز میں عقبی سمت پلٹ پڑا۔

''اختر ٹھہرو......!'' مہر جی نے تیز لہجے میں کہا تو وہ دوبارہ پلٹ کر سوالیہ نظروں سے مہر جی کی طرف دیکھنے لگا۔

''رائفل مجھے دے دو ہمارے پاس یہی گنتی کی چند گولیاں ہیں ان میں سے ایک گولی بھی ضائع نہیں ہونی چاہئے۔''

''مگر مہر جی......!'' مہر جی نے اس کی بات کاٹ دی۔

''فکر نہیں کرو...... میں بالکل ٹھیک ہوں رائفل مجھے دے دو۔'' اور اختر نے ہونٹ بھینچتے ہوئے رائفل اس کی طرف اچھال دی جو اس نے قریب آتے ہی تھام لی پھر وہ ان دو پتھروں کی اوٹ سے نکل کر کہنیوں کے بل رینگتی ہوئی تھوڑا سا بلندی کی جانب آ کر ایک ایسے پتھر کی اوٹ میں بائیں پہلو لیٹ گئی جو جھاڑیوں کی لپیٹ میں تھا۔

جہاں سے وہ رینگ کر آگے بڑھی تھی وہاں کے پتھر خون سے سرخ ہو گئے تھے۔ مجھے تشویش نے آ گھیرا اس قدر خون کا زیاں وہ بھی ایسے مقام پر جہاں پر طبی امداد مل جانے کے بھی امکان نہ تھے۔ بہت خطرناک تھا اس میں اس کی جان بھی جا سکتی تھی۔ اختر بھی سختی سے ہونٹ بھینچے پریشان نظروں سے اس کی ران کو تکے جا رہا تھا۔ پروفیسر بھی اپنی جگہ پریشان اور مضطرب دکھائی دے رہے تھے۔

مہر جی کی توجہ مخالف سمت تھی۔ کچھ دیر بعد اس نے رائفل کی نال جھاڑیوں سے نکالی اور دو فائر داغ دیئے۔ اور فوراً دبک کر بیٹھ گئی۔ توقع کے مطابق پہاڑ دھماکوں سے گونج اٹھے۔ کئی گولیاں اس پھر اور جھاڑیوں سے آ ٹکرائیں جہاں مہر جی دبکی بیٹھی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک تلخ سی مسکراہٹ اتر آئی۔

چند لمحے بعد وہ دوبارہ دوسری سمت جھانکنے لگی۔ میری نظر اختر پر پڑی وہ شرٹ کے بٹن کھول رہا تھا۔ شرٹ اتارنے کے بعد اس نے ایک نظر میری طرف دیکھا اور میں نے اس کا ارادہ بھانپتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔ کھڑا ہونا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ سو وہ رینگتا ہوا مہر جی کی طرف بڑھ گیا۔ مہر جی دوسری جانب متوجہ تھی۔ جب اختر نے قریب پہنچ کر اس کی ران پر ہاتھ رکھا۔ اس کے ہاتھ رکھتے ہی وہ ناگن کی طرح پلٹی تھی۔ اس کی آنکھوں میں چنگاریاں بھری ہوئی تھیں۔

''تم یہاں کیا کر رہے ہو......؟ اپنی جگہ پر جاؤ......!'' وہ غصے سے پھنکاری۔

''مجھے زخم دیکھنے دو......!'' اختر نے سنجیدگی سے کہا۔ مہر جی نے فوراً ٹانگیں سمیٹ لیں۔

''کوئی ضرورت نہیں ہے اس کی...... اور نہ ہی میں ضرورت محسوس کرتی ہوں۔تم اپنی جگہ پر جاؤ......!''

''یاد رہے میں ڈاکٹر بھی ہوں......ضرورت ہے یا نہیں...... میں تم سے بہتر سمجھتا ہوں۔ مجھے زخم دکھاؤ۔'' اختر نے ہاتھ بڑھایا تو مہر جی بھڑک اٹھی۔

''خبردار......! میں کہتی ہوں پرے ہٹ جاؤ......!''

''مہر جی...... ! اختر ٹھیک کہہ رہا ہے اسے زخم دیکھنے دو......خون بہت زیادہ بہہ رہا ہے جو خطرناک بھی ثابت ہوسکتا ہے۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔

''کیا خطرناک ہے اور کیا نہیں......؟ اس کی سینس مجھے بھی ہے...... براہ کرم اپنے دوست کو اپنے پاس بلا لیجئے۔'' مہر جی نے خشک لہجے میں کہا اور میں خاموش ہو رہا۔

''دیکھو مہر......! پاگل نہیں بنو...... بارود کا زہر پھیل گیا تو تمہاری جان بھی جا سکتی ہے۔ مجھے زخم کا جائزہ لینے دو...... پلیز......'' اختر کا لہجہ التجائیہ تھا۔

''فار گاڈ سیک......! وقت ضائع نہیں کرو...... دشمن سر پر پہنچ جائیں گے۔ میرا خون بہہ رہا ہے نا...... بہنے دو...... جان جاتی ہے نا...... جانے دو......تم واپس اپنی جگہ پر جاؤ......! اٹھو یہاں سے......''

''تو کیا تمہارا اس طرح خون بہتا دیکھتا رہوں......؟ تمہیں موت کے منہ جاتا دیکھتا رہوں......؟ اور ہاتھ پہ ہاتھ دھرے خاموش بیٹھا رہوں......؟'' اختر نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ اس کی نظریں مہر جی کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

''نہیں مہر......! یہ میرے اختیار کی بات نہیں...... اس سے تو بہتر سمجھتا ہوں کہ پہلے میں خود مر جاؤں۔'' اختر کا لہجہ اور انداز کچھ ایسا تھا کہ مہر جی کچھ بھی نہ کہہ پائی بس خاموش بیٹھی اس کی طرف دیکھتی رہی۔

اختر بھی چند لمحے خاموش نظروں سے اس کی سمت دیکھتا رہا پھر اچانک اٹھ کر سیدھا کھڑا ہوگیا۔

''اختر......! نیچے بیٹھ جاؤ......!'' میں اور پروفیسر یک بار ہی جھپٹے تھے۔ مہر

جی اپنی جگہ بجلی کی طرح تڑپی اور اس نے اختر کو بازوؤں سے پکڑ کر جھٹکا دے کر نیچے گرا لیا۔

''کیا حماقت ہے یہ......؟'' مہر جی نے غصیلے انداز میں کہا مگر اس کے لہجے نے اس کا ساتھ نہیں دیا۔

''جب تم خود موت کے منہ میں جانا چاہتی ہو تو تم سے پہلے میں کیوں نہیں......؟''

''مہر جی......! اختر ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اسے زخم دیکھنے دیں۔'' میں نے ایک بار پھر اپنی بات دہرائی۔

''کوئی حرج نہیں ہے بیٹا......! یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ تمہارا خون بہہ رہا ہے۔ اختر کو زخم دیکھنے دو۔ یہ ڈاکٹر ہے اگر کوئی حل ہوتا ہے تو اسے کرنے دو۔'' پروفیسر نے بھی ہماری تائید کر دی۔

مہر جی چند لمحے اختر کی طرف دیکھتی رہی پھر اس نے رضامندی میں سر ہلایا اور دوبارہ دوسری جانب متوجہ ہوگئی۔ ٹانگیں اس نے سیدھی کر دی تھیں۔ اختر وہیں پہلو کے بل لیٹ گیا۔ مہر جی کی ران میں جہاں گولی لگی تھی پینٹ کے اس سوراخ میں اختر نے انگلیاں ڈال کر جھٹکا دیا اور شگاف کر ڈالا۔ ران کا گوشت گاڑھے سرخ خون سے رنگین ہو رہا تھا۔

مہر جی نے ایک اور فائر کیا اور سیدھی ہو بیٹھی۔ اختر نے شرٹ کا ایک بازو پھاڑا اور اس کی ران سے خون صاف کرنے لگا۔ وہ اپنے کام میں منہمک تھا اور مہر جی بڑی گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''شکیل......! رائفل ادھر...... مجھے دو......!'' پروفیسر نے مجھے مخاطب کیا تو میں ان کی سمت متوجہ ہوگیا۔

''پروفیسر آپ......آپ کیا کریں گے......؟''

''تم رائفل تو دو......!'' پروفیسر نے کہا اور میں نے رائفل ان کی طرف اچھال دی۔

''پروفیسر صاحب......! ہمارے پاس یہی اسلحہ ہے۔ گولیاں ضائع نہیں کیجئے گا۔'' مہر جی نے کہا تو پروفیسر اس کی طرف دیکھ کر بزرگانہ انداز میں مسکرا دیئے۔ پھر وہ رینگتے ہوئے قدرے بلندی پر پڑے ایک پتھر کی طرف بڑھ گئے۔

''پروفیسر......! یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ واپس آجائیں......!'' میں نے پریشانی سے کہا۔

''تم اپنی جگہ خاموش بیٹھے رہو......!'' پروفیسر اتنا کہہ کر آگے بڑھ گئے اور اس پتھر کی اوٹ لے کر بیٹھ گئے۔ چند لمحے پتھر کی اوٹ سے دوسری سمت جھانکنے کے بعد انہوں نے رائفل سیدھی کی اور فائر کھول دیا۔ مہر جی بھی دوسری جانب متوجہ تھی۔ پروفیسر کے فائر کرتے ہی وہ تیزی سے سیدھی ہوئی اور پروفیسر کی طرف دیکھ کر متحیرانہ انداز میں گویا ہوئی۔

''پروفیسر......! کمال ہے......آپ......آپ تو غضب کا نشانہ رکھتے ہیں۔''

''کیوں......؟ کیا ہوگیا......؟'' پروفیسر مسکرائے۔

''دو...... پروفیسر......! دو آدمی گرے ہیں اور جس انداز میں گرے ہیں یقیناً دوبارہ نہیں اٹھ سکیں گے۔'' پروفیسر مسکرا کر دوبارہ اوٹ سے جھانکنے لگے۔ میں اختر کی جانب متوجہ ہوگیا۔ وہ زخم کپڑے سے صاف کرتا تو تھوڑا سا خون اور رس آتا اس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا سارا کپڑا رنگین ہو چکا تھا آخر کار اس نے کپڑا ایک طرف رکھا اور دونوں ہاتھوں سے گوشت کو بھینچ کر لیٹ گیا۔

''اختر......! کیا زخم زیادہ گہرا ہے......؟'' میں نے اسے مخاطب کیا۔

''بچاؤ ہوگیا ہے شکیل صاحب......! گولی صرف چھو کر گزری ہے البتہ گوشت پر ایک انچ بڑا کٹ چھوڑ گئی ہے۔ اسی کے باعث بلیڈنگ اتنی زیادہ ہو رہی ہے۔''

''یعنی خطرے والی بات نہیں......!''

''نہیں......! ایسی کوئی بات نہیں۔ خدا کا کرم ہوا ہے۔'' مہر جی کسی کا نشانہ لے رہی تھی ادھر پروفیسر گھات لگائے ہوئے تھے۔ مہر جی نے فائر کیا مگر رائفل جواب دے گئی۔

''گولیاں ختم ہوگئیں۔'' اس کا لہجہ تشویش سے پُر تھا۔

''پھر اب ہمیں فوراً یہاں سے نکلنے کی کوشش کرنی چاہئے۔'' میں نے رائے دی۔

''ہاں......! اور کوئی چارہ بھی نہیں۔''

''ایک منٹ......!'' اختر نے کہا اور ایک طرف پڑی شرٹ اٹھالی۔ اس نے شرٹ کا دوسرا بازو الگ کیا اور مہر جی کی ران کے ساتھ لپیٹ دیا پھر اس نے شرٹ کے ساتھ سے ایک باریک سی پٹی اتاری اور مہر جی کی ران کے اوپر اچھی طرح کسنے کے بعد مضبوطی سے دو تین گرہیں باندھیں۔

''چلیں پروفیسر......! اب نکلنے کی کوشش کریں۔'' مہر جی نے پروفیسر کو مخاطب کیا اور پھر ہم سب محتاط انداز میں پتھروں پر رینگتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ زخمی ٹانگ کے باعث مہر جی کو پتھروں پر رینگنے میں دقت پیش آرہی تھی۔ اس کے چہرے کے تاثرات اس بات کے غماز تھے مگر وہ ہمارے ساتھ آگے بڑھ رہی تھی۔ دشمن اب بھی وقفے وقفے سے فائر کر رہے تھے۔

''گولیاں ختم ہوگئی ہیں تو یہ رائفل پھینک دینا تھی۔'' اختر نے مہر جی کے ہاتھوں میں پکڑی رائفل کی طرف اشارہ کیا۔

''ہاں...... تاکہ موت کے ہرکارے جان جاتے کہ ہم خالی ہو چکے ہیں اور وہ بے دھڑک آکر ہمارے وجود چھلنی کر دیتے۔'' مہر جی نے منہ بنایا۔

تقریباً بیس میٹر تک رینگتے رہنے کے بعد ہم پہاڑ کی ڈھلوان تک پہنچ گئے۔ نیچے بہت گہرائی میں ایک قدرتی نالہ دکھائی دے رہا تھا جو اس اور سامنے والے دونوں پہاڑوں کے درمیان سے جنوب کی سمت بہہ رہا تھا۔ نالے کے دونوں اطراف انتہائی زیادہ گھنی جھاڑیاں اور درختوں کا سلسلہ نالے کے ساتھ ساتھ جنوب کی طرف آگے جاتا تھا۔ پانی نظر آتے ہی ہم چاروں کے چہروں پر رونق پھیل گئی۔ ساتھ ہی حلق کچھ مزید خشک محسوس ہونے لگے۔

''صاف ستھرا پانی ہے۔''

''چلو بھوک نہ سہی پیاس کا تدارک تو ہوا۔''

''ہمیں جلد از جلد اس نالے کی دوسری جانب پہنچنا ہے۔'' مہر جی نے تیز لہجے میں کہا۔

''تو چلو پھر نیچے اتریں...... انتظار کس بات کا ہے......؟'' میں نے کہا ڈھلوان پر آنے کے بعد ہم چاروں اٹھ کر کھڑے ہوگئے کیونکہ یہاں سے دیکھ لئے جانے کا خطرہ نہیں تھا۔ ہم تیز رفتاری سے نیچے کی جانب اترنے لگے۔ مہر جی کی چال میں ہلکی سی لنگڑاہٹ تھی۔ غیر محسوس سی۔

ہم نیچے اتر رہے تھے اور پلٹ پلٹ کر اپنے عقب میں بھی دیکھ رہے تھے کہ کہیں دشمن تو سر پر نہیں آگئے۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد ہم اس نالے کے کنارے پھیلے درختوں اور جھاڑیوں تک پہنچ گئے۔

''رکیں نہیں آگے بڑھیں...... ہمیں فوراً دوسری جانب پہنچنا ہے۔'' مہر جی نے تیز لہجے میں کہا اور قدم جھاڑیوں کی طرف بڑھا دیئے ہم بھی اس کے پیچھے بڑھ گئے۔

جھاڑیاں اس قدر گھنی تھیں کہ ان کے درمیان سے گزرتے ہوئے کافی دِقت کا سامنا کرنا پڑا۔ بہرحال ہم نالے کے بالکل کنارے پر پہنچ گئے۔ پانی بالکل صاف اور شفاف تھا یہاں تک کہ تھوڑے فاصلے پر نالے کے درمیان سطح آب پے پڑے پتھر تک دکھائی دے رہے تھے۔

''ادھر پانی کم ہے ادھر سے دوسری طرف جاتے ہیں۔'' مہر جی نے انہی پتھروں کی جانب اشارہ کیا اور ہم اس طرف بڑھ گئے۔

''پہلے پانی پی لیں...... پیاس سے جان لبوں پر آرہی ہے۔'' پروفیسر نے تھکے ہوئے انداز میں کہا۔

''ہاں......! پیاس تو واقعی لگ رہی ہے......یہیں سے پی لیتے ہیں۔''

ہم چاروں ہی قطار میں بیٹھ گئے اور ہاتھوں کی مدد سے پانی پینے لگے۔ پانی اس قدر ٹھنڈا اور لطیف تھا کہ طبیعت نکھر گئی یوں لگا جیسے روح تک تروتازہ ہوگئی ہو

مہر جی نے سر اٹھا کر عقبی پہاڑ کی چوٹی کی جانب دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ دشمن شاید ابھی تک وہیں تھے۔ ان کے چند ساتھی بھی ہمارے ہاتھوں مارے گئے تھے اس لئے یقین تھا کہ وہ ایک ایک قدم بڑا سوچ سمجھ کر آگے بڑھائیں گے۔

''آئیں......!'' مہر جی نالے میں اُتر گئی۔ نالے کا پیٹ اچھا خاصا تھا لیکن یہاں سے پانی صرف ڈیڑھ دو فٹ گہرا تھا۔ شفاف پانی کی تہہ میں بجری جیسے پتھروں کا بچھا فرش بالکل صاف دکھائی دے رہا تھا۔ کہیں کہیں ایسے بڑے پتھر بھی پڑے تھے جن کے سر پانی سے باہر تھے اور جو ابھی تک ٹکڑوں میں منقسم نہیں ہوئے تھے۔ ایسے پتھروں سے رگڑ کھانے کے باعث پانی میں سے ایسی آوازیں بلند ہو رہی تھیں جیسے جلترنگ بج رہا ہو۔

ہم ان پتھروں پر آگے بڑھتے رہے۔ تقریباً نصف نالہ طے کرنے کے بعد پتھروں کا یہ فرش ختم ہوگیا۔ آگے پانی کی گہرائی میں کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ یقیناً یہاں سے گہرائی زیادہ تھی۔ مہر جی چونکہ ہم سے آگے تھی اس لئے پہلے وہی آگے بڑھی اور پانی اس کی کمر تک آگیا۔

''آجائیں......! پانی اتنا ہی گہرا ہے۔'' مہر جی نے پلٹ کر کہا اور ہم تینوں آگے بڑھ گئے۔ ویسے یہ بھی ایک لحاظ سے اچھا ہی ہوا تھا۔ پانی اچھا خاصا سرد تھا اور اسی باعث مہر جی کی ران سے رسنے والا خون بالکل ہی تھم جاتا۔

''کیا ستم ہے کہ ایک لاش کی محبت میں ہم کہاں کہاں خوار ہوتے پھر رہے ہیں۔'' اختر نے ایک دردیلی سرد آہ بھر کر کہا۔

''اس میں لاش کا کوئی قصور نہیں بعض لوگوں کی قسمت میں ہی خواری لکھی ہوتی ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے چوٹ کی۔

''ہاں......! یہ بھی آپ نے ٹھیک ہی کہا۔ آپ نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا ہوگا کہ آپ کے ساتھ یہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔'' اختر نے حاضر جوابی کا مظاہرہ کیا۔

''میں اپنی نہیں تمہاری بات کر رہا ہوں۔''

''میں تو ایک جیتی جاگتی ہستی کی محبت میں خوار ہو رہا ہوں، صرف اس امید پر کہ کبھی تو وہ پتھر دل موم ہوگا...... اگر یہ امید نہ ہوتی شکیل صاحب......! تو میں کب کا ممی کے قصے پر لعنت بھیج کر واپس چلا گیا ہوتا۔''

''بکواس بند کرو......!'' پروفیسر اچانک ہی اختر پر دھاڑے۔

''دریدہ دہن ......! منہ سے کچھ نکالنے سے پہلے کچھ سوچ سمجھ لیا کرو۔''

''کیوں......؟ میں نے ایسا کیا کہہ دیا ہے......؟'' اختر نے حیرت سے کہا۔

''کس پر......؟ کس کے قصے پر لعنت بھیج رہے ہو......؟ کچھ اندازہ ہے تمہیں...... کیوں عذاب کو دعوت دے رہے ہو......؟''

''لو کر لو بات......! پروفیسر......! آپ بھی نا...... بس کمال کرتے ہیں۔ بھلا ایک صدیوں پرانی لاش کے متعلق کچھ کہہ دیا تو اس میں عذاب کو دعوت دینے کی کیا بات ہوئی......؟''

''بس...... تم اپنا منہ مند کر لو...... خبردار...... مریاقس کو لاش یا اس کے متعلق کچھ اور کہا تو......''

''واہ پروفیسر......! واہ......! آپ تو یوں بگڑنے لگے جیسے مریاقس آپ کی محبوبہ ہو۔''

''اوہ...... او ملعون میں...... میں کہتا ہوں اپنا منہ بند کر لے...... اپنی جان کے دشمن کیوں...... کیوں اپنی موت کو پکار رہا ہے۔'' پروفیسر پھٹ پڑے۔

اختر اپنی جگہ حیران تھا اور میں اپنی، اور تو اور مہر جی پلٹ کر حیرت و بے یقینی سے پروفیسر کی طرف دیکھنے لگی تھی۔ اس کے لئے پروفیسر کا یہ رویہ حیرت اور بے یقینی کا باعث تھا۔ پھر اس سے پہلے کہ اختر کچھ کہتا میں نے اسے ٹوک دیا۔

''اختر......! خاموش ہو جاؤ......!'' اختر کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

ہم دوسری جانب پہنچ گئے۔ کنارے پر لگے درخت اور جھاڑیاں بہت گھنی تھیں۔ ہم بڑی مشکلوں سے نالے میں سے نکلے اور جھاڑیوں کی دوسری جانب پہنچے۔ سورج غروب ہو چکا تھا مگر ابھی پوری طرح اندھیرا نہیں پھیلا تھا۔ نالے کے

دونوں طرف موجود درختوں پر بے شمار پرندے چہچہانے لگے تھے۔ اسکے باوجود پہاڑوں کی ہیبت ناک خاموشی ایک بوجھل احساس سے دوچار کر رہی تھی۔ جھاڑیوں سے نکل کر ابھی ہم نے آس پاس کا جائزہ لینے کیلئے سر اٹھائے ہی تھی کہ مہر جی کسی مادہ چیتے کی طرح ہم پر جھپٹی اور ہم چاروں ایک دوسرے سے ٹکرا کر نیچے گر پڑے۔

''ہوشیار......! دشمن سر پر آ پہنچے ہیں۔'' مہر جی نے سرسراتے لہجے میں کہا۔

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ خونخوار نظروں سے بلندی کی جانب دیکھ رہی تھی۔ ہم نے بھی اس کی تقلید کی۔ گھنی جھاڑیوں کے درمیان سے پہاڑ کی چوٹی پر کھڑے صرف دو تین مسلح افراد ہی دکھائی دے رہے تھے۔ وہ اوپر کھڑے نیچے اس نالے کی طرف ہی دیکھ رہے تھے۔ مگر ہماری پوزیشن ایسی تھی کہ وہ ہمیں آسانی سے دیکھ نہیں سکتے تھے۔

''اب کیا کرنا ہے......؟'' پروفیسر نے تیز لہجے میں اسے مخاطب کیا۔

''احتیاط......! اگر ان کی ہم پر نظر پڑ گئی تو یہ جھاڑیاں رائفلوں کی گولیوں کو روک نہیں سکیں گی۔''

چند لمحے اوپر سے جائزہ لیتے رہنے کے بعد وہ نیچے اترنے لگے۔ جب وہ متحرک ہوئے تو معلوم ہوا کہ ان کی تعداد اچھی خاصی تھی مگر گھنی جھاڑیوں کی وجہ سے سارے ایک ساتھ دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

''میرا خیال ہے کہ سڑک اسی طرف ہوگی۔ آئیں احتیاط کے ساتھ۔'' مہر جی نے تیز لہجے میں کہا اور جھکے جھکے انداز میں جنوبی سمت کو چل پڑی۔ ہم بھی فوراً اس کے پیچھے چل پڑے۔ چند قدم چلنے کے بعد مہر جی نے اپنی رائفل جھاڑیوں کے درمیان سے نالے میں سرکا دی اور پروفیسر کے ہاتھ سے رائفل لے لی۔ اور پھر دوڑنے والے انداز میں آگے بڑھنے لگی۔ ہم نے بھی اپنی رفتار تیز کر دی۔

قدموں کے تلے گھاس بچھی ہوئی تھی۔ کہیں تو ایک سبز چادر کی صورت اور کہیں اچھی خاصی اونچی اونچی۔ نالہ ایک نصف دائرے کی صورت آگے بڑھ رہا تھا اور ہم جیسے جیسے آگے بڑھ رہے تھے جھاڑیاں مزید گھنی ہوتی جا رہی تھیں جگہ جگہ

گھاس میں چھوٹے بڑے پتھر بکھرے پڑے تھے دو ایک بار تو میں ٹھوکر کھا کر گرتے گرتے بچا تھا جب کہ پروفیسر صاحب دو تین سجدے ٹیک چکے تھے۔ اندھیرا ابھی گہرا ہونے لگا تھا اور اندھیرے میں ایسی جگہ آگے بڑھنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔

بھاگتے بھاگتے اچانک پروفیسر صاحب کو ایک بار پھر ٹھوکر لگی۔ انہوں نے سنبھلنے کی کوشش بھی کی مگر اپنا توازن قائم نہ رکھ سکے وہ گرے، ان کے منہ سے ایک دردناک کراہ خارج ہوئی اور وہ اپنا دایاں گھٹنا پکڑ کر گھاس پر لوٹ پوٹ ہو گئے۔

''پروفیسر صاحب......!'' میں نے لپک کر ان کو تھاما۔ اختر اور مہر جی بھی رک کر قریب آ گئے۔ پروفیسر کے چہرے پر شدید تکلیف کے آثار تھے۔

''پروفیسر......! کیا زیادہ لگ گئی ہے......؟'' مہر جی نے کہا۔

''دکھائیں......!''

''نہیں......کوئی بات نہیں......!'' پروفیسر نے ضبط کرتے ہوئے کہا۔

''دکھائیں تو سہی......!'' میں نے ان کا گھٹنا ننگا کر دیا اچھی خاصی چوٹ آئی تھی۔ گھٹنے سے کھال اتر گئی تھی اور خون رسنے لگا تھا۔

''ارے چھوڑ......بس معمولی رگڑ ہے۔'' پروفیسر نے پائنچہ درست کیا اور اٹھ کر کھڑے ہوئے۔

''چلو آگے بڑھو۔ ہمیں جلد از جلد کسی محفوظ پناہ گاہ تک پہنچنا ہے۔ آگے بڑھو۔'' اور ہم سب دوبارہ چل پڑے مگر اب ہماری رفتار نہ ہونے کے برابر تھی کیونکہ اندھیرا ابھی پھیل گیا تھا اور کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ایسے میں تیز رفتاری بڑی نقصان دہ ثابت ہو سکتی تھی۔ البتہ ہم ایک منٹ کو بھی کہیں نہیں رکے۔ مسلسل چلتے رہے۔ آخر تین گھنٹے کے صبر آزما سفر کے بعد ہم سڑک تک پہنچ گئے۔ بے اختیار ہمارے منہ سے مسرت انگیز قلقاریاں خارج ہو گئیں۔ سڑک پر پہنچ کر ہمیں یوں لگا تھا جیسے ہم دنیا فتح کر آئے ہیں۔ جیسے ہم نے ہفت اقلیم کی دولت پالی ہے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ہم وادی اجل سے بچ کر زندگی کی آغوش میں پہنچ آئے ہوں۔

''مہر جی......! اب بتاؤ......! ہمیں آگے کس طرف جانا ہے......؟'' پروفیسر

نے کہا۔

''دائیں رخ......!'' مہر جی نے فوراً کہا۔

''میرا خیال ہے کہ ہم رام پور پہنچ گئے ہیں۔ اور اب ہم آبادی سے زیادہ دور نہیں ہیں۔''

''تو پھر بسم اللہ کرو...... قدم آگے بڑھاؤ۔''

''آئیں......!'' ہم دائیں طرف کو چل پڑے۔

''کیا ہمیں آبادی کے اندر جانا ہے......؟'' اختر کے لہجے میں اندیشے سرسرا رہے تھے۔

''جانا تو آبادی میں ہی ہے لیکن آبادی کے وسط میں نہیں...... آبادی کے شروع میں ایک قدیم حویلی آتی ہے وہاں صرف ایک چھوٹی سی فیملی رہتی ہے۔ میاں، بیوی اور چھوٹے چھوٹے تین بچے۔ حویلی کا ایک حصہ ان کے استعمال میں ہے باقی کی حویلی ویران ہے اور وہی حویلی ہماری منزل ہے...... ہمارا مرکز۔''

''وہ میاں بیوی...... ان کا کیا کردار ہے......؟ کیا انہیں ہماری آمد کے متعلق علم تھا......؟'' اختر نے سوال کیا۔

''ہاں...... انہیں علم تھا...... وہ انکل کے معتقد ہیں اور وہ عورت ہماری ایجنٹ بھی ہے جو ان دنوں راج محل میں اپنے فرائض انجام دے رہی ہے۔''

تقریباً نصف فرلانگ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد سڑک ایک پہاڑ کے گرد گھومتی ہوئی بائیں ہاتھ کو رخ بدلتی تھی ہم اس پہاڑ کے گرد گھوم کر جیسے ہی دوسری طرف پلٹے خوشی کے مارے اچھل پڑے۔ تقریباً دو فرلانگ کے فاصلے پر کسی آبادی کی روشنیاں دکھائی دے رہی تھیں۔

''دیکھا میرا اندازہ درست نکلا......! یہ...... یہ رام پور کی روشنیاں ہیں...... ہم...... ہم رام پور پہنچ چکے ہیں۔'' مہر جی نے مسرت بھرے لہجے میں کہا۔

''آؤ...... جلدی آؤ......!'' ہماری رفتار تیز ہوگئی۔ ہم جیسے جیسے آگے بڑھ رہے تھے روشنیوں کا دائرہ کار وسیع ہوتا جا رہا تھا جن سے اندازہ ہوتا تھا کہ ریاست

رام پور اچھی خاصی ریاست ہے۔ کچھ دیر بعد ہم آبادی تک پہنچ چکے تھے۔ کچھ افراد بھی نظر آ رہے تھے۔ کسی کی نظروں میں آنا مناسب نہیں ہوگا اس لئے ہم دوسرے رخ سے چلتے ہیں۔

''میرے پیچھے پیچھے آ جائیں......!'' مہر جی نے کہا اور رخ بدل دیا۔ ہم نے بھی کچھ کہنا یا پوچھنا ضروری نہ سمجھا اور اس کے پیچھے ہو لئے۔ مہر جی ہمیں مکانوں کی عقبی سمت لے گئی۔ یہاں سے کچھ فاصلے پر ایک پہاڑ تھا اور آگے مکانوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ تین مکان چھوڑنے کے بعد مہر جی ایک جگہ رک گئی۔ اس طرف ویسے بھی اندھیرا تھا جو ہمارے حق میں بہتر تھا۔

''یہی حویلی ہے۔ ہمیں دیوار پھاندنا ہوگی۔'' مہر جی نے کہا۔

''کوئی مسئلہ نہیں......!'' مہر جی نے آگے بڑھ کر ایک چھوٹا سا جمپ لیا اور دیوار کا کنارہ تھام لیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ دیوار کے اوپر موجود تھی۔

''آ جائیں......!'' اس نے ہم سے کہا اور ہم لوگ بھی آگے بڑھ گئے۔ پہلے اختر اوپر چڑھا پھر میں اور آخر میں ہم نے پروفیسر کے ہاتھ پکڑ کر انہیں اوپر آنے میں مدد دی۔ ایک نظر اطراف کا جائزہ لیا کہ کوئی ہمیں دیکھ تو نہیں رہا مگر دور دور تک کوئی ذی روح نہیں تھا۔ بس خاموشی اور سناٹا تھا۔ حویلی بھی اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ دور ایک کونے میں کچھ روشنی تھی۔ ایک نیچے والے کمرے میں ایک اوپر والے کمرے میں باقی ساری حویلی مکمل اندھیرے کی لپیٹ میں تھی۔ دیوار سے چند قدم کے فاصلے پر ایک کھٹارا سی ویگن کھڑی تھی۔ مگر یہ وہ ویگن نہیں تھی جس میں کہ شلندر وغیرہ آئے تھے۔

ہم چاروں اطمینان سے دوسری جانب کود گئے۔

''خدا کا شکر ہے کہ ہم اپنی منزل تک پہنچ گئے ہیں ورنہ مجھے تو امید نہ تھی کہ ہم زندگی بھی بچا سکیں گے۔'' مہر جی نے ایسی سکون کی سانس لی جیسے اپنی ساری تھکن اس سانس کے ذریعے خارج کر دی ہو۔

☆☆☆

''شکر یہ بعد میں ادا کیجئے گا پہلے یہ دیکھیں کہ وہ سامنے کون جناب کھڑے ہیں......؟'' اختر کی بات پر ہم نے چونک کر سامنے کی طرف دیکھا۔ وہاں واقعی ہی کوئی موجود تھا اور برآمدے کے ستون سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ ساتھ والے کمرے کی کھڑکی سے آنے والی مدہم روشنی میں بس اس کا ہیولہ سا ہی دکھائی دے رہا تھا۔ ایک ذرا ہمارے قدم ٹھٹکے تو وہ بول پڑا۔

''کوئی بات نہیں...... یہاں تک پہنچ آئے ہو تو آگے بھی آجاؤ......! اب دوستوں کے قریب ہو۔'' آواز سو فیصدی شلندر کی تھی۔ ہمارے سینوں میں رک جانے والی سانس اطمینان سے خارج ہوگئی۔ مہر جی دوڑ کر شلندر سے لپٹ گئی۔

''آئی ایم پراوڈ آف یو مائی ڈاٹر......! مجھے یقین تھا کہ تم ہر طوفان کا رخ پھیر کر یہاں تک آ پہنچو گی۔'' ہمارے قریب پہنچتے ہی وہ ہم سے مخاطب ہوا۔

''آپ لوگ ٹھیک ٹھاک ہیں نا......؟''

''الحمد للہ......! ہم بالکل پرفیکٹ ہیں۔ ہاں البتہ اگر مہر جی ہمارے ساتھ نہ ہوتی تو پھر شاید ہم کبھی بھی یہاں تک نہ پہنچ پاتے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے شلندر سے ہاتھ ملایا۔

''آئیں...... باقی باتیں اوپر بیٹھ کر کریں گے۔'' شلندر اپنی جگہ پلٹ پڑا۔ برآمدے کے ایک کونے میں سے ہی سیڑھیاں اوپر جاتی تھیں شلندر ان سیڑھیوں کی

طرف بڑھا تو ساتھ والے کمرے (جس میں لائٹ جل رہی تھی) میں سے ایک ادھیڑ عمر دیہاتی آدمی نکل آیا۔

''صاحب جی......! باقی لوگ بھی آگئے ہیں......؟''

''ہاں خیرو......! اب کھانا لے آؤ...... بھوک بہت شدید ہوگئی ہے۔''

''جی صاحب......! ابھی لاتا ہوں۔'' وہ واپس کمرے میں چلا گیا اور ہم لوگ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچ گئے اور جب کمرے میں پہنچے تو ڈاکٹر عقیل اور عارب ہم لوگوں پر نظر پڑتے ہی ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

''شکیل صاحب......! خیریت تو ہے......؟''

''ہاں...... ہاں بھئی......! اب سب خیریت ہی ہے۔'' شلندر نے مسکراتے ہوئے کہا اور میں بھی مسکرا دیا۔ ڈاکٹر عقیل اور عارب ہمارے دگرگوں حلیوں کو بڑی گہری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ مہر جی کی طرف نظر گئی تو وہ دونوں چونک پڑے۔

''ارے یہ...... یہ کیا...... یہ خون کیسا ہے......؟'' اس بار شلندر نے بھی چونک کر مہر جی طرف دیکھا۔

''مہر......! یہ...... یہاں کیا ہوا ہے......؟'' سارے جہان کی فکر مندی یکا یک ہی اس کے لہجے میں در آئی تھی۔

''کچھ نہیں انکل......! معمولی زخم ہے۔ گولی چھو کر گزری ہے۔'' مہر جی نے سرسری سے انداز میں کہا اور شلندر کے جبڑے بھینچ گئے۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد وہ ایک کونے سے بیگ اٹھا لایا۔ ہم سب مرداروں کی طرح ڈھیر ہوگئے تھے۔ شلندر زپ کھول کر بیگ میں سے مرہم پٹی کا سامان نکالنے لگا۔

''انکل......! آپ آرام سے بیٹھیں...... فکرمندی کی کوئی بات نہیں۔'' مہر جی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کمال کرتی ہو...... اتنا خون دکھائی دے رہا ہے اور تم کہتی ہو کہ فکر کی کوئی بات نہیں......!''

''ہاں تو ٹھیک کہہ رہی ہوں نا......! آپ سکون سے بیٹھیں یہ مجھے

دکھائیں۔'' مہر جی نے بیگ شلندر کے ہاتھ سے لے لیا اور ایک طرف کرسی پر بیٹھ گئی۔ مہر جی ران پر بندھا ہوا کپڑا کھولنے لگی اور شلندر ہم لوگوں سے مخاطب ہوا۔

''آپ لوگ اگر فریش ہونا چاہیں تو یہاں اوپر ساتھ ہی باتھ روم ہے۔''

''فی الحال تو اس کی ضرورت محسوس نہیں ہو رہی۔ پیٹ میں چوہے کبڈی کا میچ کھیل رہے ہیں ان کو کچھ ملے گا تو طبیعت خود بخود فریش ہو جائے گی۔'' اختر نے پیٹ پر ہاتھ پھیرا۔

''کم از کم کوئی شرٹ...... کوئی قمیص ہی پہن لو۔'' ڈاکٹر عقیل نے اسے مخاب کیا۔

''نہ ڈاکٹر صاحب......! فاقے کے باعث بہت نقاہت محسوس ہو رہی ہے۔ میں فالتو بوجھ بالکل نہیں سہار سکتا۔''

میں نے مہر جی کی طرف دیکھا وہ کاٹن اور اسپرٹ کی مدد سے اپنی ران کا زخم صاف کر رہی تھی۔ زخم صاف کرنے کے بعد وہ پوڈر اور کریم زخم پر ملنے لگی۔ اس کے ہاتھ کسی ماہر ڈاکٹر کی طرح چل رہے تھے۔ پھر جب وہ مکمل بینڈیج کر چکی تو شلندر اس سے مخاطب ہوا۔

''ہاں...... اب پوری تفصیل بتاؤ کیا ہوا تھا......؟ اور تم لوگ یہاں تک کیسے پہنچے......؟ میں نے کچھ آدمی بھیجے تھے جنہوں نے بتایا ہے کہ ایک جگہ تم لوگوں کی گاڑی تباہ حال میں دیکھی گئی ہے مگر باوجود کوشش کے وہ ابھی تک تم لوگوں کا کوئی سراغ نہیں لگا سکے تھے۔ کہاں تھے تم لوگ......؟''

شلندر کی بات کے جواب میں مہر جی نے شروع سے لے کر آخر تک تمام رام کہانی کہہ سنائی۔ وہ اپنی بات مکمل کر کے خاموش ہوئی ہی تھی کہ خیرو کھانے کے برتن اٹھائے آ گیا۔ وہ برتن درمیان کی ٹیبل پر رکھنے لگا اور مہر جی اٹھ کھڑی ہوئی۔

عجیب مضحکہ خیز حلیہ لگ رہا تھا اس کا بینڈیج کے لئے اس نے پینٹ ران کے قریب سے الگ کر دی تھی جو کھڑے ہونے کے باعث نیچے کو سرک گئی تھی۔ اس کی خوب صورت سڈول پنڈلی پر خون جم کر سیاہ رنگت اختیار کر چکا تھا۔

''میں چینج کرنا چاہتی ہوں۔'' مہر جی کی بات پر شلندر خیرو سے مخاطب ہوا۔

''خیرو......!''

''جی صاحب جی......!''

''مہر کو رانی کا کوئی سوٹ دے دو......!''

''جی اچھا......! آئیں جی میں آپ کو باتھ روم بھی دکھا دیتا ہوں۔'' مہر جی اس کے ساتھ جانے لگی تو شلندر نے کہا۔

''بیٹا......! کھانا تو کھالیتی......!''

''انکل......! مجھے یوں کوفت ہو رہی ہے۔ بس میں پانچ منٹ میں آ رہی ہوں۔'' اتنا کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔ شلندر ہونٹ کاٹتے ہوئے بڑبڑانے والے انداز میں گویا ہوا۔

''میری بیٹی کا خون بہا کر رام پرشاد نے اپنے حق میں برا کیا ہے...... اب تک جو کر سکتا تھا، وہ کر چکا...... اب ہماری باری ہے۔ اب ہم وار کریں گے۔ اس کا وار تو ہم سہہ گئے ہیں مگر وہ ہمارا وار برداشت نہیں کر پائے گا بہت کاری وار ہوگا۔''

''کیا سوچا ہے آپ نے......؟ اب آگے کیا کرنا ہے......؟'' میں نے پوچھا۔

''رانی راج محل میں ہے...... خیرو بتا رہا تھا کہ کبھی وہ چار دن بعد آتی ہے، کبھی چھ دن بعد اور کبھی دس دس دن نہیں آتی۔ اگر وہ آجاتی تو زیادہ بہتر تھا...... ہمیں تازہ ترین صورت حال کے متعلق علم ہو جاتا۔ بہرحال...... اس کا انتظار بھی نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس کا کچھ پتا نہیں، وہ کب آئے...... کب نہ آئے۔ اس لئے میں نے چال تو چل دی ہے۔ ہمارا سوار میدان میں نکل گیا ہے۔ اب دیکھیں نتیجہ کیا نکلتا ہے......؟'' شلندر نے مسکراتے ہوئے معنی خیز لہجے میں کہا۔

مہر جی واپس آئی تو وہ ہلکے آسمانی کلر کے شلوار سوٹ میں تھی اور شلوار قمیص میں اور بھی زیادہ حسین دکھائی دے رہی تھی۔ دوپٹہ اس نے اسکارف کی صورت سر پر

اور چہرے کے گرد لپیٹ رکھا تھا۔ وہ آ کر بیٹھی تو ہم سب آگے کھسک آئے اور پھر صدیوں کے بھوکوں کی طرح کھانے پر ٹوٹ پڑے۔ چاول پکے ہوئے تھے اور ایسے مزے کے تھے کہ میں نے آج تک اتنے لذیذ چاول نہیں کھائے تھے...... یا شاید یہ شدید بھوک کا کمال تھا۔ لیکن جو بھی تھا اس رات میں نے دل کھول کر کھایا تھا۔ خیرو کھانے کے ساتھ ایک ڈرم سائز کا تھرموس بھی رکھ گیا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد مہر جی نے برتن سمیٹ کر ایک طرف کر دیئے اور تھرموس اٹھا کر چائے کپوں میں انڈیلنے لگی۔

''انکل......! میں تو کہتی ہوں کہ ہمیں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ آج رات ہی محل میں گھس جاتے ہیں ورنہ جب مہاراج کو معلوم ہوگا کہ اس کے شکاری کتے ہمارا شکار کرنے میں ناکام رہے ہیں تو وہ اور بھی زیادہ محتاط ہو جائے گا اور ہمارے لئے اچھی خاصی سردردی پیدا ہو جائے گی۔'' مہر جی نے تھرموس ایک طرف رکھا اور چائے اٹھا کر شلندر کو پکڑا دی۔

''ہونے دو اسے محتاط...... میں نے سارا بندوست کر لیا ہے اس کی عقل پر پردے ڈالنے کا...... محتاط ہو کر بھی وہ نقصان ہی اٹھائے گا۔''

''کیا بندوبست کیا ہے آپ نے......؟''

''اس بات کو فی الحال رہنے ہی دو...... میں سمے سے پہلے کچھ نہیں کہنا چاہتا۔''

''شلندر صاحب......! آپ کا اطمینان دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کوئی بہترین لائحہ عمل ترتیب دے چکے ہیں لیکن اس کے متعلق ہمیں بھی تو کچھ علم ہونا چاہئے کہ آپ نے کیا سوچا ہے، کیا کیا ہے......؟ اور...... کیا کرنا چاہتے ہیں......؟'' میں نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔

''بات درست ہے شلندر......!'' ڈاکٹر عقیل نے کہا۔

''تم اتنا سسپنس کری ایٹ کر رہے ہو آخر بتا کیوں نہیں دیتے......؟''

''بھئی...... پہلے تو آپ لوگ یہ بتائیں کہ آپ لوگوں کو مجھ پر بھروسہ ہے یا

نہیں......؟''

''بھروسہ نہ ہوتا تو تم سے مدد کی درخواست ہی نہ کرتے۔''

''دوسرا تم لوگوں کو ممی چاہیے......؟''

''ظاہری سی بات ہے اور یہاں کیا ہم پکنک منانے آئے ہیں۔''

''تو بس پھر خاموشی سے دیکھتے جائیں کہ کیا ہوتا ہے......؟ دو دن کے اندر اندر ممی آپ لوگوں کی تحویل میں ہوگی۔''

''مگر جو طریقہ کار آپ نے اختیار کیا ہے اس میں رسک بہت زیادہ ہے......؟'' پروفیسر نے کہا تو شلندر نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ وہ براہِ راست شلندر کی آنکھوں میں جھانک رہے تھے۔

''کیا مطلب پروفیسر......؟''

''مطلب صاف ہے...... ہم لوگ محل تک پہنچنے سے پہلے ہی اوپر بھی پہنچ سکتے ہیں...... ایسا نہ ہو کہ وہ لوگ ہماری بجائے ہماری لاشیں مہاراج کے چرنوں میں جا ڈالیں۔'' پروفیسر نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے کہا اور شلندر کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہ حیرت و بے یقینی سے پروفیسر کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''آ...... آپ کو کیا خبر کہ میں نے کیا سوچا ہوا ہے......؟''

''شلندر میاں......! تم نے صرف سوچا ہی نہیں اپنی سوچ پر عمل بھی کر ڈالا ہے...... کھیل یہاں بھی جاری ہے اور تمہارا سوار تو اب تک منزل پر بھی پہنچ چکا ہوگا۔ ہے نا......؟''

''آپ کو کیسے علم ہوا......؟'' شلندر متحیر یانہ انداز میں بولا تو پروفیسر مسکرا کر رہ گئے۔

''شلندر صاحب......! پروفیسر بڑی کمال چیز ہیں۔ ان کی حسیات حیرت انگیز حد تک تیز ہیں۔ اسی باعث انہیں اکثر اوقات ایسے دورے پڑتے ہیں کہ جن کے دوران ان پر الہام ہوتے ہیں۔'' عارب نے ہنستے ہوئے کہا۔ شلندر حیران نظروں سے پروفیسر کو دیکھ رہا تھا۔

''پروفیسر......! کیا آپ کوئی اندیشہ محسوس کر رہے ہیں......؟'' میں نے سنجیدگی سے پروفیسر کو مخاطب کیا۔

''نہیں......! ایسی بات تو نہیں۔ شلندر کا منصوبہ تو اچھا ہے لیکن اس میں اسی فیصد خطرہ ہے۔ ہم لوگ نا قابل تلافی نقصان بھی اٹھا سکتے ہیں۔'' پروفیسر کپ سے آخری گھونٹ لے کر کپ واپس رکھتے ہوئے بولے۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں پروفیسر......! آپ کی بات بھی درست ہے۔ بظاہر میرا یہ طریقہ کار موت کے مترادف ہے مگر میں نے بہت سوچ وچار کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے اور میں پوری طرح مطمئن ہوں۔''

''تو بس پھر یہ قصہ ختم کریں۔ آپ مطمئن ہیں تو ہم بھی مطمئن ہیں۔'' اختر نے کہا۔

''ویسے اب تک میں سینکڑوں کیس حل کر چکا ہوں مگر یہ کیس میری زندگی کا انوکھا کیس ہوگا کہ ایک صدیوں پرانی لاش کے لئے اتنا کھڑاگ پھیل رہا ہے۔''

''اوں ہو......!'' پروفیسر تیزی سے بولے۔

''شلندر میاں......! احتیاط برتو...... مریاقس کو لاش کہہ کر اس کی بے حرمتی نہ کرو۔'' پروفیسر کی بات پر شلندر ایک بار پھر حیران رہ گیا۔

''کیا مطلب پروفیسر......! آپ کہنا کیا چاہتے ہیں......؟''

''کمال کرتے ہیں آپ بھی پروفیسر......! بھلا ایک لاش کو لاش نہ کہا جائے تو اور اسے کیا کہیں......؟'' اختر نے ناگواری سے کہا تو پروفیسر بھڑک اٹھے۔

''تم تو اپنی چونچ بالکل ہی بند رکھو احمق انسان...... کم عقل بنیاد پرست......!''

''کیوں......؟ اس میں کم عقلی یا بنیاد پرستی کی کیا بات ہوئی......؟ کیا یہ حقیقت نہیں کہ وہ ہزاروں سال پہلے مرگئی تھی۔''

''اسے سمجھاؤ......! تم لوگ سمجھاؤ اسے...... یہ جاہل اپنے ساتھ ساتھ ہمیں بھی کسی عذاب میں مبتلا کرادے گا۔'' پروفیسر تلملاتے ہوئے بولے۔

''اختر ......! خاموش ہو جاؤ......!'' میں نے اختر سے کہا اور وہ منہ بنا کر رہ گیا۔ مہر جی اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ بیٹھے بیٹھے حرام مغز سلگنے لگا ہے اور آنکھوں کے آگے دھند سی پھیلنے لگی ہے۔ اسی وقت مہر جی کی آواز میری گنبد سر میں گونجی۔

''انکل......! میں کچھ نقاہت محسوس کر رہی ہوں۔ سر چکرا رہا ہے میرا......!''

اس کے جواب میں بھی کوئی بولا تھا مگر میرا شعور الفاظ اور لہجے کی تمیز کھو بیٹھا تھا۔ سو میں نہ سمجھ سکا کہ وہ بولنے والا کون ہے؟ اس کے بعد میں حواس کھو بیٹھا۔ حواس کی آخری ہچکیوں تک میں یہ نہیں سمجھ پایا تھا کہ میرے ساتھ یہ ہوا کیا ہے؟

☆☆☆

ہوش آیا تو میں نے خود کو حالات نما پنجرے میں پایا۔ اس پنجرے میں میرے ساتھ اختر، عارب اور پروفیسر تھے۔ میری طرح وہ تینوں بھی ہوش میں آچکے تھے۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

''کہیں شکیل صاحب......! مزاج شریف کی......؟'' عارب نے مسکرا کر کہا۔

''وہ...... وہ پروفیسر اور شلندر......''

''ہم ادھر ہیں۔'' میری بات درمیان میں ہی رہ گئی۔ میں نے تیزی سے پلٹ کر دیکھا۔ سلاخوں کی دوسری طرف تقریباً دس فٹ کے فاصلے پر ایک ایسا ہی پنجرہ تھا جس کی سلاخوں کے پیچھے پروفیسر، شلندر، مہر جی اور ڈاکٹر عقیل کھڑے دکھائی دے رہے تھے۔ میں لپک کر سلاخوں تک پہنچ گیا۔ یہاں صرف یہ دو پنجرے ہی نہ تھے بلکہ آمنے سامنے دونوں اطراف دو قطاروں کی صورت کتنے ہی پنجرے تھے اور ان پنجروں کے درمیان ایک دس فٹ کی راہ داری سی تھی۔ ہمارے علاوہ بھی چند پنجروں میں کچھ لوگ بند تھے جو زندہ انسان کم اور ڈھانچے زیادہ لگ رہے تھے۔

''شلندر صاحب......! یہ...... یہ کیا ہے......؟'' میں نے مضطربانہ انداز میں کہا۔

''قید خانہ......!'' شلندر مسکرا دیا۔

''مہاراجہ رام پرشاد کا قید خانہ......؟''

''اوہ......یعنی......'' میں مزید کچھ نہ کہہ پایا۔

''یہاں کا کھانا ہم ہضم نہیں کر پائے۔ یہ دوسرا موقع ہے۔'' عارب نے کہا۔
میں نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا دیا۔

''خیرو کی خیر ہو۔ دعائیں کیجئے اس کے لئے۔'' میں نے رخ بدل کر شلندر کو مخاطب کیا۔

''کیا یہ قید خانہ راج محل میں ہی ہے......؟''

''ہاں......! اس وقت ہم راج محل کی عمارت کے نیچے ہیں...... ہمارے اور ممی والے تابوت کے درمیان صرف اس قید خانے کی دیوار حائل ہے۔''

''ہاں...... اور اس تک پہنچنا ہمیں کبھی نصیب نہیں ہوگا۔'' عقیل نے گہری سانس لی۔

''بہت جلد عقیل بن عاص......تم دیکھتے جاؤ ہم بہت جلد نہ صرف اس تابوت تک پہنچ جائیں گے بلکہ تابوت یہاں سے نکال لے جائیں گے۔''

''سپنے دیکھنے پر کوئی پابندی نہیں...... دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے۔ ویسے تو اب یہاں سے زندہ نکلنے سے رہے۔''

''اگر مہاراج کو ہماری موت مقصود ہوتی تو ہمیں یہاں لانے کا کشٹ نہ کیا جاتا بلکہ وہیں بے ہوشی کے عالم میں ایک ایک گولی ہمارے لئے کافی ثابت ہوتی۔'' شلندر نے پُریقین انداز میں کہا۔

''اب کسی بھی خوش فہمی کو مت پالنا۔''

''میں اگر خوش فہمیوں کے جھولے جھولنے والوں میں سے ہوتا تو اب تک جیسے جیسے پنگوں میں الجھتا رہا ہوں، کب کا سورگ باسی ہو چکا ہوتا۔''

''ان لوگوں کی عقل میں بات نہیں آئے گی شلندر میاں......! بہرحال پہلے قدم کی کامیابی پر میری طرف سے مبارک باد قبول کرو۔'' پروفیسر نے کہا تو شلندر تیزی سے بولا۔

''پروفیسر صاحب......! ابھی نہ میں کچھ کہوں گا اور نہ ہی آپ اس بارے میں کچھ بولیں اور مناسب بھی یہی رہے گا کہ اس موضوع پر فی الحال ہم خاموش ہی رہیں۔''

''ہاں......تمہاری یہ دور اندیشی بھی بہتر ہے۔'' پروفیسر نے سنجیدگی سے کہا۔

''پتہ نہیں کیا کھچڑی پکا رہے تھے۔ ہم دشمن کی قید میں تھے اس کے رحم و کرم پر آگئے تھے اور وہ کامیابی اور مبارک بادوں کی باتیں کر رہے تھے۔ میں نے وقت دیکھنا چاہا تو چونک پڑا گھڑی غائب تھی......جیبیں بھی خالی تھیں......خبیث کے بچوں نے ایک کاغذ کا ٹکڑا تک نہیں چھوڑا تھا۔ میں نے شلندر کے ساتھ والے پنجرے میں دیکھا۔ بائیں طرف چار اور دائیں طرف والے میں دو آدمی بند تھے۔ ان کے اوپری دھڑ ننگے تھے۔ جسم پر ایسے نشانات تھے جیسے انہیں گرم دہکتی سلاخوں سے داغا گیا ہو۔ ان کے جسموں کی خشک سیاہ کھال ان کی پسلیوں سے چپکی ہوئی تھی اور تمام ہڈیاں یوں ابھری ہوئیں تھیں جیسے وہ قحط کے مارے ہوئے ہوں۔ تمام کے تمام ننگے فرش پر مرداروں کی طرح پڑے تھے...... داڑھیاں، مونچھیں اور سر کے بال بے ترتیبی سے بڑھے ہوئے تھے۔

ان کی حالت دیکھ کر مجھے ہول اٹھنے لگے۔ یقیناً جب وہ یہاں لائے گئے ہوں گے وہ بھی ہماری طرح تندرست و توانا اجسام کے مالک رہے ہوں گے۔ یہاں پتہ نہیں ان کے ساتھ کیسا کیسا سلوک برتا گیا ہوگا؟ انہوں نے کیسی کیسی اذیتیں اٹھائی ہوں گی کہ آج وہ اس حال کو پہنچ گئے تھے۔ تو......تو کیا ہمارا حال بھی......؟ میں جھرجھری لے کر رہ گیا اور پیچھے ہٹ کر بیٹھ گیا۔

شلندر وغیرہ بھی فرش پر بیٹھے ہوئے تھے۔ شلندر اور عقیل بدستور آپس میں الجھے ہوئے تھے۔ عقیل کہہ رہا تھا۔

''شلندر......! مجھے سمجھاؤ تو سہی کہ تم اتنے دعوے سے کیسے اور کیوں کہہ رہے ہو کہ مہاراج ہمیں زندہ چھوڑ دے گا......؟''

''پاگل ہوگئے ہو......؟ یہ میں نے کب کہا کہ وہ ہمیں زندہ چھوڑ دے

گا......؟ میں نے تو یہ کہا ہے کہ فی الوقت وہ ہمیں ہلاک نہیں کرے گا یعنی ابھی ہماری زندگی محفوظ ہے۔"

"یعنی دوسرے لفظوں میں تمہارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ابھی وہ ہمیں بطور مہمان رکھے گا......؟"

"مہمان نہیں دُشمن......! وہ بھی دُشمن خاص......! پہلے وہ ہمیں طرح طرح کی اذیتیں دے گا، ہمیں تکلیفیں پہنچائے گا، ہم پر سائنٹفک فہم کا تشدد کرائے گا تا کہ اس کی حیوانی فطرت کی تسکین ہو سکے اور جب اذیتیں سہہ سہہ کر ہم دم توڑ دیں گے تب وہ ہماری کھالوں میں بھس بھروا کر، ہماری کھالیں اور ہمارے استخوانی ڈھانچے اپنے عجائب خانے میں اس سونے کے مجسمے کے ساتھ رکھوا دے گا اور ہمارے ڈھانچوں کی گردنوں میں ایک ایک تختی لٹکا دی جائے گی جس پر ہماری کوششوں اور ہمارے انجام کے حالات درج ہوں گے۔" شلندر نے بڑے مزے سے آخر تک کی قیاس آرائی کر دی اور عقیل اسے یوں گھورنے لگا جیسے کچا ہی چبا جائے گا۔

"منحوس آدمی......! شکل اچھی نہیں تو کم از کم بات تو اچھی کر لو کیسے بے ہودہ اور فضول قیاس آرائی کر رہے ہو۔"

"عقیل بن عاص......! یہ کوئی قیاس آرائی نہیں حقیقت ہے میں تمہیں مہاراج کی سوچ سے آگاہ کر رہا ہوں کہ ہمارے متعلق وہ کیا وچار رکھتا ہے......؟"

"تم کیا کوئی نجومی ہو جو دوسروں کی سوچوں کو سمجھ رہے ہو......؟"

"بات نجومی کی نہیں ہے میرے دوست......! کامن سینس بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ مہاراج جس ذہنیت، جس نفسیات کا آدمی ہے ایسا شخص اس کے علاوہ کچھ سوچ بھی نہیں سکتا۔"

"بس رہنے دو......لگتا ہے کہ آج شرلاک ہومز تمہارے سر پر زیادہ ہی سوار ہے۔"

بائیں طرف کونے کی جانب بے کچھ آہٹوں کی آواز بلند ہوئی تو شلندر نے سبھی کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ یقیناً کوئی آیا تھا۔ میں اختر اور عارب سیدھے ہو

کر بیٹھ گئے۔ پھر قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ کوئی ایک آدمی نہیں بلکہ اچھے خاصے افراد آ رہے ہیں۔

قدموں کی چاپ آہستہ آہستہ قریب آ رہی تھی اور پھر آنے والے حوالات کے سامنے آ رکے۔ دس خونخوار قسم کے آدمی تھے جن کے ہاتھوں میں دو نالی بندوقیں نظر آ رہی تھیں اور ان سے آگے جو شخصیت تھی وہ سو فیصدی بھیم سنگھ تھا۔

بھیم سنگھ......! جو محل کے اندرونی امور کا انچارج تھا۔ شکل سے ہی بڑا خطرناک درندہ صفت آدمی معلوم ہوتا تھا۔ چند لمحے وہ اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے ہمیں گھورتا رہا پھر پلٹ کر شلندرا اور دوسرے لوگوں کی جانب متوجہ ہوگیا۔

''ماں کے دینو......! بڑے بے ہو کر بیٹھے ہو...... کیا باپو کے ویواہ میں آئے ہو......؟'' اس کی آواز بھی اس کے چہرے کی طرح خشک اور کرخت تھی۔ کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پھر وہ مہر جی کی طرف متوجہ ہوگیا۔

''ماتا ہری......! یہ تم نے اپنا چہرہ بگاڑنے کا کشٹ کیوں کیا ہے......؟ جب یہاں پلٹ کر آ ہی رہی تھی تو یہ ذمہ داری ہمارے کندھوں پر ڈال دینا تھی۔ ہم اس طرح تمہاری صورت بگاڑتے کہ کوئی مائی کا لعل بھی پہچان نہیں پاتا۔ جبکہ اب تو...... اس حلیے میں تم کو کوئی اندھا بھی پہچان لیوے گا۔'' وہ چند لمحے کو خاموش ہوا پھر کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

''ویسے میرا خیال ہے کہ مہاراج تمہارے ساتھ خصوصی رعایت برتیں گے۔'' لہجہ بڑا معنی خیز تھا۔

''بھیم سنگھ......! مہاراج نے تمہیں یہاں بھیج دیا ہے۔ کیا خود مہاراج کو ہمت نہیں ہوئی ہمارا سامنا کرنے کی......؟'' مہر جی نے بڑے پُروقار انداز میں کہا۔

''دھیرج سے...... ذرا دھیرج سے کام لو ماتا ہری......! مہاراج سے بھی سامنا ہو جائے گا اور ہمت شبد کے معنی تو تم لوگوں کو میں سمجھاؤں گا۔''

''اس شبد کے معنی تو ابھی تم خود نہیں سمجھ سکے بھیم سنگھ......! ہمیں کیا سمجھاؤ گے......؟''

''چنتا نہیں کرو ...... سب سے پہلے میں تمہیں ہی اپنی ہمت دکھاؤں گا۔''

''اور کیا دکھاؤ گے بھیم سنگھ ......! ہم نہتے بے بس اور سلاخوں کے پیچھے قید ہیں۔ اس کے باوجود تم دس دس مسلح افراد کے گھیرے میں ہمارے سامنے آئے ہو...... ہم دیکھ رہے ہیں تمہارا حوصلہ...... واقعی ہی بڑے بہادر اور باہمت جوان ہو۔'' مہر جی کے لہجے میں بڑی کاٹ تھی۔

بھیم سنگھ تلملا کر رہ گیا۔

''بکواس نہیں کر کتیا......! کہیں ایسا نہ ہو کہ میں ابھی تجھے باہر نکال لوں۔''

مہر جی نے ایک نظر شلندر کی طرف دیکھا۔ پتہ نہیں آنکھیں کیا بولیں کہ وہ خاموش ہو رہی۔

''تم میں شلندر کون ہے......؟'' اس نے خشک لہجے میں پوچھا۔

''وہ ہمارے ساتھ نہیں تھے۔'' جواب مہر جی نے ہی دیا تھا۔

''بھونکتی ہے تو...... ہمیں سب خبر ہے...... اتنے نادان نہیں ہیں ہم...... خیرو نے ہمیں پہلے ہی بتا دیا تھا کہ شلندر بھی تم لوگوں کے ساتھ ہے۔''

''خیرو کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہو گی۔''

''اچھی بات ہے......!'' بھیم سنگھ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ پھر وہ رخ بدل کر اپنے ایک ساتھی سے مخاطب ہوا۔

''روشن ان کے سامان میں جو بیگ تھا اس میں ''کلینزنگ لوشن'' کی ایک بوتل بھی ہے وہ لے آؤ اور ان کے چہرے دھلانے کا پربندھ کرو۔'' روشن سر ہلاتا ہوا واپس چلا گیا۔

''ابھی پتہ چل جائے گا کہ شلندر کہاں ہے......؟'' اس نے خباثت سے مسکراتے ہوئے کہا۔ کچھ ہی دیر بعد روشن واپس آ گیا۔ ایک بوتل اور ایک تولیہ اس کے ہاتھوں میں تھا۔

''چلو پہلے یہ والا تالا کھولو......!'' وہ ہماری جانب متوجہ ہو گیا۔ ایک شخص چابیوں کا گچھا لے کر آگے آ گیا جب کہ باقی سب اپنی اپنی جگہ پر الرٹ ہو گئے۔

''اگر کوئی ذرا بھی پھرتی دکھانے کی کوشش کرے تو بلا جھجک گولی چلا دینا۔''
اس نے سفاک لہجے میں اپنے ساتھیوں کو مخاطب کیا پھر وہ ہم لوگوں سے مخاطب ہوا۔

''تم لوگوں کے لئے بہتر یہی ہوگا کہ آرام و سکون سے اپنے ''تھوبڑے'' صاف کروا لو۔ بصورت دیگر اپنی زندگیوں کے نقصان کے ذمہ دار تم لوگ خود ہوگے۔''

ایک گینڈے نما انسان نے دروازہ کھولا اور پیچھے ہٹ کر کھڑا ہوگیا۔ روشن نے اپنی بندوق اسے تھمائی اور خود اندر آ گیا۔ اس گینڈے نے جلدی سے دروازہ بند کیا اور اپنے ساتھیوں کی طرح ہم پر بندوق تان کر کھڑا ہوگیا۔

اب ان کا ایک ساتھی حوالات کے اندر تھا اور نو آدمی ہم پر بندوقیں سیدھی کئے کھڑے تھے جبکہ بھیم سنگھ ایک طرف دونوں ہاتھ کولھوں پر رکھے کھڑا تھا۔ ہوٹل والے تہہ خانے میں ان کے سات آدمی مہر جی کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ شاید اسی وجہ سے اس بار وہ ضرورت سے زیادہ محتاط ہو رہے تھے۔ روشن نے سب سے پہلے مجھے ہی منتخب کیا۔ وہ میرے چہرے پر لوشن مل رہا تھا اور میں آنکھیں بند کئے بے حس و حرکت بیٹھا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے تولیہ سنبھالا اور اچھی طرح رگڑ کر میرا چہرہ صاف کرنے لگا کچھ ہی دیر بعد وہ ہٹ کر ایک طرف کھڑا ہوگیا۔

''ہوں...... تو یہ آپ ہیں ڈاکٹر شکیل ظفر......!'' بھیم سنگھ نے گہری چبھتی ہوئی نظروں سے مجھے گھورا۔ پھر وہ روشن سے مخاطب ہوا۔

''تو کھڑا کیا کر رہا ہے......؟ چل دوسرے کا چہرہ صاف کر۔'' اور روشن جلدی سے اختر کی جانب متوجہ ہوگیا۔ اس کا چہرہ رگڑنے کے بعد وہ عارب کی جانب متوجہ ہوگیا۔ لوشن ملنے کے بعد جب وہ تولیے سے عارب کا چہرے رگڑنے لگا تو عارب نے اس کا ہاتھ پکڑ کر جھٹک دیا۔

''اُلو کے پٹھے......! میرا چہرہ ہے کوئی پتھر نہیں...... ذرا ہولے......!'' باہر کھڑے مسلح افراد اس کی اس حرکت پر چونک پڑے تھے۔ بھیم سنگھ کی آنکھیں بھی

ایک ذرا کشادہ ہوگئی تھیں۔ مگر عارب کی بات سن کر ان کے تاثرات اعتدال پر آ گئے۔

''واہ......! میرے لٹھے کے تھان......! تو تو بڑا نازک مزاج لگتا ہے۔'' بھیم سنگھ استہزائیہ انداز میں بولا۔

روشن تولیہ لئے دوبارہ آگے بڑھا تو عارب نے اس کی کلائی تھام لی۔ اور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے غرایا۔

''روشن میاں......! ذرا آہستہ ورنہ تمہاری کلائی توڑ ڈالوں گا۔''

''او...... پاٹے خان......! زیادہ نواب صاحب بننے کی کوشش نہیں کرو ورنہ بھیجے میں سوراخ ہو جائے گا۔'' بھیم سنگھ نے کہا۔

''بھیم سنگھ......! یہ ہمارا آپس کا معاملہ ہے۔ تم بیچ میں مت بولو۔ اگر گولیاں چلانے کا زیادہ شوق ہے تو بندوق پکڑو اور چلا دو مجھ...... زیادہ ڈرانے دھمکانے کی ضرورت نہیں۔'' عارب نے لاپرواہی سے کہا اور روشن کی کلائی چھوڑ دی۔ وہ بڑی احتیاط سے عارب کا چہرہ صاف کرنے لگا اور کچھ ہی دیر بعد عارب کی اصل صورت دکھائی دینے لگی۔

''اوہ......!'' بھیم سنگھ چونکا۔

''نیورو سرجن ڈاکٹر عارب علی تیمور......! ہمیں بتایا گیا تھا کہ تم بڑے اکھڑ قسم کے آدمی ہو...... اچھی بات ہے...... بہت اچھی بات ہے۔''

اس گینڈے نے دروازہ کھولا اور روشن تولیہ، بوتل سنبھالتا ہوا باہر نکل گیا۔ فوراً ہی دروازہ بند کر کے تالا لگا دیا گیا۔ پھر وہ سب دوسری حوالات کی طرف متوجہ ہوگئے۔ مسلح افراد نے بندوقوں کا رخ اس حوالات کی طرف کر دیا اور روشن حوالات کے اندر چلا گیا۔

اس نے سب سے پہلے تولیہ پروفیسر کے چہرے پر رکھا۔ پھر مہر جی پھر ڈاکٹر عقیل اور آخر میں شلندر کی باری آئی۔ اپنا کام نبٹا کر وہ جلدی سے باہر نکل آیا اور حوالات کے دروازے پر دوبارہ تالا ڈال دیا گیا۔ بھیم سنگھ کی نظریں شلندر پر جمی

ہوئی تھیں۔

''باقی سب کا ریکارڈ تو ہمارے پاس محفوظ ہے میرے لئے صرف تم ہی انجان ہو اور یقیناً تم ہی شلندر ہو۔ سراغ رساں شلندر رائے ہریچہ......!'' بھیم سنگھ نے فاتحانہ انداز میں کہا۔

''فرض کرو اگر میں ہی شلندر ہوں تو پھر کیا کیا جائے......؟'' شلندر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ بھیم سنگھ منہ سے کچھ نہیں بولا، سر ہلاتا ہوا واپسی کے لئے پلٹ گیا۔ مسلح افراد بھی اس کے پیچھے چل دیئے۔ قدموں کی چاپ لمحہ بہ لمحہ دور ہوتی گئی اور کچھ دیر بعد سناٹا چھا گیا۔

وہ چلے گئے مگر ہمارے لئے وسوسے اور اندیشے چھوڑ گئے، ایک اضطراب تھا جو لہو کی گردش میں کھولنے لگا تھا۔ نہ جانے کیا ہونے والا تھا......؟ آنے والے لمحات اپنے جلو میں کیا لے کر آنے والے تھے...... ایک دھڑکا سا لگ گیا تھا۔ اگر کوئی پوری طرح مطمئن تھا...... یا مطمئن اور بے فکر دکھائی دے رہا تھا تو وہ شلندر ہی تھا۔

وقت دھیرے دھیرے...... ثانیہ بہ ثانیہ گزرتا رہا اور ممکنہ خطرات کے اندیشے ہمیں ہلکان کرتے رہے۔ کئی گھنٹے یونہی گزر گئے ہم لوگوں کے درمیان کوئی خاص یا اہم گفتگو نہیں ہوئی۔ ایک اندازہ تھا کہ موجودہ رات کے بعد دن کے ساتھ ساتھ رات بھی خاصی گزر گئی ہے۔ مگر لگتا تھا جیسے وہ ہم لوگوں کو بھول ہی گئے ہوں۔ کوئی بھی نہ آیا تھا۔ نہ کھانا نہ پانی...... حلق میں صحرائی کانٹے سے پھنسے معلوم ہوتے تھے اور بھوک کی شدت سے جیسے کلیجہ خون میں گھلنے لگا تھا کیونکہ مجھے اپنے حلق میں کلیجی کا ذائقہ محسوس ہو رہا تھا۔ جسم کے جوڑ جیسے ان پچیس تیس گھنٹوں میں ہی جواب دے گئے تھے۔ کبھی ہم اس چھوٹی سی حوالات میں ٹہلنے لگتے، کبھی لیٹ کر کمر سیدھی کرنے لگتے۔ عجیب بے بسی میں وقت گزر رہا تھا۔

کسی کہنے والے نے درست کہا ہے کہ نیند سولی پر بھی آ جاتی ہے۔ ہم سب کا اس قید میں اس محاورے پر کامل یقین ہو گیا۔ کچھ دیر کے لئے سو جانے کا مشورہ شلندر نے ہی دیا تھا۔ جسے ہم سب نے قبول کر لیا۔ کیونکہ نیند آ بھی رہی تھی اور ہم

سب خود کو اعصابی طور پر مضمحل بھی محسوس کر رہے تھے۔ سو فرش پر ہی لمبے لمبے لیٹ گئے۔ اب یہ معلوم نہیں کہ وہ نقاہت کی غنودگی تھی یا کہ حقیقی نیند۔

بہر حال کچھ دیر کی کسمساہٹ کے بعد ہم لوگ گرد و پیش اور اپنے آپ تک سے بے خبر ہو گئے۔ سوتے وقت ذہن میں صرف یہی سوچ چکرا رہی تھی کہ ہمیں مغلظات کے گیت سنا کر نیند سے بیدار کیا جائے گا مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ باری باری ہم سب از خود ہی بیدار ہو گئے تھے۔ جس وقت میری آنکھ کھلی، میری حوالات میں اختر اور دوسری طرف پروفیسر اور مہر جی پہلے سے بیٹھے ہوئے تھے جبکہ عارب، عقیل او رشلندر ابھی سو رہے تھے۔

اختر ٹھوڑی دائیں ہتھیلی پر ٹکائے فریفتہ نظروں سے مہر جی کو تک رہا تھا اور وہ غصے سے تلملا رہی تھی لیکن شاید شلندر اور عقیل کی نیند کے خیال سے خاموش بیٹھی تھی ورنہ لگتا یہی تھا کہ وہ اختر کو بڑی کھری کھری سنانا چاہتی ہے۔ البتہ پروفیسر مراقبے کی سی کیفیت میں تھے۔

اختر کی مستقل نگاہوں کی آنچ سے تنگ آ کر مہر جی قدرے رخ پھیر کر بیٹھ گئی۔ اس کے اس طرح رخ پھیر لینے پر اختر قدرے مضطرب سا ہو گیا۔ چند ایک بار اس نے بے چینی سے پہلو بدلا پھر منہ سے شی شی کی آوازیں نکالنے لگا۔ مہر جی نے گھور کر اس کی طرف دیکھا تو وہ اس کے سامنے ہاتھ جوڑنے لگا اور اشاروں کی مدد سے کہنے لگا کہ رخ میری طرف کر لو۔ مہر نے پاؤں سے سینڈل اتارا اور اختر کو دکھاتے ہوئے اشارے سے مخاطب ہوئی کہ اب اگر تم خاموش نہیں ہوئے تو میں یہ تمہارے منہ پر کھینچ ماروں گی۔ وہ دوبارہ رخ پھیر کر بیٹھ گئی اور اختر اٹھ کر سلاخوں کے قریب جا کھڑا ہوا۔

''شی شی ...... شی ...... ہش......!'' مہر جی اس کی شِشکاروں پر بھوکی بلی کی طرح اس کی جانب پلٹی۔ بس ایک جھلک ہی دکھائی دی تھی، اس کے دائیں ہاتھ میں سینڈل تھا۔ وہ ہاتھ بجلی کی طرح حرکت میں آیا اور اختر تڑپ کر ایک طرف ہو گیا۔ ورنہ اضطراری انداز میں بھی مہر جی کا نشانہ بڑا باکمال تھا۔ سینڈل بندوق سے نکلی

ہوئی گولی کی طرح سلاخوں کے درمیان سے گزر کر اندر آیا۔ اختر تو ایک طرف ہٹ گیا تھا۔ سینڈل کسی بم کی طرح سوتے ہوئے عارب کی پیشانی پر آپڑا۔ ایک تو سینڈل ہارڈ سول کا تھا، دوسرا دونوں دروازوں کی سلاخوں سے ٹکرائے بغیر سیدھا عارب کی پیشانی پر آ کر لگا تھا اور تیسرا یہ کہ وہ بیچارہ بے خبر گہری نیند کے مزے لے رہا تھا۔ سو اس افتاد ناگہانی پر وہ بری طرح ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ شاید وہ خواب بھی کوئی ڈراؤنا دیکھ رہا تھا۔ اس کے حلق سے ایسی بھیانک دھاڑ بلند ہوئی کہ میں دہل کر رہ گیا۔ دوسری طرف پروفیسر بھی بوکھلا گئے۔ مہر جی گڑبڑا گئی اور عقیل...... شلندر بھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔

''کک...... کک...... کون ہے......؟''

''کک...... کیا ہو گیا......؟'' ان بیچاروں کی حالت خراب تھی۔ عارب اپنی جگہ ایک ہاتھ سے پیشانی اور دوسرے سے سینڈل پکڑے حیران پریشان بیٹھا تھا اور میرے دل میں قہقہے مچل رہے تھے۔ ڈاکٹر عقیل کے بے ربط جملے کے جواب میں اختر مسکین سی صورت بنا کر بولا۔

''عارب بھائی، کیا ہاں ہوا ہے۔''

''کیا...... کیا ہوا ہے......؟'' ڈاکٹر عقیل ابھی سنبھل نہیں پائے تھے۔

''مہر جی کا سینڈل......!'' شلندر اور عقیل استفہامیہ انداز میں مہر جی کی طرف دیکھنے لگے اور عارب غصے سے پیچ و تاب کھاتا ہوا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''کیا بدتمیزی ہے......؟ کیا...... کیا بیہودگی ہے یہ......؟'' وہ غصے سے دھاڑا۔ اس کی کشادہ پیشانی پہ ایک چھوٹا سا گومڑ نمودار ہو گیا تھا۔

''یہ کوئی طریقہ ہے......؟''

''مہر......! کیا حرکت ہے یہ......؟'' شلندر نے گہری سنجیدگی سے مہر جی کو مخاطب کیا۔

''وہ...... وہ انکل میں نے اختر کو جوتا مارا تھا مگر...... عارب صاحب کے لگ گیا۔'' مہر جی خاصی خجل دکھائی دے رہی تھی۔

''تا......تو آپ کیا یہاں اپنی موسی کے گھر تشریف فرما ہیں جو''پیٹھوگرم'' کی مشقیں کر رہی ہیں......؟''

''سوری عارب صاحب......!'' وہ براہِ راست عارب سے مخاطب ہوئی۔

''سوری عارب صاحب......! میرے ماتھے پر پکوڑا بنا کر رکھ دیا ہے اور یہ سوری کہہ کر بری الذمہ ہوگئیں۔'' عارب نے مینڈک کی طرح منہ پھلاتے ہوئے کہا اور ایک طرف بیٹھ گیا۔

''مہر......! تمہیں اندازہ ہونا چاہیے کہ ہم کس صورت حال کا شکار ہیں اور کہاں پڑے ہیں......؟'' شلندر نے بدستور سنجیدگی سے کہا۔

''انکل......! مجھے صرف اندازہ نہیں پورا علم اور پورا پورا ادراک ہے کہ صورت حال کتنی سنگین ہے۔''

''تبھی اس بچپنے کا مظاہرہ کیا ہے......؟''

''انکل......! اس میں میرا کوئی قصور نہیں......!''

''تو کیا تم پر کوئی بدروح مسلط ہوگئی تھی......؟''

''مجھے...... مجھے اختر نے اس حد تک زچ کر دیا تھا کہ میں نے اس پر جوتا کھینچ مارا۔''

''میں کئی بار تمہیں سمجھا چکا ہوں کہ تمہاری سب سے بڑی کمزوری یہی ہے۔ اپنے جذبات پر قابو پانا سیکھو۔''

شلندر مہر جی کو سمجھا رہا تھا۔ عارب اختر پر برس پڑا۔

''تم ساری زندگی بچے کے بچے رہ جانا......کبھی نہ سدھرنا......!''

''عارب بھائی......! میں نے ایسا کیا کہہ دیا ہے......؟'' وہ معصومیت سے بولا۔

''کیا کہہ دیا ہے......؟ یعنی تم نے کچھ کہا ہی نہیں......تمہیں کچھ علم ہی نہیں......؟'' عارب ایک جھٹکے سے سیدھا ہو بیٹھا۔ اس نے پیشانی کی طرف اشارہ کیا۔

''کیا یہ تمہیں دکھائی نہیں دے رہا کہ یہ کیا ہے......؟''

''پیشانی ہے......!''

''یہ...... یہ پیشانی کے اوپر کیا ہے......؟'' عارب نے پیشانی پر ابھر آنے والے گھومڑ پر انگلی رکھی۔

''یہ...... یہ چھوٹی پیشانی ہے۔'' اختر کے جواب پر بے اختیارانہ سبھی مسکرا دیئے مگر عارب کے تاثرات دیکھ کر فوراً ہی مسکراہٹوں کو دبا لیا گیا۔

''بکو مت......!'' عارب بھڑک اٹھا۔

''یہ ٹین ایجر والی چھچھوری حرکتیں چھوڑ دو۔ ایسی حرکتوں سے کوئی لڑکی متاثر نہیں ہوتی۔''

''مگر عارب بھائی......! میں کسی لڑکی کو متاثر کرنے کی کوشش تو نہیں کر رہا تھا۔'' اختر کے چہرے پر گہری معصومیت پھیلی ہوئی تھی۔

''تو یہ سینڈل بلاوجہ ہی یہاں تک آ گیا تھا......؟''

''میں نے تو مہر جی سے صرف اتنا کہا تھا کہ میری طرف دیکھتی رہیں کیونکہ بھوک پیاس کی اذیت سے میرا دم نکل رہا تھا۔''

''تو وہ کیا وہاں بیٹھی چرغہ اڑا رہی تھی جس کی تمہیں اس نے دعوت نہیں دی تھی......؟'' اس بار عارب کے بولنے سے پہلے میں بول پڑا۔

''نہیں وہ...... بات دراصل یہ تھی کہ جب مہر جی کا چہرہ میری نگاہوں کے سامنے ہوتا ہے تو مجھے اور کسی چیز کا ہوش نہیں رہتا۔ اس لئے میں نے مہر جی سے کہا تھا کہ آپ رخ میری طرف کئے بیٹھی رہیں تاکہ میں بھوک پیاس کے احساس سے بچا رہا ہوں مگر...... انہوں نے خفا ہو کر سینڈل کھینچ مارا۔'' ڈاکٹر عقیل دوسری طرف سے بولے۔

''تم بھوکے تھے اسی لئے تو مہر نے سینڈل تمہیں مارا ہے کہ فی الحال سینڈل کھا کر گزارہ کرو۔''

''تو اس پر بھی کب تک گزارہ کرے گا......؟ انجام آخر کار فاقہ زدہ لاش ہی

ہوگی۔ جیتے جی اب یہاں سے نکلنا نصیب نہیں ہوگا۔'' عارب نے کہا۔

''اور اس کا ذمہ دار میں ہوں گا۔'' شلندر نے کہا۔

''آپ نہیں اس کے ذمہ دار یا تو شکیل صاحب ہوں گے یا پھر وہ منحوس تابوت جس کے چکر میں ہم لوگ یہاں تک آ پہنچے ہیں۔'' اختر نے کہا۔

''اوہ ملعون......! خبیث......! بدبخت انسان......! کیوں خود پر عرصہ حیات تنگ کر رہا ہے تو...... کیوں کرب ناک موت کو آوازیں دیتا ہے......؟ اپنی زبان کو لگام ڈال......!'' پروفیسر پر فرط غضب کا لرزہ طاری ہوگیا۔ اختر نے بڑی ناگواری سے پروفیسر کی طرف دیکھا۔ وہ پروفیسر کی ایسی بے سرو پا باتوں سے بڑی خار کھاتا تھا۔ اگر وہ جواب میں مزید کچھ کہتا تو ماحول میں بہت زیادہ کشیدگی پیدا ہو جاتی۔ یہی سوچ کر میں نے اسے درگزر کر جانے کا اشارہ کیا اور وہ ہونٹ کاٹ کر رہ گیا۔

پروفیسر بیٹھے بیٹھے کپکپا رہے تھے۔ شلندر اور مہر جی متحیرانہ انداز میں پروفیسر کو دیکھ رہے تھے۔

''پروفیسر......! ضبط سے کام لیں۔ اتنا ایگزسٹ ہونے والی کون سی بات ہے......؟'' شلندر نے کہا۔

''یہ...... یہ نامعقول...... کم عقل...... اس مقدس تابوت کے متعلق کیسے نجس الفاظ استعمال کرتا ہے...... میں...... میں بار بار اسے منع کرتا ہوں مگر یہ مانتا ہی نہیں۔''

''چلیں کوئی بات نہیں آپ درگزر سے کام لیں۔''

''شلندر میاں......! انہیں حقیقت کا علم ہی نہیں...... نہ ہی یہ حقیقت پر یقین کرنے کو تیار ہیں۔ اندازہ نہیں کہ اس مقدس تابوت میں کتنی عظیم ہستی ہے...... عہد فراعنہ کا ایک زندہ وجود...... فرعون اخناتون کی بیٹی...... مریاقس......!''

''حوصلہ پروفیسر......! حوصلہ......'' شلندر کے تاثرات بڑے عجیب تھے۔ شاید اسے پروفیسر کی ذہنی حالت پر شبہ ہونے لگا تھا۔ بڑی مشکلوں سے پروفیسر کی حالت اعتدال پر آئی۔

کچھ دیر کی گہری خاموشی کے بعد شلندر پروفیسر سے مخاطب ہوا۔

''پروفیسر......! یہ صورت حال میرے منصوبے سے متصادم ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب ہمیں کوئی اور قدم اٹھانا چاہئے...... آپ کی کیا رائے ہے......؟''

''جو قدم بھی اٹھاؤ...... سوچ سمجھ کر اٹھانا۔''

''میرا خیال ہے اب یہاں سے نکلنے کی کوشش کرنی چاہئے۔'' شلندر رخ بدل کر مہر جی سے مخاطب ہوا تو مہر جی سے پہلے عارب بول پڑا۔

''کیوں......؟ کیا انڈر گراؤنڈ سرنگ کھود کر نکلنے کا ارادہ ہے......؟''

''بالکل نہیں......! جس طرح ہم لوگ یہاں آئے ہیں ویسے ہی یہاں سے نکل بھی جائیں گے۔''

''باتوں سے آپ بہت بڑے جادوگر معلوم ہوتے ہیں۔'' عارب کا لہجہ طنزیہ تھا۔ شلندر کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔

''مائی ڈیئر عارب......! اگر میں تم لوگوں کو ان سلاخوں کے پیچھے لے کر آسکتا ہوں تو یہاں سے باہر بھی نکال سکتا ہوں۔''

''کیا مطلب......؟''

''آپ کہنا کیا چاہتے ہیں......؟'' ہم سب کی سوالیہ نظروں کا مرکز شلندر ہی تھا۔

''مطلب یہ کہ یہاں ہمیں ان لوگوں نے قید نہیں کیا بلکہ ہم خود قید ہوئے ہیں اور ایسا میں نے بہت سوچ بچار کے بعد کیا ہے وگرنہ یہ لوگ ہم پر کبھی بھی قابو نہیں پا سکتے تھے۔'' شلندر چند لمحے کے توقف کے بعد گویا ہوا۔

''دراصل بات یہ تھی کہ چوری چھپے محل میں داخل ہو کر اور بغیر کسی کی نظروں میں آئے مہاراج کی خواب گاہ تک پہنچنا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ سو میں نے ایک منصوبہ بنایا...... مہاراج ہم سے بڑی حد تک خائف ہے اسی وجہ سے وہ ہماری موت کے درپہ تھا۔ اس کی طرف سے بھیجے گئے موت کے ہرکارے رام پور تک آنے والے و، حد راستے میں گھات لگائے بیٹھے تھے اور کچھ لوگ ہماری کوٹھی کی

نگرانی پر مامور تھے۔ ہم وہاں سے نکلے تو ہم سے پہلے ہمارے اس طرف آنے کی خبر ان لوگوں تک پہنچ گئی۔ جس کی وجہ سے ان لوگوں نے شکیل صاحب، پروفیسر، اختر اور مہر کو راستے میں ہی دھر لینے کی کوشش کی مگر یہ لوگ بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔

ہم لوگ ان سے بچ کر حویلی تک پہنچنے میں اس لئے کامیاب ہو گئے تھے کہ ہم نے شہر سے نکلنے سے پہلے ہی گاڑی بدل لی تھی۔ رانی جو کہ اب بھی راج محل میں ہی ہے اس نے مجھے خبر دی تھی کہ مہاراج ویسے تو ہمیں زندہ قابو کرنا چاہتا ہے۔ مگر اس طرح کی ایک کوشش اسے پہلے ہی بہت مہنگی پڑ چکی تھی۔ اس لئے وہ دوبارہ کوئی رسک نہیں لینا چاہتا تھا۔ سو اس نے ہماری موت کا پروانہ جاری کر دیا۔ میں نے سوچا کہ اگر ہم بے بس ہو جائیں تو مہاراج ہمیں موت کے گھاٹ اتارنا کبھی بھی گوارہ نہیں کرے گا بلکہ ہمیں زندہ پکڑ کر اپنے سامنے اذیتیں دے دے کر مارے گا۔ اس لئے میں نے مہاراج کے ساتھ ایک ڈرامہ کھیلا۔ خیرو کو کہہ کر میں نے چائے میں بے ہوشی کی دوا ملا دی اور خیرو کو راج محل مہاراج کے پاس بھیج دیا کہ جا کر مہاراج کو بتا دے کہ کھیر تیار ہے ہاتھ صاف کر لو حالانکہ اس میں رسک بھی بہت تھا مگر مجھے وشواس تھا کہ نتیجہ میری توقع کے مطابق نکلے گا اور وہی بات ہوئی۔ مہاراج کے کتے ہمیں از خود محل کے اندر اس قید خانے تک لے آئے۔

میرا خیال تھا کہ مہاراج جب یہاں آئے گا تو ہم اس کو بندی بنا لیں گے اور تابوت لے اڑیں گے مگر یہاں صورت حال میری توقع کے خلاف نکلی۔ میں سمجھ رہا ہوں یہ لوگ ہمیں بھوکا پیاسا رکھ کر جسمانی و اعصابی طور پر اس حد تک ناکارہ کر دیں گے کہ ہم میں ہلنے جلنے کی سکت بھی نہ رہے۔ تب مہاراج ہمارے سامنے آئے گا اور ایسی صورت میں ہم زندہ نہ بچ سکیں گے۔ لہٰذا اس سے پہلے ہی ہمیں یہاں سے نکلنے کی کوشش کرنا ہوگی۔" شلندر خاموش ہو گیا۔

کچھ دیر تک خاموشی پھیلی رہی۔ پھر ڈاکٹر عقیل کی آواز خاموشی میں رخنہ انداز ہوئی۔

''شلندر...... ! تمہارا منصوبہ تو بڑا جاندار تھا لیکن اگر ذرا بھی کہیں کوئی کمی بیشی ہو جاتی تو اس وقت ہم سارے عالم بالا میں بیٹھے ہوتے۔''

''میرے ہوتے ہوئے ایسا ممکن نہ تھا۔'' شلندر مسکرایا۔

''تم بھی تو ہمارے ساتھ ہی مردوں کی طرح یہاں تک آئے ہو۔ اگر وہ لوگ ہمیں ہلاک کرنا چاہتے تو ہمارے ساتھ ساتھ تم بھی ٹائیں ٹائیں فش ہو گئے ہوتے۔''

''میں یہاں تک تم لوگوں کے ساتھ آیا ضرور ہوں مگر مردوں کی طرح نہیں بلکہ اپنے ہوش و حواس کے ساتھ آیا ہوں۔''

''کیا مطلب......؟'' تم نے بھی تو چائے پی تھی۔''

''ہاں...... ! چائے ضرور پی تھی مگر شاید اس دوران تم میں سے کسی نے نوٹ کیا ہو کہ چائے پینے سے پہلے میں نے کپ میں ایک ٹیبلٹ ڈالی تھی...... وہ بے ہوشی کی دوا کا اثر زائل کرنے کے لئے تھی۔''

''بڑے خبیث ہو...... یقیناً تم شرلاک ہومز کے ریکارڈ توڑو گے...... بہرحال یہ بتاؤ کہ اب کیا پروگرام ہے......؟ کیا یہاں سے نکلا جا سکتا ہے......؟''

''یہ کوئی ایسا مشکل کام نہیں ہے۔ اصل مسئلہ کچھ اور ہے۔''

''وہ کیا......؟'' ہم سب پوری طرح شلندر کی جانب متوجہ ہو گئے۔

''مہاراج کے عجائب خانے کو جانے والا راستہ مہاراج کی خواب گاہ سے جاتا ہے۔ یہ تو تم لوگوں کو علم ہے۔''

''ہاں بالکل......!''

''وہ آپ نے بتایا تھا۔''

''مسئلہ کیا ہے......؟''

''مہاراج کی خواب گاہ میں ایک اور خفیہ راستہ بھی ہے جو محل سے باہر ایک ایسی کوٹھی میں جا کر نکلتا ہے جو یہاں سے کچھ فاصلے پر واقعہ ہے ہم لوگ عجائب خانے سے تابوت نکال کر مہاراج کی خواب گاہ سے ہی اس دوسرے راستے کے

ذریعے محل سے باہر نکل جائیں گے۔''

''یہ تو سارا مسئلہ ہی حل ہو گیا...... سارے رستے ہی سیدھے ہو گئے۔'' میں نے مسرت سے کہا۔

''شکیل صاحب......! پہلے ان کی مکمل بات تو سن لیں مسئلہ تو ابھی انہوں نے بیان کیا ہی نہیں۔'' عارب نے مجھے ٹوکا۔

''ہاں...... یہ بات بھی ہے۔''

''مسئلہ ہے...... مہاراج کی خواب گاہ تک پہنچنے کا...... یہ علم نہیں کہ یہ قید خانہ محل کے کون سے حصے میں ہے اور اس کا راستہ کہاں جا کر نکلتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہاں سے نکلنے کے بعد مہاراج کی خواب گاہ تک پہنچنا کافی خطرناک ثابت ہوگا۔''

''کوئی بات نہیں۔ رب وارث ہے۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔'' میں نے اچھے خاصے سنگین مسئلے کو نظر انداز کر دیا۔ میرے لئے یہ احساس ہی بڑا خوش کن تھا کہ میں مریاقس تک پہنچنے والا ہوں۔ صدیوں پہلے کی اس شہزادی تک جو ہزاروں سال سے اذیتوں میں مبتلا ہے۔ جو کئی سو سال سے میری منتظر ہے۔ جس کی تمام تکلیفوں، مصیبتوں کا حل میری ذات میں پوشیدہ ہے۔ ایک فرعون زادی، سرزمین مصر کی بیٹی جو میری مدد کی طلب گار ہے۔ میں اس مریاقس تک پہنچنے والا تھا۔ رگوں میں دوڑتا ہوا خون اس احساس کے ساتھ ہی جیسے دھڑکنوں کی تال پر رگوں کے اندر جھومنے لگا تھا۔

''تو پھر کیا خیال ہے...... یہاں سے نکلا جائے......؟'' شلندر نے سب کی طرف تائید طلب نظروں سے دیکھا۔

''اگر ایسا ممکن ہے تو انتظار کس بات کا ہے......؟'' اختر نے کہا۔

''سوچ لیں...... باہر نکل کر ہم میں سے کوئی بھی یا سبھی گولی کا شکار بھی ہو سکتے ہیں۔'' شلندر بڑے خوب صورت طریقے سے ہمیں ذہنی طور پر ممکنہ خطرات سے نمٹنے کے لئے تیار کر رہا تھا۔

"یہاں فاقوں سے اکتا کر ایڑیاں رگڑتے ہوئے بے بسی و بے کسی کی موت مرنے سے بہتر ہے کہ یہاں سے باہر نکل کر گولی کا شکار ہو جائیں۔" عارب نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"تو ٹھیک ہے۔ تیار ہو جائیں۔" شلندر نے کہا اور رخ بدل کر مہر جی سے مخاطب ہوا۔

"تالا کھولنا ہے۔" مہر جی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اتر آئی۔ اس نے سر پر ہاتھ پھیرا اور "ہیئر پن" اتار کر شلندر کو تھما دی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر سلاخوں والے دروازے کے قریب آ گیا۔ ایک ذرا اس نے کسی قسم کی آہٹ محسوس کرنے کی کوشش کی پھر سلاخوں سے ہاتھ نکال کر تالا پکڑ لیا اور پن کی ہول میں داخل کر دی۔ ہم سب کی نظریں شلندر پر جمی ہوئی تھیں۔ کچھ دیر تو وہ پن والے ہاتھ کو حرکت دیتا رہا پھر اچانک ایک ہلکی سی آواز کے ساتھ تالہ کھل گیا۔

ہم سب اچھل کر کھڑے ہو گئے۔ شلندر نے تالہ ہٹایا اور آہستگی سے دروازہ کھول دیا۔ شلندر نے باہر نکل کر پہلے دائیں بائیں نگاہ دوڑائی پھر ہمارے دروازے تک آ گیا۔ کچھ ہی دیر بعد ہم لوگ بھی حوالات سے باہر تھے۔

"شلندر......! چھوٹے ہوتے کہیں تم چوریاں تو نہیں کرتے رہے......؟" ڈاکٹر عقیل نے حیرت سے کہا۔

"میں نوٹ کر رہا ہوں عقیل بن عاص......! کہ تم بڑی لچر قسم کی باتیں کرنے لگے ہو۔"

"تو یہاں فصیح و بلیغ گفتگو سے کیا حاصل ہوگا......؟ خیر مٹی ڈالو......آگے بولو کیا کریں......؟"

"آ جاؤ......!" شلندر بائیں طرف کو چل پڑا۔ پچیس تیس قدم کے فاصلے پر نظر آنے والی دیوار تک دونوں طرف سلاخوں والی کوٹھریاں سی بنی ہوئی تھیں۔ چند ایک میں کچھ زندہ کم مردہ قسم کے لوگ بے سدھ پڑے تھے۔ ہم دبے پاؤں آگے بڑھتے رہے۔ آخری حوالات کی اوٹ میں بائیں ہاتھ ہی ایک کونے میں چھ فٹ

زینے تھے جن کے اختتام پر ایک دروازہ دکھائی دے رہا تھا۔ دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔

شلندر نے ہمیں احتیاط کا اشارہ کیا اور سہج سہج قدم اٹھاتا زینوں کی جانب بڑھ گیا۔ ہم بھی اس کے پیچھے تھے۔ البتہ مہر جی تیزی سے میرے عقب سے نکل کر شلندر کے بالکل قریب پہنچ گئی۔ آخری زینے پر پہنچ کر شلندر نے ہمیں رکنے کا اشارہ کیا اور خود دروازے کی جھری سے اندر جھانکنے لگا۔

کچھ دیر بعد وہ سیدھا ہوا اور مہر جی کو اشارے سے بتانے لگا کہ بظاہر تو اندر ایک آدمی ہے مگر زیادہ بھی ہو سکتے ہیں اور میں اندر جا رہا ہوں۔ میرے جانے کے بعد تمہیں کیا کرنا ہے؟ ہم ایک تیز سنسنی کا شکار تھے۔

شلندر نے ایک گہری سانس کھینچی اور پھر ایک جھٹکے سے دروازہ کھولتا ہوا برق رفتاری سے اندر داخل ہو گیا۔ مہر جی اچھل کر کھلے ہوئے دروازے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

اندر سے دوبارہ عجیب و غریب آوازیں بلند ہوئیں پھر کسی کے کراہنے کی آواز ابھری اور ساتھ ہی کراہنے والا دروازے سے آ ٹکرایا۔ مہر جی پہلے ہی اس کی منتظر تھی۔ اس نے بھوکی بلی کی طرح جھپٹ کر اس آدمی کی گردن گرفت میں لی اور اسے اپنی جانب کھینچ لیا۔ ایک چیخ کی آواز آئی اور بندہ اچھلتا ہوا فرش پر آ رہا۔ اس کی گردن ٹوٹ چکی تھی۔

عقل سے ماوراء تھی مہر جی کی یہ تکنیک...... معلوم نہیں کیا جادو تھا اس کے ہاتھوں میں کہ اچھے خاصے سانڈ یل انسان کی گردن کو صرف چھوتی تھی اور اس کی ہڈی ٹوٹ جاتی تھی۔

''آ جائیں......!'' اس نے مطمئن انداز میں ہم سے کہا اور ہم زینے طے کرتے ہوئے دروازے سے اندر داخل ہو گئے۔ ایک اچھا خاصا کمرہ تھا جس کی دو دیواروں کے ساتھ کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ تیسری دیوار کے ساتھ ایک آرام دہ صوفہ رکھا تھا۔ دو ایک الماریاں، دیواروں کے ساتھ کچھ زنجیریں، ہک اور نہ جانے کیا کیا

تھا وہاں۔ یقیناً یہ عقوبت خانہ تھا جہاں مہاراج اپنے سامنے انسانوں کے ساتھ جانوروں جیسا سلوک کرواتا ہوگا۔ چوتھی دیوار کے ساتھ سے سیڑھیاں اوپر جاتی تھیں اور سیڑھیوں کے اختتام پر ایک ٹھوس لکڑی کا دروازہ تھا۔شلندر ایک طرف پڑی بندوق اٹھا رہا تھا۔ وہ بندوق اٹھا کر اس نے اختر کو تھما دی۔

''خیال رہے محل کے اندر اگر گولی چلنے کی آواز گونج اٹھی تو پھر ہمارا یہاں سے بچ نکلنا تقریباً ناممکن ہو جائے گا۔'' اختر کو بندوق تھماتے ہوئے بولا اور پلٹ کر ایک آہنی الماری کی طرف متوجہ ہوگیا۔ وہ لاک تھی۔ شلندر نے کالر میں لگائی ہوئی ہیئر پن نکالی اور الماری کا لاک کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔ کچھ ہی دیر کی کوشش میں لاک کھل گیا۔شلندر کے ہونٹوں پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ اتر آئی۔ اس نے ایک نظر ہماری طرف دیکھا اور الماری کے دونوں پٹ کھول دیئے۔ پوری الماری مختلف انواع اور زنجیروں اور ہتھیاروں سے بھری ہوئی تھی۔ ہتھکڑیاں، نائیلون کی رسیوں کے گچھے، پلاس، قینچی، ہنٹر، خنجر، جانے کیا کیا تھا۔ یقیناً یہ سب قیدیوں کو ایذاء پہنچانے کا سامان تھا۔

شلندر چند لمحے تک کچھ سوچتا رہا پھر اس نے ایک ہتھکڑی اٹھائی اور عقیل کی جانب اچھال دی جو اس نے فضا میں ہی کیچ کر لی۔

''سنبھال لو...... کام آئے گی۔'' پھر اس نے الماری میں نظر آنے والے تینوں خنجر نکال لئے۔ ایک خنجر اس نے مہر جی کو تھما دیا۔ دوسرا خود سنبھال لیا اور تیسرا خنجر ہماری طرف کر کے سوالیہ نظروں سے ہمیں دیکھنے لگا۔ وہ تیسرا خنجر عارب نے اس کے ہاتھ سے لے لیا۔

''اب اس دروازے سے ہم تہہ خانے سے نکل کر محل میں پہنچ جائیں گے۔''
شلندر نے دیوار کے آخر میں نظر آنے والے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

'' کچھ اندازہ نہیں کہ یہ تہہ خانہ محل کے کس کونے میں واقع ہے اور اس دروازے سے نکلنے کے کون سے حصے میں نکلیں گے۔ یہ بھی اندازہ نہیں کہ باہر رات کا سمے ہے یا دن کا...... لیکن ایک بات طے ہے کہ اگر ہم لوگ کسی بھی طرح مہاراج

کی خواب گاہ تک پہنچ گئے تو یوں سمجھو کہ سیونٹی پرسنٹ خطرے سے محفوظ ہو جائیں گے۔ لہٰذا ذہن میں رہے کہ ہماری پہلی کوشش یہی ہونی چاہئے کہ کسی کی نظروں میں آئے بغیر خواب گاہ تک پہنچ جائیں لیکن اگر اس دوران۔''

''نہیں......! ہم لوگوں کو پہلے خواب گاہ تک نہیں پہنچنا۔'' اختر نے شلندر کی بات کاٹ دی۔

''پہلے ہمیں راج محل کے کچن یا لنگر خانے کا رخ کرنا چاہئے۔ بھوک نے جسم کی ساری توانائی چوس لی ہے۔ مجھ سے تو کھڑا بھی نہیں ہوا جا رہا۔''

''تو ٹھیک ہے......تم یہاں لیٹ کر آرام کرو۔ ہم لوگ مہاراج کی خواب گاہ کی طرف جا رہے ہیں۔'' عارب نے سپاٹ لہجے میں کہا اور پھر شلندر سے مخاطب ہوا۔

''آپ آگے کہیں......!''

''میں کہہ رہا تھا کہ ہماری کوشش ہونی چاہئے کہ کسی کی نظروں میں آئے بغیر اپنی منزل تک پہنچ جائیں لیکن اگر کہیں کسی سے سامنا ہو جائے تو ہماری پوری کوشش ہو گی کہ کسی قسم کے کھڑاگ کے بغیر خاموشی سے اسے ٹھکانے لگا دیں۔''

''ٹھیک ہے......! بہت صحیح ہے۔'' عارب نے پوری طرح شلندر کی بات کی تائید کی۔

''مزید کچھ اس کے علاوہ......؟'' ڈاکٹر عقیل نے پوچھا۔

''نہیں بس......!''

''تو پھر آگے لگیں۔'' عارب نے کہا اور شلندر سیڑھیوں کی جانب بڑھ گیا۔ مہر جی اس کے ساتھ ساتھ تھی۔ اس کے پیچھے عارب اور آخر میں ڈاکٹر عقیل، اختر، پروفیسر اور میں۔ ہم دبے پاؤں زینے طے کرتے ہوئے دروازے تک پہنچے۔ شلندر نے دروازے پر دباؤ ڈال کر چیک کیا وہ بند تھا۔ نہ کوئی لاک نہ ہینڈل، نہ چٹخنی، کنڈی بس سپاٹ لکڑی کی دیوار تھی۔

''الیکٹرانک سسٹم......!'' شلندر نے خود کلامی کے سے انداز میں کہا اور

دروازے پر ہاتھ رگڑنے لگا۔ مگر کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ کچھ دیر کی کوشش کے بعد شلندر دونوں ہاتھ کولہوں پر رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی نظریں دائیں ہاتھ دیوار پر نظر آنے والے اس خلا پر جمی ہوئی تھیں جو دروازے کے بالکل ساتھ سے شروع ہوا تھا۔ خلا کی چوڑائی دو انچ اور لمبائی دروازے جتنی تھی۔ چند لمحے اس خلا کو گھورنے کے بعد شلندر اپنے دروازے میں موجود اس سٹیل لائن کی جانب متوجہ ہو گیا جو غالباً دروازے کی موومنٹ کے لئے تھی۔

''کیا کوئی مسئلہ ہے......؟'' ڈاکٹر عقیل کے لہجے میں تشویش تھی۔

''دروازہ الیکٹرانک سسٹم کے زیر تحت کھلتا ہے مگر نہ کسی ہک کا کوئی نشان ہے اور نہ ہی کوئی بٹن وغیرہ دکھائی دے رہا ہے۔'' شلندر نے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔ خنجر ان تینوں کے ہاتھوں میں دبے ہوئے تھے۔

''پھر...... اب کیا ہوگا......؟'' شلندر کوئی جواب دینے کی بجائے گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ دروازے کی لکڑی سے ایک باریک تار نکل کر دائیں طرف خلا میں گم ہوتی دکھائی دے رہی تھی۔ شلندر نے وہ تار پکڑ کر کھینچنا چاہی مگر شاید تار کی لمبائی اتنی ہی تھی۔ اس نے نہایت احتیاط سے تار پکڑی اور خنجر کی نوک سے اس پر یوں پھیرنے لگا جیسے تار کو گدگدی کر رہا ہو۔

چند لمحوں بعد وہ مزید جھک گیا اور رباریک بینی سے تار کو دیکھتے ہوئے اپنا کام کرتا رہا۔ کچھ دیر بعد وہ رک گیا اور خنجر کی دھار تار پر رکھ کر ہلکا سا دباؤ ڈالا۔ غالباً خنجر ی ننگی تاروں سے چھو گیا تھا۔ کیونکہ شلندر کو واضح جھٹکا لگا تھا۔ خنجر کا دستہ بھی دھاتی تھا۔ تار سے چند چنگاریاں پھوٹیں خنجر اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا وہ خود جھٹکے سے گڑبڑا گیا مگر اس ہلکے سے جھٹکے سے مسئلہ حل ہو گیا دروازہ بے آواز انداز میں ایک ذرا ہماری جانب سرکا اور پھر دائیں طرف دیوار میں نظر آنے والے خلا میں سرکتا چلا گیا۔ باہر جانے کا راستہ کھل گیا تھا۔

کھلے دروازے کی دوسری جانب ویلوٹ کا سبز رنگ کا پردہ جھول رہا تھا۔ شلندر نے اپنا خنجر اٹھایا اور جلدی سے کھڑا ہو گیا۔ اس نے ہلکا سا پردہ ہٹا کر دوسری

جانب دیکھا۔ پھر پلٹ کر سرگوشی کے انداز میں مہر جی سے مخاطب ہوا۔

''اکیلا بھیم سنگھ ہے بالکل سامنے بیٹھا شراب پی رہا ہے اور اس کا رخ بھی ہماری جانب ہے۔ آواز نہیں ہونی چاہئے۔'' خنجر اس نے مہر جی کے ہاتھ سے لے لیا اور مہر جی سر ہلاتی ہوئی ایک قدم آگے بڑھ گئی۔ شلندر ایک طرف ہوگیا اور وہ پردے کی اوٹ سے دوسری جانب جھانکنے لگی۔ کچھ دیر بعد اچانک اس نے پردہ اٹھایا اور اندر داخل ہوگئی۔ ہمارے دل دھک سے رہ گئے۔ اگر بھیم سنگھ چیخ پڑا تو ابھی بیسیوں مسلح افراد یہاں پہنچ جائیں گے اور ہم اوپر...... '' پردہ ہٹا اور مہر جی کا مسکراتا ہوا چہرہ دکھائی دیا۔

''آجائیں......!'' اس نے مطمئن انداز میں کہا اور ہم حیران پریشان اندر داخل ہوگئے۔ اتنی جلدی کیا ہوسکتا تھا......؟ محض چند سیکنڈ ہی تو گزرے تھے۔

ہم اندر داخل ہوئے تو ہماری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ بالکل سامنے سنٹر ٹیبل پر شراب کے لوازمات دکھائی دے رہے تھے اور ٹیبل کے ساتھ ہی بھیم سنگھ عجیب بے تکے انداز میں پڑا تھا۔ اس کا جسم ہولے ہولے لرز رہا تھا...... یقیناً اس کی گردن ٹوٹ چکی تھی۔

''عارب اس کو تہہ خانے میں پھینک دو۔'' شلندر نے عارب کو مخاطب کیا۔

''مہر......! دروازہ......'' شلندر نے کھلے ہوئے دروازے کی جانب اشارہ کیا تو مہر جی نے لپک کر دروازہ بند کر دیا۔ ایک طرف کھڑکی بھی تھی جو ڈاکٹر عقیل نے بند کر کے آگے پردے کھینچ دیئے۔ عارب نے بھیم سنگھ کے نیم مردہ وجود کو ٹانگوں سے پکڑ کر گھسیٹا، میں نے پردہ ہٹایا اور اس نے اسے تہہ خانے کی سیڑھیوں پر لڑھکا دیا۔ شلندر نے آگے بڑھ کر جانے کیا کیا کہ کھلا ہوا دروازہ بے آواز دوبارہ بند ہوگیا اس کے بعد اس نے نیچے بیٹھ کر دروازے کی نیچے والی جھری میں خنجر کا پھل ڈالا کچھ ٹٹولا پھر ایک جھٹکے سے خنجر کھینچ لیا اور مطمئن انداز میں اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

''اب یہ دروازہ نہیں کھلے گا۔''

''ہم لوگ اب کدھر جائیں گے......؟''

''ہمیں پائین باغ کا رخ کرنا ہے۔''

''میرا خیال ہے کہ یہ کھڑکی پائین باغ میں ہی کھلتی ہے۔'' میں نے فوراً کہا۔

''اور لگتا ہے کہ قسمت کی دیوی بھی مہربان ہے کیونکہ باہر اندھیرا ہے۔ یقینی بات ہے کہ رات کا وقت ہے۔'' شلندر نے دیواروں پر نظر دوڑائی۔ بائیں ہاتھ دیوار پر کلاک دکھائی دے رہا تھا جس کی سوئیاں ڈھائی بجے کا وقت بتا رہی تھیں۔

''یعنی رات کے ڈھائی بج رہے ہیں اور ہمارے پاس ڈھائی گھنٹے ہی ہیں اس کے بعد اجالا پھیل جائے گا۔ ہمیں ڈھائی گھنٹے کے اندر اندر تابوت لے کر یہاں سے نکلنا ہوگا ورنہ خاصی مشکل ہو جائے گی ابھی تو مہاراج رام پرشاد بھی اپنی خواب گاہ میں ہی ہوگا۔ ہمارا کام مزید آسان ہو جائے گا۔ اس نے مجھے انسانی سروں کا تحفہ بھیجا......'' شلندر کا لہجہ زہریلا ہوگیا۔

''ہم جتنی جلدی کریں گے ہمیں اتنی آسانی رہے گی۔ اس رات کے اندھیرے میں جو کرنا چاہتے ہو کر گزرو، صبح کی روشنی کے ساتھ حالات خطرناک ہو جائیں گے۔'' پروفیسر نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''تو پھر بھگوان کا نام لے کر آجاؤ......!'' شلندر کھڑکی کی طرف بڑھا۔

''ہم تو خدا کا نام لیں گے......!'' اختر بے ساختہ بول پڑا۔

''اوہ یس......! آئی ایم سوری......!'' شلندر مسکرایا۔ پھر مہر جی سے مخاطب ہوا۔

''لائٹ آف کر دو......!''

مہر جی نے فوراً آگے بڑھ کر دو چار بٹن پریس کئے تو کمرے میں گاڑھا اندھیرا بھر آیا۔ اندھیرے میں پہلے پردے کی سرسراہٹ ابھری پھر کھڑکی کھلنے کی ہلکی سی آواز...... کھڑکی کھلتے ہی چاند کی زرد کرنیں تاریکی کو زخما گئیں۔ کھڑکی کے پٹوں میں تو شیشے لگے ہوئے تھے البتہ فریم قدیم طرز کا تھا۔ نہ جالی اور نہ ہی سلاخیں۔ یقینی بات تھی کہ محل کی تمام کھڑکیاں اسی طرز کی رہی ہوں گی اور یہ ہمارے

حق میں بہتر ہی تھا۔ مہاراج کی خواب گاہ تک پہنچنے میں کسی قسم کی دقت نہ ہوتی۔

''شکیل صاحب......! آپ کا اندازہ درست ہے۔ یہ واقعی پائین باغ ہے۔'' شلندر نے کہا۔

''چلیں آگے بڑھیں......!'' عارب کا لہجہ ایسا تھا جیسے وہ جلد از جلد اپنا کام ختم کر کے محل سے نکلنا چاہتا ہو۔ شلندر نے ایک ذرا باہر سر نکال کر چاند کی بیمار اور مدھم روشنی میں ماحول کا جائزہ لیا۔ اور پھر کھڑکی سے باہر کود گیا۔ اس کے بعد عارب پھر میں، میرے بعد پروفیسر اور پھر عقیل، اختر اور مہر جی بھی باری باری کود آئے۔

دیوار کے ساتھ ساتھ جانے کون سی جنس کے پھول دار پودے لگے ہوئے تھے۔ فضا میں بڑی ہی مسحور کن خوشبو رقص کرتی پھر رہی تھی۔ چاند کی دم توڑتی روشنی میں باغ میں لگے درختوں کے ہیولے یوں لگ رہے تھے جیسے بے شمار پہریدار کھڑے ہوں۔

ہم پھول دار پودوں کے ساتھ دبکے بیٹھے تھے۔

''اب آگے بڑھیں یا یہیں بیٹھے رہنے کا ارادہ ہے۔'' عارب نے بے زاری سے کہا۔

''یہاں لازمی دو چار پہرے دار موجود ہوں گے پہلے ہمیں ان کی پوزیشنیں دیکھنا ہوں گی اور ان کو ٹھکانے لگانا ہوگا۔'' شلندر نے یہاں بیٹھنے کی معقول وجہ بتائی۔

''آپ آگے بڑھیں جب کوئی سامنے آئے گا تو اسے دیکھ لیں گے۔''

''عارب......! عجلت میں اٹھائے گئے قدم ہمیشہ الٹے پڑتے ہیں۔ احتیاط اچھی چیز ہے۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔

''تو یہاں بیٹھے رہنے سے کیا ہوگا......؟ کیا وہ خود چل کر آئیں گے کہ لو بھائی......! ہم آگئے ہیں، ہمیں ٹھکانے لگا دو۔''

''عارب......! میں مہاراج کی خواب گاہ کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا ہوں کیونکہ پہرے دار ہوئے تو اس کے آس پاس ہی ہوں گے...... عقبی طرف کھلنے

والی کھڑکی کے قریب ہی کہیں۔" عارب خاموش ہو رہا۔ پھر کچھ دیر تک ہم سب دم سادھے بیٹھے رہے۔

"یہ دائیں طرف..... ذرا دیکھیں مجھے لگتا ہے کہ وہ کوئی انسان ہی ہے۔" شلندر کی سرگوشی پر ہم لوگ دائیں طرف متوجہ ہو گئے۔ ہم سے کچھ ہی فاصلے پر وہ متحرک ہیولہ دکھائی دے رہا تھا جو یقیناً پہرے دار ہی تھا اس کا رخ ہماری سمت تھا۔

"ہاں..... یقیناً یہ کوئی پہرے دار ہے۔"

"راؤنڈ لے رہا ہے۔"

"اور آ بھی ادھر ہی رہا ہے۔" جسموں میں سنسنی کی لہریں دوڑ گئیں اور ہم پھول دار پودوں میں سمٹنے لگے۔

"مہر.....! ہوشیار رہنا۔" شلندر نے سرگوشی کی اور ہم آہستہ آہستہ رینگتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ تقریباً بیس قدم کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ شلندر تیز سرگوشی میں بولا۔

"ہوشیار.....! وہ پھر آ رہا ہے۔" اور ہم پودوں میں گھس کر بیٹھ گئے۔ پہرے دار بڑی ترنگ میں معلوم ہوتا تھا۔ دھیمی آواز میں کوئی غزل گنگنا رہا تھا۔ وہ بالکل ہمارے قریب آ گیا۔ محض تین قدم کے فاصلے پر اور پھر واپس پلٹ گیا۔ اس کے پلٹتے ہی شلندر اپنی جگہ سے اٹھا اور جھکے جھکے انداز میں اس کے پیچھے چل پڑا۔ خنجر اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس بیچارے کے فرشتوں کو بھی علم نہ تھا کہ موت اس کے تعاقب میں صرف چند قدم کے فاصلے پر دبے پاؤں آگے بڑھ رہی ہے۔

شلندر نے اچانک عقب سے اس پر چھلانگ لگائی اور اسے ساتھ لئے نیچے گھاس پر آ رہا۔ ہم سب تیزی سے آگے بڑھ گئے۔

اس غریب کا قصہ پاک ہو چکا تھا۔ شلندر گھٹنوں کے بل ایک طرف بیٹھ گیا۔ پہرے دار بری طرح تڑپ رہا تھا۔ اس کی شہ رگ سے خون ابل رہا تھا اور کٹی ہوئی شہ رگ سے بڑی بھیانک قسم کی خرخراہٹیں خارج ہو رہی تھیں۔ شلندر نے خون

آلود خنجر اس کے کپڑوں سے صاف کرتے ہوئے کہا۔

''اسے پودوں کے عقب میں ڈالنا ہے۔'' شلندر نے اس کی ٹانگیں گرفت میں لے لیں۔

''اور یہ کارتوس والی پیٹی بھی اتار لو۔ ہوسکتا ہے کہیں ضرورت پڑ جائے۔'' اختر نے جلدی سے اس کی کمر کے گرد بندھی پیٹی اتار کر اپنی کمر سے باندھ لی۔ شلندر اور عارب نے اس کا بے حس ہوتا وجود اٹھا کر پودوں کے عقب میں دیوار کے ساتھ ڈال دیا۔

ہم ایک بار پھر آگے رینگ گئے۔ تھوڑا آگے رینگنے کے بعد ہمیں ایک بار پھر اپنی اپنی جگہ رکنا پڑا۔ کچھ ہی فاصلے پر ایک گھنے درخت کے نیچے پڑے سنگی بینچ پر دو ہیولے بیٹھے دکھائی دے رہے تھے اور ان کے بولنے کی ہلکی ہلکی آواز ہمارے کانوں تک بھی پہنچ رہی تھی۔

''سب لوگ یہیں رکیں گے، مہر......! تم میرے ساتھ آجاؤ......!'' شلندر نے دھیمے لہجے میں کہا اور آگے رینگ گیا۔ مہر جی بھی کسی ناگن کی طرح گھاس پر رینگتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ وہ دونوں ان کی پیٹھ پر پہنچ گئے تھے اور ہم اپنی اپنی جگہ دم سادھے بے حس و حرکت پڑے تھے۔

اچانک شلندر اور مہر جی عقب سے ان دونوں پر جھپٹے۔ شلندر کا خنجر والا ہاتھ بلند ہوا۔ ایک ہلکی سی چمک پیدا ہوئی تھی۔ مہر جی نے جھپٹ کر دوسرے کی گردن دبوچی تھی سو فیصدی اس بیچارے کو علم بھی نہیں ہوا ہوگا کہ کب اور کیسے اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹی۔

آگے کا راستہ صاف ہو چکا تھا سو ہم جلدی سے آگے بڑھ گئے۔ دونوں کے پھڑپھڑاتے جسموں کو عارب اور اختر نے اٹھا کر پودوں کے عقب میں ڈال دیا۔ کارتوسوں کی ایک پیٹی اختر نے اپنی کمر کے ساتھ باندھی اور دوسری کندھے سے لٹکا لی جبکہ ایک بندوق لاشوں پر پھینک دی گئی اور دوسری میں نے اٹھا لی۔

''یہ ایک پیٹی مجھے دے دو......!'' میں نے اختر کو مخاطب کیا اور اس نے

کارتوس کی پیٹی کندھے سے اتار کر مجھے تھما دی جو میں نے کمر کے گرد باندھ لی۔

''یقینی بات ہے کہ یہ کھڑکی مہاراج کی خواب گاہ کی ہے۔'' شلندر نے عقب میں نظر آنے والی کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔ جس سے نائٹ بلب کی مدہم روشنی جھلک رہی تھی۔

''پھر کیا ارادہ ہے......؟''

''اب ہمیں اس کھڑکی سے اندر داخل ہونا ہے۔ مگر خیال رہے کوئی آہٹ نہیں پیدا ہونی چاہئے۔''

''چلیں آگے بڑھیں......!'' ہم سب اکٹھے ہی کھڑکی کی طرف بڑھے۔ دل بری طرح دھڑک رہا تھا کہ اگر ہمیں کسی نے دیکھ لیا یا مہاراج چیخ پڑا، شور مچ گیا تو انجام کیا ہوگا......؟

''سب سے پہلے شلندر ہی اندر داخل ہوا۔ اس کے بعد مہر جی پھر ڈاکٹر عقیل۔ وہ اندر پہنچے تو میں نے اپنی بندوق انہیں تھما دی اور خود بھی اچھل کر اندر داخل ہوگیا۔ پھر باری باری پروفیسر، عارب اور اختر بھی اندر آگئے۔ اختر نے وہ آہنی کھڑکی بند کی اور پردے کھینچ دیئے۔

اچھی خاصی وسیع وعریض خواب گاہ تھی۔ ہمارے قدموں تلے بڑا دبیز قالین تھا۔ دیواروں پر پردے جھول رہے تھے۔ ایک طرف جہازی سائز کے پلنگ پر مہاراج جی بڑے چوڑے ہوکر لیٹے نیند کے مزے لوٹ رہے تھے نہ جانے کون سے جذبے، کون سے احساس کے تحت اسے دیکھتے ہی میرا خون کھول اٹھا۔ رگوں میں چنگاریاں سلگ اٹھیں۔

مہر جی فوراً اس کے سرہانے موت کی دیوی بن کر کھڑی ہوگئی۔ شلندر اس کے دائیں طرف اور میں پائینتی کی جانب۔ شلندر نے اشارہ کیا اور ڈاکٹر عقیل نے دیوار پر بٹن پریس کرنا شروع کر دیئے۔ اچانک ہمارے سروں پر لٹکتا فانوس روشن ہوگیا۔ پوری خواب گاہ تیز روشنی سے لبالب ہوگئی۔ خدشہ تھا کہ آنکھ کھلتے ہی ہم لوگوں کو دیکھ کر وہ چیخ پڑے گا مگر ہم نے اسے چیخنے کا موقع ہی نہیں دیا۔

روشنی کی کرنوں نے اس کے پپوٹوں پر دستک دی تو اس نے کسمساتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔ ہم پر نظر پڑتے ہی وہ بوکھلا گیا۔ اس نے ہڑبڑا کر اٹھنے کی کوشش کی۔ مہر جی ایسی ہی صورت حال کے پیش نظر اس کے سر پر کھڑی تھی۔ اس نے عقب سے اس کی گردن دبوچی اور اپنی جانب کھینچ لیا۔

میں اچھل کر پلنگ پر چڑھ گیا۔ مہر جی نے پتہ نہیں اس کی گردن کی کون سی رگ دبائی تھی کہ اس کا منہ غار کی طرح کھل گیا مگر اس کے حلق سے چیخ نہ نکل سکی۔ میں نے برق رفتاری سے بندوق کی نال اس کے کھلے ہوئے منہ میں گھسیڑ دی۔ عارب اور شلندر نے جھپٹ کر اس کے دونوں بازو گرفت میں لے لئے اور میں نے اپنا پاؤں اس کی پنڈلی پر رکھ دیا۔ بس پل بھر میں وہ بری طرح ہمارے شکنجے میں جکڑا جا چکا تھا۔

اس کی آنکھیں حیرت اور دہشت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ چہرے پر خوف اور تکلیف کے آثار منجمد ہو کر رہ گئے۔

''آواز نہیں رام پرشاد......! اگر تمہاری سانس کی بھی آواز بلند ہوئی تو یاد رکھنا دوسرے سانس سے پہلے تمہاری روح تمہارے اس غلیظ وجود کو دھتکار کر چلی جائے گی۔'' مجھے اپنی آواز بڑی نامانوس لگی تھی۔ رام پرشاد نے اثبات میں سر ہلانے کی کوشش کی تو میں نے بندوق کی نال اس کے منہ سے نکال لی۔ مہر جی نے فوراً بائیں ہاتھ سے اس کی زلفیں گرفت میں لے لیں اور دائیں ہاتھ سے خنجر اس کی گردن پر رکھ دیا۔

''اٹھو...... ہمیں اپنے عجائب خانے کی سیر کراؤ'' میں نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

''کک...... کک...... کس کارن......؟'' اس کی حالت بڑی دگرگوں تھی۔ مہر جی نے خنجر کا دباؤ ذرا سا بڑھا دیا۔ اس کا منہ کھل گیا۔

''کارن جاننے کے چکر میں پڑ کر زندگی گنوا بیٹھو گے۔''

''تت...... تم لوگ...... تہہ خانہ سے کیسے نکلے......؟ بھب...... بھیم سنگھ کہاں

تھا.....؟'' جواباً میں نے بندوق کی نال اس کے سینے میں ماری تو وہ کراہ کر رہ گیا۔

''موت کی نیند سو رہا ہے وہ تہہ خانے میں اور اگر تم نے زیادہ بک بک کی تو مجبوراً ہم تمہیں بھی سلا دیں گے..... اٹھو.....!''

وہ اٹھنے کی کوشش کرنے لگا تو مہر جی نے اسے چھوڑ دیا۔ اس کے کھڑے ہوتے ہی عارب نے لپک کر اسے عقب سے دبوچا اور خنجر اس کی شہ رگ پر رکھ دیا۔

''تم لوگ یہ سب ٹھیک نہیں کر رہے..... یہاں سے زندہ واپس نہیں جا سکو گے۔''

''برخودار.....! فی الحال تو تم اپنی خیر مناؤ.....! چلو عجائب خانے کا راستہ کھولو۔'' عارب نے حقارت سے کہا۔ مہاراج بائیں دیوار کے ساتھ موجود تجوری نما الماری کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے ہینڈل پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ شلندر اس کی پسلیوں میں خنجر کی نوک چبھوتے ہوئے بولا۔

''رام پرشاد.....! اتنا ذہن میں رکھنا کہ اگر تم نے کوئی مکاری دکھانے کی کوشش کی تو ہمارے ساتھ تو جو ہوگا وہ بعد میں ہوگا اس سے پہلے تمہاری آنتیں گلے کا ہار ہو جائیں گی۔'' مہاراج نے گھبرائے ہوئے انداز میں شلندر کی طرف دیکھا۔ پھر الماری سے پیچھے ہٹ گیا۔

''وہ..... وہ عجائب خانے کا راستہ.....س..... ساتھ والے ہال سے نیچے جاتا ہے۔''

''ہوں..... کافی سمجھدار ہو..... چلو ادھر چلو.....!'' مہاراج تیزی سے پلٹ گیا۔ بغلی دیوار کے درمیان میں کافی کشادہ گیٹ نما خلا تھا جس میں لڑیاں جھول رہی تھیں۔ مہاراج اس طرف بڑھ گیا۔

''آ جاؤ سب.....!'' شلندر کہتے کہتے چونک پڑا۔ میں نے اس کی نظروں کا تعاقب کیا ایک طرف کونے میں اختر اور ڈاکٹر عقیل فریج کھولے بیٹھے سیب کھا رہے تھے۔ ہمیں اپنی جانب متوجہ پا کر اختر مسکراتے ہوئے بولا۔

''بھوک بہت شدید لگی ہوئی تھی۔''

''آ...... آپ لوگ چلیں ہم آ رہے ہیں۔'' ڈاکٹر عقیل نے جلدی جلدی منہ چلاتے ہوئے کہا۔

''دیوی جی......! کیا آپ سیب کھائیں گی...؟'' اختر نے مہر جی کی طرف دیکھتے ہوئے دانت نکالے۔''

''میں تمہاری طرح بے صبری نہیں ہوں۔'' اس نے منہ پھیر لیا۔

''رزق سے منہ پھیرنے والے بے صبرے نہیں ناشکرے ہوتے ہیں۔'' اختر ہاتھ میں پکڑے سیب کو دیکھنے لگا۔ مہر جی اسے گھور کر خاموش ہو رہی۔

''چلو اٹھو...... نادیدو......! ہم یہاں دعوت پر نہیں آئے۔'' میں نے کہا۔

''ایک منٹ......!'' اختر نے جلدی سے کہا اور اٹھ کر ایک الماری کی طرف بڑھ گیا۔ الماری کھول کر اس نے مہاراج کی ایک قمیص نکالی اور پہن لی کیونکہ اس کا اوپری دھڑ ابھی تک ننگا تھا۔

وہ دوبارہ فریج کی طرف بڑھ گیا۔

''اب چل پڑو......! ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔'' شلندر نے بے زاری سے کہا۔

''بس ایک منٹ......!'' اختر جلدی جلدی سیبوں سے جھولی بھرنے لگا۔

''وقت کا زیاں ہمارے لئے بہت خطرناک ہے۔'' پروفیسر گھمبیر لہجے میں بولے۔

''چلیں کام ہو گیا۔'' اختر نے سیبوں سے جھولی بھر لی تھی۔ اس نے قریب آ کر ایک سیب مجھے پکڑا دیا۔ میں نے ایک نظر مہر جی کی طرف دیکھا۔ بھوک تو سب کو لگ رہی تھی۔ میں نے وہ سیب اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے شکریہ کہتے ہوئے سیب پکڑ لیا۔ اختر نے ایک سیب شلندر کو پکڑایا اور مجھے ایک اور پکڑا دیا۔

ہم خواب گاہ سے ملحقہ اس ہال نما کمرے میں آ گئے۔ مہاراج نے ایک طرف دیوار پر لگی اپنی قد آدم تصویر کی طرف اشارہ کیا۔

''ادھر سے راستہ جاتا ہے نیچے۔''

''دیکھو سوچ لو......؟'' شلندر نے اس کے چہرے کے سامنے خنجر لہرایا۔

''ہا...... ہاں...... میں سچ کہہ رہا ہوں۔''

''تو ٹھیک ہے...... آگے بڑھو......!'' مہاراج تصویر کی طرف بڑھ گیا۔ تصویر کا فریم سونے کا تھا اور فریم کے چاروں کونوں پر سونے کی ایک ایک آنکھ بنی ہوئی تھی جن کی پتلیوں کی جگہ یاقوت سجائے گئے تھے۔ مہاراج نے ایک مخصوص انداز میں ان چاروں یاقوتوں کو گھمایا۔ پھر فریم کو باڈر سے پکڑ کر کھینچا۔ فریم نے اپنی جگہ چھوڑ دی اور کسی دروازے کی طرح کھل گیا۔ اندر گہرا اندھیرا تھا مگر فریم کے کچھ مزید کھلتے ہی کسی خودکار نظام کے تحت اندر روشنی پھیل گئی۔

کشادہ سیڑھیاں کہیں گہرائی میں جاتی تھیں۔ ان سیڑھیوں پر انتہائی قیمتی سرخ رنگ کا قالین بچھا ہوا تھا۔

''چلو...... آگے بڑھو......!'' عارب نے مہاراج کی پیٹھ پر گھٹنا مارا اور وہ اندر داخل ہو گیا۔ پھر ہم سب کے اندر داخل ہوتے ہی عارب نے فریم بند کیا اور ساتھ ہی اندر اندھیرا پھیل گیا۔ گھپ اندھیرے میں تیزی سے سیڑھیاں طے کرنے کی مدہم مدہم آواز بلند ہوئی غالباً مہاراج بھاگ رہا تھا۔ لیکن قالین کی وجہ سے ہلکی دھپ دھپ کی آواز آ رہی تھی۔

''کھول دو...... فریم...... دروازہ کھول دو......!'' شلندر کی تیز آواز ابھری اور عارب نے فوراً دروازہ کھول دیا۔ اندھیرا ایک بار پھر روشنی میں بدل گیا۔ مہاراج آخری زینے پر تھا۔ وہ دائیں طرف کو بھاگا اور نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

''رام پرشاد......! رک جاؤ ورنہ مارے جاؤ گے۔'' شلندر چیختا ہوا اس کے پیچھے بھاگا۔ ہم سب بھی اندھا دھند زینے طے کرتے ہوئے نیچے پہنچ گئے۔

یہ تقریباً بارہ ضرب بارہ کا ایک کمرہ نما حصہ تھا۔ جس کی دائیں ہاتھ دیوار کی جگہ ایک باریک سا پردہ دکھائی دے رہا تھا۔ پردے کے دونوں کونوں پر چاندی کے قدِ آدم مجسمے پڑے تھے۔ پردے کی حرکت بتا رہی تھی کہ مہاراج ادھر ہی گیا ہے۔ ہم

بھی ایک لمحہ ضائع کئے بغیر پردہ ہٹا کر دوسری طرف پہنچ گئے اور ہماری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں ..... ایک جہان حیرت ہمارے سامنے تھا ..... ایک تحیر خیز دنیا بکھری پڑی تھی۔ وہ کوئی فسوں نگری تھی جہاں ہم راستہ بھٹک کر پہنچ گئے تھے۔ کچھ ایسی آرائش و زیبائش تھی وہاں کی۔ ایسے ایسے نادر نایاب اور عجیب و غریب نمونے اور حیرتوں کا سامان وہاں موجود تھا کہ ہم سحر زدہ سے ہو کر رہ گئے۔ ہمارے پاؤں جیسے دبیز قالین میں دھنس کر رہ گئے اور چند ثانیوں کے لئے تو ہم مہاراج اور اپنے آپ تک کو فراموش کر بیٹھے۔

یہ ایک اچھا خاصا وسیع ہال تھا۔ ہمارے سامنے چند قدم کے فاصلے پر چونے کا بنا ہوا گوتم بدھ کا دیو قامت مجسمہ پڑا تھا جو گوتم بدھ کے گیان کے انداز کی عکاسی کرتا تھا۔ اس مجسمے کے ساتھ ہی ایک قطار کی صورت گوتم بدھ کے چند اور مجسمے ایستادہ تھے۔ کانسی، پیتل، چاندی اور سونے کے بنے ہوئے۔ دیواروں میں شیشے لگے ہوئے تھے اور ان شیشوں کے پیچھے دیواروں میں بنی ہوئی الماریوں میں ہزارہا نادر نمونے تھے۔ نسوانی مجسمے ...... جو مجسمے کم زندہ جاوید عورتیں زیادہ لگتی تھیں۔ استخوانی ڈھانچے۔ قدیم معبدوں میں عبادت کے لئے استعمال ہونے والے ظروف، قدیم وضع کے ہتھیار، دھاتی جوتے۔ قدیم لبادے، مٹی کی کھوپڑیاں، سانتے، ہیروں کے بنے ہوئے چراغ اور شمع دان، بیش قیمت پتھروں کے بنے تاج اور مالائیں۔ زندہ کلبلاتے ہوئے عجیب و غریب ہیئت کے سانپ جانور۔

ہال کے وسط میں سرخ یاقوتی پتھروں سے بنا فرعون منقورا کا مجسمہ ایستادہ تھا جس کے پہلو میں قلوقطرہ کا برہنہ مجسمہ تھا۔ یونانی، مصری، دیوی دیوتاؤں کی مورتیاں۔ جانوروں کی کھالیں اور ڈھانچے۔ عدونس، کیوپڈ اور دیوی وینس کے مجسمے، اس کونے سے لے کر سامنے نظر آنے والے دوسرے کونے تک ایک چار فٹ اونچی اور تقریباً تین فٹ چوڑی دیوار تھی جس پر پردے لٹک رہے تھے اس دیوار کے اوپر شیشے کے کیس ایک ترتیب سے رکھے ہوئے تھے۔ جن میں مختلف تہذیبوں کی نشانیاں محفوظ کی گئی تھیں۔ شیشے کی الماریوں کے اوپر انتہائی نادر قسم کی پینٹنگز آویزاں

تھیں۔ بغلی طرف کی پوری دیوار کو ایکوریم کی شکل دی گئی تھی۔ ایکوریم کیا سمندر ہی تھا ایسی انوکھی آبی مخلوقات اس میں نظر آ رہی تھیں کہ چند ایک ایسی چیزیں تھیں جو میں نے آج سے پہلے دیکھی ہی نہ تھیں۔

ہال میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر شیشے کے تابوت نما کیس ایستادہ تھے۔ چند میں مورتیاں، استخوانی ڈھانچے اور چند میں انسانی وجود تھے مرد عورتیں مادر زاد برہنہ حالت میں..... غرض کہ وہاں اتنا کچھ تھا کہ جسے احاطہ تحریر میں لانا ممکن نہیں۔

یہ سب دیکھ کر ایک ذرا تو ہم اپنی اپنی جگہ مبہوت رہ گئے پھر شلندر تیزی سے آگے بڑھ گیا۔

''رام پرشاد..... ! سامنے آجاؤ..... ! یوں چھپنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔'' اس نے بلند آواز سے کہا۔ ہم لوگوں کو بھی جیسے اچانک ہوش آ گیا اور ہم سب بھی آگے بڑھ گئے۔

''رام پرشاد..... ! بے موت مارے جاؤ گے..... سامنے آجاؤ..... !'' شلندر نے ایک بار پھر آواز دی مگر صدائے برنخاست کوئی جواب نہ ملا۔ ظاہری بات تھی رام پرشاد سامنے آنے کے لئے تو نہیں چھپا تھا۔ ہم سب ہال میں پھیل گئے مگر شاید رام پرشاد آنکھ مچولی کھیلنا چاہتا تھا۔ سب کی نظریں مہاراج رام پرشاد کی کھوج میں تھیں مگر میری..... میری نظریں مریاقس کے تابوت کی تلاش میں تھیں مگر وہ کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا اور میرے اضطراب میں اضافہ ہوا جا رہا تھا۔ بقول شلندر کے تابوت عجائب خانے میں ہی موجود تھا اور تابوت کے اوپر وہ سونے کا مجسمہ ایستادہ کیا گیا تھا جس میں مریاقس کا وجود محبوس تھا۔ مگر اس وقت نہ تو تابوت کہیں دکھائی پڑ رہا تھا اور نہ ہی وہ سونے کا مجسمہ۔

میں پوری توجہ سے اطراف کا جائزہ لیتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا مگر حقیقتاً مجسمہ یا تابوت وہاں موجود نہ تھا۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔ جس تابوت کے لئے، جس مجسمے کے لئے میں مصر سے ہندوستان تک آیا تھا، اتنا بڑا کھڑاگ پالا تھا جس کے لئے اتنی جانیں ضائع ہوئی تھیں، ہم سب موت کے منہ میں آئے کھڑے تھے، اتے

یہاں ہونا چاہئے تھا مگر وہ یہاں نہیں تھا۔ میرے ذہن میں ہزاروں اندیشے پھنکارنے لگے۔ کہیں مہاراج نے اس کا آگے سودا نہ کر دیا ہو...... کہیں کسی کو تحفے میں نہ دے دیا ہو۔ اور......اور یہ بھی تو ممکن ہے کہ ہماری وجہ سے مہاراج نے اسے غائب کر دیا ہو۔ لیکن بھلا اس جگہ سے زیادہ محفوظ جگہ اور کون سی ہو سکتی تھی؟

ہم ساتوں ہال کے دوسرے کونے تک آ پہنچے انہیں مہاراج دکھائی نہ دیا اور مجھے تابوت۔

''شلندر صاحب......!'' میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ شلندر کو مخاطب کیا۔

''آپ نے تو کہا تھا کہ تابوت اور مجسمہ یہیں موجود ہے۔ پھر کہیں دکھائی کیوں نہیں دے رہا......؟'' شلندر نے ایک ذرا ہال میں نظر دوڑائی پھر گویا ہوا۔

''ذرا مہاراج کو دیکھ لیں ابھی معلوم ہو جائے گا۔'' ٹھیک اسی وقت داخلی جانب سے ایک چھناکے کی سی آواز بلند ہوئی تو ہم سبھی چونک پڑے۔

مہاراج رام پرشاد ایک طرف مجسمے کی اوٹ سے نکلا تھا اور بے دھیانی میں ایک پیتل کے مجسمے سے ٹکرا گیا تھا اور وہ مجسمہ شیشے کے کیس پر گرا تھا۔ ایک لمحے کو خود مہاراج بھی بوکھلا گیا۔ اس نے پلٹ کر گھبرائے ہوئے انداز میں ہماری طرف دیکھا۔ عارب نے میرے ہاتھ سے بندوق جھپٹ کر اس کی طرف تان لی۔

''مہاراج جی......! اپنی جگہ سے ہلنے کی حماقت مت کیجئے گا ورنہ بھیجا اڑا دوں گا۔'' مہاراج نے یہی مناسب سمجھا کہ بھیجا اڑوا لیا جائے وہ بجائے ساکت ہونے سیڑھیوں کی سمت بھاگ پڑے۔ ہمارے درمیان فاصلہ اتنا تھا کہ ہم بھاگ کر اسے پکڑ نہیں سکتے تھے۔ مہاراج کمرے والے پردے تک پہنچا تھا کہ کم بخت عارب نے ٹریگر دبا دیا۔

دھماکے کی آواز سے کانوں کے پردے جھنجنا کر رہ گئے۔ درمیان میں ایستادہ ایک تابوت نما شیشے کا کیس چھناکے کی آواز پیدا کرتا ہوا ڈھیر ہو گیا۔ شیشے کے ٹکڑے قالین پر بکھر گئے اور رام پرشاد بھی لڑکھڑا کر گر پڑا۔

''ارے احمق......! یہ کیا کیا......؟'' شلندر نے بوکھلائے ہوئے انداز میں کہا تو عارب نے پرُسکون انداز میں جواب دیا۔

''بھاگتے ہوئے مہاراج کی لاش ہی سہی۔''

''اب یہاں سے فوراً نکلنے کی کوشش کرو ورنہ ہماری لاشیں بھی نہیں ملیں گی۔'' شلندر نے خشک لہجے میں کہا اور سامنے کی طرف دوڑ پڑا۔

''شلندر صاحب......! تابوت کدھر ہے......؟'' میں نے ڈوبتے دل کے ساتھ پوچھا۔ تو شلندر رک گیا۔

''شکیل صاحب......! جان بچی سو لاکھوں پائے...... پہلے جان بچانے کی کوشش کریں گولی کی آواز پر پورے محل کے سپاہی ابھی یہاں پہنچ جائیں گے۔ زندہ بچ کر نکل گئے تو تابوت کے لئے دوبارہ بھی کوشش کی جا سکتی ہے۔ بھاگیں......!''

اور چار و ناچار میں بھی دوڑ پڑا۔

''اگر وہ اوپر جا کر دروازہ بند کر دیتا تو بھی ہم زندہ نہ بچتے۔'' عارب نے دوڑتے ہوئے صفائی دینے کی کوشش کی مگر کسی نے کوئی تبصرہ نہ کیا۔ سب کو اپنی زندگیوں کی فکر لاحق ہوگئی تھی۔ گولی مہاراج کے شولڈر بلیڈ میں لگی تھی اور پار ہوگئی تھی۔ وہ کندھا تھامے کراہ رہا تھا۔ ہم اس کے سر پر پہنچے تو وہ ہمیں وحشت زدہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ عارب نے رکتے ہوئے بندوق اس کی طرف سیدھی کی تو شلندر نے اسے دھکا دے دیا۔

''کیا حماقت ہے......؟ کچھ عقل سے بھی کام لے لو......!''

''جب ایک دھماکا ہوگیا ہے تو پھر دوسرا بھی سہی...... کم از کم اس کا تو ''کونڈا ہو جائے۔''

''آگے بڑھو......!'' شلندر نے تیز لہجے میں کہا۔ اور ہم دوڑتے ہوئے سیڑھیوں پر چڑھ گئے اور دو دو تین تین زینے پھلانگتے ہوئے اوپر پہنچ گئے۔ خواب گاہ کا دروازہ بری طرح پیٹا جا رہا تھا اور باہر رنگ برنگی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ اوپر روشن دان سے صبح صادق کی دودھیا روشنی چھن چھن کر اندر آ رہی تھی۔ شلندر

برق رفتاری سے دیوار گیر آہنی الماری کی طرف بڑھا۔ اس نے دونوں پٹ کھولے اور بیٹھ کر الماری کے نچلے خانے سے کچھ تلاش کرنے لگا۔ اچانک پائیں باغ والی کھڑکی کو کسی نے دھڑ دھڑایا اور ہمارے دل اچھل کر حلق میں آ گئے۔ دروازے پر بھی دشمن عقبی کھڑکی پر بھی ہم چوہوں کی طرح خواب گاہ کے چوہے دان میں پھنس کر رہ گئے تھے۔

''شلندر......! کیا ڈھونڈ رہے ہو......؟'' ڈاکٹر عقیل نے تیز لہجے میں پوچھا مگر شلندر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ پاگلوں کی طرح الماری کے خانے میں ہاتھ مار رہا تھا۔ اچانک ایک چھناکے کی آواز آئی اور شیشے کی کرچیاں خواب گاہ میں بکھر گئیں۔ کھڑکی خونخوار چہروں سے بھری ہوئی تھی۔ عارب اور اختر دونوں نے جھٹکے سے بندوقیں سیدھی کیں مگر فائر صرف عارب نے کیا۔ ایک دھماکہ چند چیخیں بلند ہوئیں اور کھڑکی کا فریم خالی ہو گیا۔ ٹھیک اسی وقت شلندر کے حلق سے ایک مسرت انگیز آواز خارج ہوئی اور اچانک وہ الماری اپنی جگہ چھوڑ گئی۔ اب اس کی جگہ ایک تاریک خلا دکھائی دے رہا تھا۔

''آؤ جلدی......! جلدی کرو......!'' شلندر نے تیزی سے کہا اور ہم اس خلا میں داخل ہو گئے۔ سب سے آخر میں شلندر اندر آیا۔ بارہ زینوں کے بعد ہموار فرش تھا مگر اندھیرا اتنا زیادہ تھا کہ کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔

پھر اندھیرے میں ایک ہلکی سی چیخ کی آواز ابھری اور اندھیرا روشنی میں بدل گیا۔ الماری از خود میکانکی انداز میں سکڑتی ہوئی اپنی جگہ واپس آ گئی اور خلا بند ہو گیا۔

ہمارے سامنے ایک طویل سرنگ نما راستہ تھا جس میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بلب روشن تھے۔

''آؤ......!'' شلندر سرنگ میں دوڑ پڑا۔

''اب جتنی جلدی ممکن ہو سکے ہمیں رام پور کی حدود سے نکل جانا چاہیئے ورنہ پچھتانے کا موقع بھی نہیں ملے گا۔'' اس نے دوڑتے ہوئے کہا۔

''تمہیں اس راستے کا علم کیسے ہوا.....؟'' ڈاکٹر عقیل نے پوچھا۔

''مجھے دونوں راستوں کا علم تھا۔ اسی لئے جب رام پرشاد الماری کی طرف بڑھا تھا تو میں نے اسے ٹوک دیا تھا۔''

''صبح کی روشنی پھیل گئی ہے اور خطرہ بھی.....!'' پروفیسر کی بات پر اختر نے دوڑتے دوڑتے انہیں ایک ذرا گھور کر دیکھا اور پھر نظریں ہٹا لیں۔ بیچارے کے سیب خواب گاہ میں ہی رہ گئے تھے۔

تقریباً ایک فرلانگ کے بعد سرنگ دائیں ہاتھ مڑ گئی۔

''جلدی..... تیز دوڑو.....!'' شلندر نے کہا اور ہم نے حتی الامکان اپنی رفتار تیز کر دی۔ ادھر سے تقریباً ڈیڑھ فرلانگ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد اس سرنگ کا اختتام ایک لکڑی کے دروازے پر ہوا۔

دروازہ عام سی نوعیت کا تھا جس میں دو چٹخنیاں لگی ہوئی تھیں۔ شلندر نے جلدی سے آگے بڑھ کر چٹخنیاں ہٹائیں اور ہماری طرف پلٹتے ہوئے بولا۔

''بہت محتاط رہنا ہوگا۔ یقیناً اس کوٹھی میں بھی مسلح افراد موجود ہوں گے۔'' ہم نے اثبات میں سر ہلا دیئے۔ شلندر نے آہستہ سے دروازہ کھول دیا۔ دوسری جانب اندھیرا تھا۔ شلندر ہمیں آگے آنے کا اشارہ کرتے ہوئے اندھیرے میں داخل ہوگیا۔ ہم نے بھی اس کی تقلید میں قدم بڑھا دیئے۔ گہرا اندھیرا سرنگ میں سے آنے والی روشنی سے مجروح ہو رہا تھا۔ ہم صرف ایک دوسرے کے ہیولے ہی دیکھ پا رہے تھے۔ شلندر دائیں طرف کو بڑھا تھا۔ ایک بوجھل سکوت جیسے اندھیرے میں گھلا ہوا تھا۔ اتنا سا دوڑنے سے ہی ہماری سانسیں بری طرح پھول گئیں تھیں، دل تھا کہ سینے کے اندر اودھم مچائے ہوئے تھا۔

وقتی طور پر ممی اور تابوت کا خیال بھی میرے ذہن سے نکل گیا۔ دماغ میں صرف اتنی سوچ سانس لے رہی تھی کہ مہاراج بری طرح زخمی ہوا ہے اور راب اس کے سپاہی شکاری کتوں کی طرح ہمارے پیچھے دوڑ پڑیں گے۔ ان سے بچنے کے لئے ہمیں جلد سے جلد رام پور کی حدود سے باہر نکلنا تھا۔ اچانک دائیں جانب سے روشنی

کا سیلاب امنڈ پڑا اور ہم سب بھی اچھل پڑے۔ شلندر ایک بڑا سا پردہ اٹھائے کھڑا تھا۔ دوسری جانب تیز روشنی تھی اور ایک ہال دکھائی دے رہا تھا جس کے دور نظر آنے والے کونے تک تین قطاروں میں صوفے پڑے دکھائی دے رہے تھے اور غالباً ہم اسٹیج کے نیچے کھڑے تھے۔

روشنی کے باعث ہم اپنے اطراف کا بخوبی جائزہ لے سکتے تھے۔ ہمارے سروں سے تقریباً ایک فٹ کی اونچائی پر سنگی چھت تھی۔ عقبی طرف سرنگ کا دروازہ اور دو طرف سنگی دیواریں تھیں جدھر شلندر پردہ اٹھائے کھڑا تھا۔ وہ راستہ تھا جہاں پردے سے دیوار کا کام لیا گیا تھا اور یقینی بات تھی کہ وہ اسٹیج کی سامنے سمت تھی۔

ہم لپک کر شلندر کے قریب پہنچ گئے۔

''یہاں ہال میں کوئی نہیں ہے آجائیں......!'' شلندر نے مدہم لہجے میں کہا اور ہم اسٹیج کے نیچے سے نکل کر ہال میں آگئے۔ اچھا خاصا وسیع ہال تھا کم از کم دو ڈھائی سو افراد بآسانی وہاں بیٹھ سکتے تھے۔

اسٹیج کے ساتھ ہی ایک دروازہ دکھائی دے رہا تھا۔ شلندر تیزی سے اس کی طرف بڑھ گیا۔

''آجائیں......!''

''کچھ آگے کا بھی پتہ ہے کہ کدھر کو جانا ہے......؟'' ڈاکٹر عقیل نے کہا۔

''کچھ پتہ نہیں......! بس آجائیں......! جدھر قدم لے کر جائیں گے، چلے چلیں گے۔''

''دیکھئے گا کہیں موت کی طرف نہ لے جایئے گا۔ ہمارے دل میں تو ابھی بہت ارمان باقی ہیں۔'' اختر نے درزیدہ نظروں سے مہر جی کی طرف دیکھا مگر اس کی توجہ دوسری جانب تھی۔

''چنتا نہیں کرو برخودار......! پران کے ساتھ ساتھ ارمان بھی پرواز کر جائیں گے۔'' شلندر مسکرایا۔

''اور جو ان ارمانوں کے حقدار ہیں ان کا کیا بنے گا......؟''

''یہ تم حقداروں سے خود پوچھ لینا۔'' شلندر کی بات پر اختر تیزی سے رخ پلٹ کر مہر جی سے مخاطب ہوا۔

''کیوں مہر جی......! کیا خیال ہے......؟''

''کس بارے میں......؟'' مہر جی نے بھنویں سکوڑ کر اختر کی طرف دیکھا۔

''ارمانوں کے بارے میں......!''

''شٹ اپ......!''

''مجھے کیوں ڈانٹ رہی ہیں......؟ میں تو شلندر صاحب کے کہنے پر پوچھ رہا ہوں۔'' اختر نے رونی صورت بناتے ہوئے کہا۔ اس کے انداز میں ایسی بے ساختگی، معصومیت، ایسا حقیقی تاثر تھا کہ بے اختیار ہم سب مسکرا دیئے۔ مہر جی نے بھی بڑی مشکلوں سے ہونٹوں پر آنے والی مسکراہٹ کو دبو چا تھا۔

شلندر نے دروازے کے ''کی ہول'' سے جھانکا اور مسرت انگیز لہجے میں بولا۔

''قسمت کی دیوی ہم پر پوری طرح مہربان ہے۔''

''کیا مولوی صاحب چھوہاروں سمیت موجود ہیں؟'' اختر چہکا۔

''نہ کوئی مولوی ہے نہ چھوہارہ...... راستہ بالکل صاف ہے اور ہے بھی عقبی سائیڈ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ دو ہیوی انجن لینڈ روور گاڑیاں بھی کھڑی ہیں۔''

''سائیوں نے ہمارے لئے تھوڑا کھڑی کر رکھی ہوں گی کہ چابیاں تک اگنیشن میں چھوڑی ہوں کہ سات نواب ہمارے مہاراج کو زخمی کر کے ادھر آئیں گے۔ انہیں فرار ہونے میں کوئی دقت نہ ہو۔'' عارب نے کہا۔

''چابیاں ہوں نہ ہوں، یہ کوئی مسئلہ نہیں۔ ویسے بھی ہم سب ایک گاڑی میں بآسانی سما جائیں گے۔'' شلندر نے تیز لہجے میں کہا۔

''عقیل......! تم آگے میرے ساتھ بیٹھو گے اور مہر......! تم عقبی سمت۔ بندوق سنبھال لو۔ ہوسکتا ہے ضرورت پڑ جائے۔'' شلندر پہلے ڈاکٹر عقیل پھر مہر جی

سے مخاطب ہوا اور مہر جی نے فوراً عارب کے ہاتھ سے بندوق لے لی۔ دو نالی تھی اور دونوں کارتوس چل چکے تھے۔ میں نے اپنی کمر سے بندھی کارتوس پیٹی اتار کر مہر جی کو تھما دی جو اس نے اپنی نازک سی کمر کے گرد کس لی اور بندوق لوڈ کر لی۔ ہمارے اعصاب ایک سنسنی کیفیت کا شکار تھے۔ شلندر نے معمولی سا دروازہ کھولا اور باہر جھانکنے لگا۔

''آجاؤ......!'' اس نے کہا اور ہم سب آگے بڑھ گئے۔ دروازے سے باہر نکلتے ہی ایک طویل برآمدہ آتا تھا جس کا اختتام دائیں ہاتھ کافی دور جا کر ایک دروازے پر ہوتا تھا جبکہ بائیں ہاتھ بھی چند قدم کے فاصلے پر ایک کمرہ دکھائی دے رہا تھا جس کا دروازہ بند تھا۔ برآمدے کے ساتھ ہی آگے دو گاڑیاں کھڑی تھیں جن کی دوسری طرف ایک وسیع گراسی پلاٹ موجود تھا جس کی حد بندی پھول دار پودوں اور بیلوں سے کی گئی تھی۔ پلاٹ کی دوسری جانب اس عمارت کا احاطہ کرتی ایک بلند فصیل تھی جسے بآسانی پھلانگنا ممکن نہیں تھا اور ویسے بھی اس دیوار تک پہنچنا خطرے سے خالی نہ تھا۔

صبح کا اجالا پورح طرح پھیل چکا تھا مگر ابھی سورج طلوع ہونے میں کچھ دیر باقی تھی۔

''شلندر...... میرا خیال ہے کہ ہمیں دیوار پھلانگ کر نکل جانا چاہئے۔ اگر ہم گاڑی استعمال کریں گے تو یہاں موجود لوگوں کو فوراً علم ہو جائے گا اور ہمارے لئے فرار ہونا بہت مشکل ہو جائے گا اور پھر گیٹ بھی تو بند ہوگا۔ ہم گاڑی لے کر کدھر سے نکلیں گے......؟'' ڈاکٹر عقیل نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

''نہیں...... یہ اور بھی زیادہ خطرناک ثابت ہوگا۔ دیوار تک پہنچنے سے پہلے ہی ہم لوگ نظروں میں آجائیں گے اور پھر دیوار بھی دیکھ لو خاصی بلند ہے...... دیوار پر چڑھنے کا ہمیں موقع نہیں ملے گا اور فرض کر لو کہ اگر ہم لوگ دیکھ لئے جانے کے باوجود دیوار پھاند کر نکل جانے میں کامیاب ہو بھی گئے تو پیدل کہاں تک بھاگ سکیں گے......؟ گاڑی کا یہ ہے کہ ہم لوگ نظروں میں آجانے کے باوجود بھی نکل جائیں

گے اور اگر ایک بار ہم رام پور سے نکل گئے پھر ہمارے لئے کوئی خطرہ نہیں رہے گا۔''

''یہ بھی تو ممکن ہے کہ اس عمارت میں ہمارے علاوہ کوئی دوسرا ہو ہی نہ۔'' عارب نے کہا۔

''یہ ممکن نہیں......!'' شلندر نے فوراً تردید کی۔

''تو ٹھیک ہے......! پھر آگے بڑھو جو ہوگا دیکھا جائے گا۔'' پہلے شلندر آگے بڑھا اس نے ایک گاڑی کا بونٹ اٹھایا اور چند تاریں توڑ ڈالیں۔ ہم لوگ دوسری گاڑی کی طرف بڑھ گئے۔ میں، عارب، اختر، پروفیسر اور مہر جی عقبی حصے میں سوار ہو گئے جبکہ شلندر نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور عقیل اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

مہر جی اور اختر چونکہ دونوں مسلح تھے، اس لئے وہ عقبی دروازے کے ساتھ والی سیٹوں پر آمنے سامنے بیٹھ گئے اور ہم تینوں آگے سیٹوں پر۔ مہر جی پوری طرح چوکنا دکھائی دے رہی تھی۔ وہ عقابی نظروں سے عمارت کے کونے کھدروں کا جائزہ لے رہی تھی جبکہ اختر کی نظریں اس کا جائزہ لینے میں مصروف تھیں۔ اچانک گاڑی کا انجن غرا اٹھا۔ سنسنی کے کیڑے ہماری رگوں میں کرلانے لگے۔

گاڑی نے ایک خفیف سی جھرجھری لی اور ٹرن لیتی ہوئی عمارت کے دائیں سمت بڑھ گئی۔ انجانے اندیشوں نے ہمارے حلق خشک کر ڈالے تھے۔ گاڑی نے برق رفتار سے رخ بدلا اور عمارت کی دوسری جانب گھوم گئی۔ اور پھر اچانک ایک دھماکہ ہوا۔ ایک چھناکے کی آواز بلند ہوئی اور ونڈ اسکرین کی کرچیاں اڑ کر عقبی حصے تک بھی آئیں۔ گاڑی بری طرح ڈگمگائی تھی۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ ایک دھماکہ ہوا مگر گولی نہ جانے کدھر گئی تھی...... البتہ گاڑی کی ڈگمگاہٹ اور بڑھ گئی۔

''ہوشیار......!'' شلندر حلق کے بل چیخا تھا۔ ٹھیک اسی وقت عقبی طرف سے دو آدمی اندرونی حصے سے نکلتے دکھائی دیئے۔ دونوں کے ہاتھوں میں بندوقیں تھیں۔ ابھی انہوں نے بندوقیں گاڑی کی طرف سیدھی بھی نہ کی تھیں کہ مہر جی نے فائر داغ دیا۔ ان میں سے ایک اچھل کر گرا اور دوسرا بھاگ کر ایک ستون کی اوٹ میں ہو گیا۔

''تم فائر نہیں کرنا۔'' اختر کو بندوق سیدھی کرتے دیکھ کر مہر جی چیختے ہوئے

ولی۔ اور اختر نے نالی جھکا لی۔ اچانک بریک بری طرح چرچرائے، یوں لگا جیسے بھی گاڑی الٹ جائے گی مگر شلندر مشاق ڈرائیور ثابت ہوا۔ گاڑی دوسری جانب گھوم گئی اور ہم ایک دوسرے سے ٹکرا کر سنبھل گئے۔

برآمدے میں گرا ہوا ایک شخص جلدی سے اٹھا اور ایک طرف فرش پر پڑی بندوق کی جانب بڑھ گیا۔ یہ یقیناً وہی تھا جس نے سامنے سے فائر کیا تھا اور غالباً گاڑی کی زد سے بچنے کے لئے اس نے برآمدے میں چھلانگ لگائی تھی مگر اس سے پہلے کہ وہ اپنی بندوق اٹھا کر پلٹتا اور ہم پر فائر کرتا، مہر جی نے اس کی پیٹھ میں روزن بنا ڈالا اور وہ بیچارا منہ کے بل ڈھیر ہو گیا۔

''اسے لوڈ کرو......!'' مہر جی نے اپنی بندوق اختر کی گود میں ڈالی اور اس کے ہاتھ سے جھپٹ لی۔ ایک طرف پک اپ ٹائپ کی گاڑی کھڑی تھی جس کے قریب چار مسلح افراد کھڑے تھے اور چند افراد پک اپ میں سے کارٹن نکال رہے تھے۔ وہ سبھی اپنی جگہ ہکے بکے کھڑے منہ پھاڑے ہماری گاڑی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ یقینی بات تھی کہ معاملہ ان کی سمجھ سے باہر تھا۔ ان کے کچھ سمجھنے سے پہلے ہی مہر جی نے ان پر فائر کر دیا۔ تین چار بھاگ کر ادھر ادھر ہو گئے۔ دو پک اپ کی اوٹ میں ہو گئے جبکہ تین ڈھیر ہو گئے۔ اب یہ خدا بہتر جانے کہ ان تینوں کو کارتوس کے چھرے زخمی کر گئے تھے یا وہ محض دوسرے فائر سے بچنے کے لئے لیٹے تھے۔

چند لمحوں کے توقف سے مہر جی نے دوسرا فائر بھی داغ دیا۔ یکے بعد دیگر دو دھماکے ہوئے۔ ایک تو فائر کا تھا، دوسرا پک اپ کے ٹائر برسٹ ہونے کا تھا۔ مہر جی نے بندوق اختر کی گود میں پھینکی اور لوڈڈ بندوق اس کے ہاتھ سے جھپٹ لی۔ اچانک بلند ہونے والی شلندر کی دھاڑ نے ایک لمحے کو تو ہمیں بوکھلا کر رکھ دیا۔

''مہر......!'' بیک وقت ہم پانچوں نے اگلی جانب دیکھا۔ میرا دماغ تو بھک سے اڑ گیا۔ کچھ فاصلے پر ایک بڑا سا سلاخ دار گیٹ تھا اور اس گیٹ کے سامنے کھڑا چوکیدار اپنی بندوق ہماری گاڑی کی جانب سیدھی کر رہا تھا۔

لمحے کے ہزارویں حصے میں میں نے اسے دیکھا۔ مہر جی آسمانی بجلی کی طرح

ایک جھٹکے کے ساتھ اپنی جگہ سے اٹھی، بندوق کی نال میرے سامنے سے فرنٹ کی جانب بڑھی، ایک ساتھ دو دھماکے ہوئے۔ گاڑی دو ٹائروں پر اس برح طرح لہرائی کہ میں اپنی سیٹ سے اچھل کر عارب سے جا ٹکرایا اور مہر جی لڑکھڑا کر میرے اوپر ہی آ گری۔

یہ اندازہ کرنا محال تھا کہ پہلے گاڑی لہرائی تھی یا فائر ہوئے تھے۔ مہر جی کے فائر نے میرے کانوں کے پردے جھنجنا کر رکھ دیئے تھے۔ دماغ کے اندر سیٹیاں سی بجنے لگی تھیں۔

''سنبھلو......!'' شلندر ایک بار پھر چیخا۔ ہم ابھی اٹھ ہی رہے تھے کہ گاڑی ایک دھماکے کی آواز سے گیٹ سے جا ٹکرائی۔ پروفیسر، اختر اور عارب بھی مجھ سے آ ٹکرائے۔ میرے سر اور کندھے میں شدید چوٹ آئی تھی۔ گاڑی برق رفتاری سے ریورس ہوئی۔ مہر جی اور اختر پھرتی سے پیچھے ہٹے البتہ میں نے نیچے بیٹھے بیٹھے ہی مضبوطی سے سیٹ کو تھام لیا۔ ٹھیک اسی وقت عقبی جانب سے یکے بعد دیگرے چار فائر ہوئے۔ اختر کے حلق سے ایک اذیت آلود کراہ خارج ہوئی اور وہ لڑکھڑا کر گر پڑا۔

''اختر......!'' تت......تم ٹھیک تو ہو......؟'' عارب نے تیز لہجے میں پوچھا۔

''اختر......!'' میں اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ پایا۔ میری نظریں اس کے کولہے سے چپک کر رہ گئی تھیں جس سے خون ابل رہا تھا۔ مہر جی نے اندھا دھند عقبی سمت فائر جھونک دیا۔

گاڑی ایک جھٹکے سے رکی۔ پھر بندوق سے نکلی ہوئی گولی کی سی تیزی سے گیٹ کی جانب دوڑ پڑی۔ مہر جی بندوق لوڈ کر رہی تھی۔ عارب لپک کر اختر کے قریب ہو گیا جس کے چہرے پر شدید تکلیف کے تاثرات رقم تھے۔ گاڑی ایک بار پھر دھماکے کی آواز سے گیٹ سے جا ٹکرائی۔ دھچکا کچھ ایسی شدت کا تھا کہ یوں لگا جیسے آسمان ٹوٹ کر زمین پر آ گرا ہو۔ مہر جی کے قدم اکھڑ گئے۔ عارب پشت کے بل گرا تھا اور پروفیسر کے حلق سے بھی ایک بے معنی سی آواز نکل گئی مگر اس دفعہ نہ تو گاڑی ریورس ہوئی اور نہ ہی رکی، گیٹ اکھڑ گیا تھا۔ جہاں گیٹ کے راڈ وغیرہ ستونوں میں نصب تھے، وہاں سے سیمنٹ اور اینٹیں اکھڑ گئیں تھی۔ تقریباً بیس قدم

تک گاڑی گیٹ کو دھکیلتی ہوئی لے گئی پھر گیٹ ایک طرف گر پڑا اور گاڑی ڈولتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

کچھ اندازہ نہیں تھا کہ ہم رام پور کے کون سے حصے میں ہیں اور آگے کس سمت جانا ہے۔ لیکن شلندر کو یقیناً اس کا علم تھا اور اب یہ ذمہ داری بھی اس کی تھی۔

میں سرک کر اختر کے قریب ہوگیا۔ شدت ضبط سے اس کے جبڑے کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں اور تکلیف کی شدت سے اس کا پورا وجود آہستہ آہستہ لرز رہا تھا۔

''اختر......! تم......تم ٹھیک تو ہو......؟'' میرا یہ جملہ اضطراری تھا۔ عارب اور مہر جی بھی قریب ہی بیٹھ گئے۔

''شکیل صاحب......! لگ...... لگتا ہے کہ گو...... گولی کولہے کی ہڈی کو تت......توڑ گئی ہے۔'' اختر کی آواز کپکپا رہی تھی۔ اس کا نچلا دھڑ خون میں لت پت ہو چکا تھا اور گاڑی کا فرش بھی رنگین ہو رہا تھا۔

''شکیل صاحب......! خیریت تو ہے......؟'' شلندر نے عقب نما آئینے میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ میرے بولنے سے پہلے ہی مہر جی تیز لہجے میں بولی۔

''انکل......! اختر کو گولی لگ گئی ہے، خون بھی بہت تیزی سے بہہ رہا ہے۔ گاڑی تیز چلائیں۔ ہمیں فوراً کسی ہاسپٹل تک پہنچنا ہوگا۔'' اس کے لہجے میں اضطراب تھا، خوف آلود اندیشے تھے اور چہرے پر شدید فکرمندی اور پریشانی کا نقشہ کھنچ گیا تھا۔ اس کا یہ روپ ہمارے لئے نیا تھا۔

''کیا گھاؤ خطرناک ہے......؟'' عقیل نے تشویش سے پوچھا۔

''گولی کولہے کے اندر رہ گئی ہے اور غالباً ہڈی کو توڑ گئی ہے۔ اگر فوراً آپریشن نہ کیا گیا تو بارود کا زہر پھیلنا شروع ہو جائے گا۔'' میں نے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔ میں دیکھ چکا تھا کہ خون ایک طرف سے بہہ رہا ہے۔ یقینی بات ہے کہ گولی اندر تھی پھر کولہے کو ہاتھ لگانے سے ہی اختر تڑپ اٹھتا تھا جس کا مطلب تھا کہ ہڈی میں فریکچر آیا ہے۔

☆☆☆

''شلندر صاحب......! کیا یہاں نزدیک کوئی ہاسپٹل نہیں ہے......؟'' عارب نے شلندر کو مخاطب کیا۔

''نہیں......! اور ہاسپٹل تک پہنچنے کے لئے ہمیں کم از کم ابھی تین گھنٹے چاہئیں۔''

''بہت دیر ہو جائے گی شلندر صاحب......! اختر کا خون بہت تیزی سے بہہ رہا ہے۔ اگر بروقت طبی امداد میسر نہ آئی تو اس کی جان کو خطرہ ہو سکتا ہے۔''

''ان علاقوں میں کوئی ہاسپٹل نہیں ہے۔ چھوٹی سی ایک ڈسپنسری ہے اور وہ بھی راج محل کے قریب اور وہاں سے بھی اسے کوئی خاص فائدہ نہیں ہوگا۔ جبکہ اسے فوری آپریشن کی ضرورت ہے اس کے لئے ہمیں جلد از جلد شہر تک پہنچنا ہوگا اور اس میں ہمیں تین گھنٹے تو لگ ہی جائیں گے۔''

''انکل......! آپ...... کچھ کریں نا......!'' مہر جی نے بے قراری سے کہا۔

''بیٹا......! یہاں میں مجبور ہوں۔ کچھ نہیں کر سکتا۔ بس دعا کر سکتا ہوں۔ تم لوگ بھی دعا کرو۔'' شلندر نے گھمبیر آواز میں کہا۔ مہر جی متفکر نظروں سے اختر کی صورت دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں ایک معصوم بچے کی سی بیچارگی سمٹ آئی تھی۔

''آ......آپ اتنی پریشان کیوں ہو رہی ہیں......؟'' اختر نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرانے کی کوشش کی لیکن مسکراہٹ بھی جیسے اسے بوجھ محسوس ہوئی۔

اس کی پیشانی پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے جھلملانے لگے۔

''کیوں کہ..... میں بھی انسان ہوں..... سینے میں پتھر نہیں رکھتی۔ میرے سینے میں بھی دوسرے انسانوں کی طرح گوشت کا ایک نرم ٹکڑا دھڑکتا ہے۔'' مہر جی نے ملائمت سے کہا۔

''چلو..... ذہن..... سے ایک بب..... بوجھ تو ہٹا.....!'' اختر کے چہرے پر قدرے اطمینان پھیل گیا۔

''کیسا بوجھ.....؟''

''یہ..... یہی کہ آپ..... کے سینے میں بھی دل ہے..... ورنہ میں تو اب تک یہی سمجھتا رہا ہوں کہ آ..... آپ کے سینے میں دل کی جگہ..... پپ..... پتھر ہے۔''

''طنز کر رہے ہو مجھ پر.....؟''

''نن..... نہیں..... میری ایسی مجال کہاں.....؟ میں تو بس..... یونہی اپنا خیال ظاہر کر رہا تھا۔''

اچانک گاڑی کو ایک چھوٹا جمپ لگا اور اختر کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ تکلیف ضبط کرنے کی کوشش میں اس کے جبڑے بھینچ گئے۔ آنکھیں ابل پڑیں، چہرے اور گردن کی رگیں ابھر آئیں۔ مہر جی سرک کر قدرے اس کے قریب ہو گئی۔

''حوصلہ..... حوصلہ کرو اختر.....! مرد ہو تم.....!'' عارب نے مضبوط لہجے میں کہا۔

''مر..... مردانگی ہوا ہو..... گئی ہے عا..... عارب بھائی.....!'' اختر نے مسکرانے کی کوشش کی مگر کراہ کر رہ گیا۔

ڈاکٹر عقیل نے گردن موڑ کر اختر کو دیکھا۔ ان کے چہرے پر گہری تشویش کے سائے تھے۔ یقیناً انہیں حالات کی نزاکت کا پورا احساس تھا بلکہ انہیں ہی کیا ہم سب کو بخوبی اندازہ تھا کہ صورت حال کیسی سنگین ہے اور اختر کی زندگی موت کے خطرے سے دوچار ہے مگر ہم سب کی مجبوری کا یہ عالم تھا کہ ہم کچھ بھی نہ کر سکتے تھے۔ معذور ہو چکے تھے۔ اختر کی کوئی بھی مدد کرنے سے قاصر تھا۔ اس کا خون

مسلسل بہہ رہا تھا۔ گاڑی کا فرش بھی رنگین ہو چکا تھا اور اس کا نچلا دھڑ اسی کے خون میں تر بتر تھا۔

زندگی لحہ بہ لحہ اس کے وجود سے بہہ رہی تھی اور اس کی حالت دیکھ کر ہمارے کلیجے کٹ رہے تھے مگر ہم اپنا خوف، اپنے اندیشے اس پر ظاہر کر کے اسے بے حوصلہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ حالانکہ اس کا حوصلہ سلامت رکھنے کے لئے یہ ایک احمقانہ سی کوشش تھی کیونکہ وہ کوئی بچہ یا کم عقل نوجوان نہیں تھا، سب جانتا تھا۔ اسے اپنی کمزور پوزیشن کا ہم سے زیادہ احساس تھا۔

''ہمت سے کام لو اختر......!'' مہر جی نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھا۔

''معمولی گھاؤ ہے کچھ نہیں ہوگا تمہیں۔''

''تو میں کب کہہ رہا ہوں کہ مجھے کچھ ہوگا۔ گھاؤ بھی معمولی ہے مگر کیا کروں......؟ آپ جتنا کلیجہ اور ہمت نہیں ہے میرے پاس...... لیکن اگر اب یوں میرے سینے پر ہاتھ رکھے رکھیں تو میرا کلیجہ پھول کر کافی بڑا ہو جائے گا۔ پھر پرواہ نہیں۔'' مہر جی نے فوراً اس کے سینے سے ہاتھ ہٹا لیا اور خاموشی سے اسے گھورنے لگے۔

ہم رام پور کی حدود سے نکل آئے تھے۔ گاڑی برق رفتاری سے دلی شہر کی جانب اڑی جا رہی تھی۔ پہاڑی سلسلہ پیچھے رہ گیا تھا۔

''ویسے دیوی جی......! ایک بات کہوں......!'' اختر کا لہجہ نشیلا سا تھا۔ اس کی آنکھوں کی چمک دم توڑنے لگی تھی۔

''کہو......!'' مہر جی نے سپاٹ مگر نرم لہجے میں کہا۔

''آپ...... غصے میں ز...... زیادہ حسین دکھائی دیتی ہیں۔''

''تم کبھی سدھرو گے بھی......؟''

''ہاں جی...... میرے...... سدھرنے میں بب...... بس تھوڑی دیر ہی ہے...... آ...... آپ ایک بار...... مسکرا کر دکھائیں۔''

''فضول باتوں سے پرہیز کرو۔ تم زخمی ہو اس لئے میرا رویہ ذرا نرم ہے۔

کسی غلط فہمی یا خوش فہمی میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں۔'' مہر جی کا لہجہ بدستور نرم تھا۔ اختر نے ''آہ'' کی جگہ ایک ''کراہ'' بھری مجھے اسی جواب کی توقع تھی۔

تیرے وعدے پہ جیئے ہم تو یہ جان جھوٹ جاناں
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

اختر نے رک رک کر شعر مکمل کیا۔ اس کی رنگت زرد پڑنے لگی تھی اور ممکنہ نتیجے کے خیال سے ہی میرا دل ڈوبنے لگا۔ عارب الگ اپنی جگہ مضطرب دکھائی دے رہا تھا۔ البتہ پروفیسر ایک طرف اپنے مخصوص انداز میں بیٹھے تھے۔

''اختر......! خاموش رہو، زیادہ باتیں نہیں کرو۔ توانائی ضائع ہوتی ہے۔'' تفکر میرے لہجے سے مترشح تھا۔

''شکیل صاحب......! زبان...... ہمیشہ کے لئے خاموش...... ہونے والی ہے۔ آخری وقت کم از کم میری ز......زبان پر پہرے تو نہیں بٹھائیں۔'' اختر کے لہجے کی مایوسی اور لاچارگی میرا کلیجہ کاٹ گئی۔ اس نے اپنی دھندلاتی نظروں سے مہر جی کی طرف دیکھا۔

''دیوی جی......! میں کوئی بڑی فرمائش یا......کوئی ایسی خواہش نہیں کر رہا جسے...... پورا کرنے...... سے آپ کا کوئی نقصان ہو جائے اے...... ایک ہلکی سی مس...... مسکراہٹ آپ کے ان خوب صورت یاقوتی ہونٹوں پر رقصاں دیکھنا چاہتا ہوں...... آخری سمجھ کر ہی میری...... یہ خواہش پوری کر دیں۔''

اختر کے لہجے میں زمانے بھر کی شکستگی در آئی۔ صدیوں کی تشنگی اور قیامت کی تڑپ تھی اس کے انداز میں۔ مہر جی کے چہرے پر ایک سہما ہوا سا رنگ جھلملا کر رہ گیا۔ وہ گہری نظروں سے اختر کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔

''بکواس نہیں کرو...... ایسی باتوں سے بہتر ہے کہ خاموش رہو...... جب ٹھیک ہو جاؤ گے تب تمہارے مزاج درست کروں گی۔'' اس کے لہجے میں غصہ نہیں تھا۔ خفگی یا کرختگی نہیں تھی، بلکہ خوف گزیدہ اندیشے تھے، گھبراہٹ تھی۔ اختر نے بڑی جدوجہد سے ایک ہلکی سی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائی، مضمحل سی ایک نظر مہر جی کے

چہرے پر ڈالی اور آنکھیں بند کر لیں۔

مہر جی کی خوفزدہ نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ اختر کی رنگت بالکل زرد پڑتی جا رہی تھی اور وہ مدھم سانسیں لے رہا تھا۔ اس کے خدوخال میں اگے ہوئے اذیت کے تاثرات جھڑنے لگے تھے۔ خون اب بھی بہہ رہا تھا مگر اب اس کے اخراج کی رفتار دھیمی پڑ گئی تھی۔

میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کا زخم والا حصہ دبا دیا۔ اختر کے حلق سے ایک مدھم سے کراہ خارج ہوئی۔ چہرے کے تاثرات میں ایک ذرا تناؤ پیدا ہوا، پھر اعتدال پر آ گئے۔ میں نے زخم والے مقام کو اچھی طرح دبا دیا۔ مجھے خود احساس ہوا کہ خون بہنے کی رفتار مزید کم ہو گئی ہے۔

اختر کے زرد ہوتے چہرے پر تکلیف کی بجائے سکون کے لطیف سائے اترنے لگے تھے۔

عارب پر بھی سکتے کی سی کیفیت طاری تھی۔ وہ ایک ٹک اختر کو گھور رہا تھا جس کے سینے کا زیرو بم اتنا مدھم پڑ چکا تھا کہ بغور دیکھنے سے ہی احساس ہوتا تھا کہ وہ سانس لے رہا ہے۔ اس نے نظر اٹھا کر میری طرف دیکھا مگر میں کچھ نہ بولا۔ میری آنکھیں بھی خاموش تھیں۔ عارب کی کیفیت بھی مجھ سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھی۔ وقت کے بنجر ماتھے پر زرد لمحوں کی بارش ہو رہی تھی۔ حقیقت کی شکل بڑی سفاک اور بھیانک تھی۔ ہم سبھی اس سے نظریں چرانے کی کوشش کر رہے تھے مگر وہ تو ہمارے اندر کے سناٹوں میں پھیل چکی تھی اور اپنے اندر سے آنکھیں بچا کر، دامن چھڑا کر آج تک کوئی کب مفر کا راستہ تلاش کر پایا ہے؟

گاڑی جس طوفانی رفتار سے زندگی کی سرحدوں کی جانب بڑھ رہی تھی، زندگی اس سے بھی زیادہ برق رفتاری سے موت کی سرحدوں کے قریب ہوئی جا رہی تھی۔ ہمارے ضبط جواب دینے لگے۔ حقیقت ہماری روحوں کو رگیدے جا رہی تھی۔ اختر کی لحہ بہ لحہ متغیر ہوتی حالت ہمیں دھاڑیں مارنے پر مجبور کر رہی تھی۔ وقت کے پر بھی جیسے کسی ماورائی قوت نے کتر ڈالے تھے۔ ایک ایک لحہ کچھوے کی طرح

رینگ رینگ کر گزر رہا تھا اور ہمارے ذہنوں کو کچوکے لگا رہا تھا۔

گاڑی کی اندرونی فضا میں اختر کے خون کی مہک رچی ہوئی تھی اور ہماری دھڑکنیں اس مہک کے بوجھ کے نیچے جیسے ہر ثانیہ دبی جا رہی تھیں۔ زبان کو گویا اس مہک نے مفلوج کر کے رکھ چھوڑا تھا۔

''اختر......!'' مہر جی کی آواز نے خاموشی کی چادر پر ناخن طرازی کی مگر اختر بے حس و حرکت پڑا رہا۔ مہر جی نے خوفزدہ نظروں سے ہماری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں کے تاثرات تائید طلب نہیں بلکہ تردید طلب تھے۔ ہم نے اس کی کوئی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ وہ دوبارہ اختر کی جانب متوجہ ہو گئی۔

''اختر......! اختر......! بولو......!'' اس نے اختر کو پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا۔ اختر نے آنکھیں کھول دیں۔ اس نے دھندلائی ہوئی نظروں سے مہر جی کی طرف دیکھا۔ ایک غیر محسوس سی مسکراہٹ اس کے خشک ہوتے ہونٹوں پر سرک آئی۔ اس کے لبوں کو جنبش ہوئی۔

''اب کیا ہے......؟ خود ہی تو کہا تھا کہ خاموش ہو جاؤ......! اب سکون سے سونے تو دیں۔'' اس کی آواز بڑی مدہم تھی۔

''نہیں......! تم بولو......! مجھ سے باتیں کرو...... خاموش مت رہو......!'' مہر جی کی آواز کپکپا گئی۔

''میرا بولنا...... آپ کو اچھا نہیں لگے گا دیوی...... جی......!''

''تم بولو......! جو بھی کہنا چاہتے ہو کہو...... میں برا نہیں مناؤں گی مگر...... خاموش نہیں رہو......!''

''اب...... بولا نہیں جا رہا...... پیا...... پیاس لگ رہی ہے...... زبان...... سا...... ساتھ نہیں دے رہی۔ دیوی جی......! اگ...... اگر میری کوئی بات آپ کو ناگوار گزری ہو، اب تک تو...... تو مجھے معاف کر دینا۔'' اختر نے اٹک اٹک کر جملہ پورا کیا۔ خون کے ضیاع نے اس پر اتنی نقاہت طاری کر دی تھی کہ وہ آنکھیں بھی پوری طرح کھول نہیں پا رہا تھا۔

''اگر تم نے مجھ سے باتیں نہیں کیں تو میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔''

''مجھے پیار محبت کی با......توں کے علاوہ کوئی...... بات نہیں آتی۔'' اختر خاموش ہوا تو مہر جی بے قراری سے بولی۔

''بس...... تم بولتے رہو۔'' ایک لمحے کو اختر کی آنکھیں پوری طرح وا ہوگئیں۔

''آپ...... بہت پیاری لگ رہی ہیں......اس وقت......''

''بکواس نہیں کرو......!'' مہر جی روہانی ہو کر بولی۔ اس کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ اختر کی ادھ کھلی آنکھیں بھی بند ہوگئیں۔

''اختر......! اختر......!'' مہر جی نے ایک بار پھر اسے جھنجوڑ ڈالا۔ اس کی پلکیں قدرے اٹھ گئیں۔ عارب ہاتھ سے اس کی پیشانی پر آیا ہوا پسینہ پونچھتے ہوئے بولا۔

''اختر......! ہمت نہیں ہارنی...... بس ہم ہسپتال پہنچنے والے ہیں۔'' اس کا لہجہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا۔

''عا...... عارب بھائی......! میں آپ سے پہلے پہنچ جاؤں گا۔''

''مایوسی کی باتیں نہیں کرتے۔'' عارب نے کہا۔ میں بدستور اختر کا گھاؤ دبائے بیٹھا تھا۔ اختر عارب کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔

''عا...... رب بھائی......! یاد ہے آپ نے ایک بار...... کہا تھا کہ...... مہر جی کو ز......یادہ زچ نہیں کرو...... ورنہ اس کے ہاتھوں پٹ جاؤ گے...... یاد ہے ناں......؟''

''ہاں...... یاد ہے......!''

''اور میں نے بڑے دعوے...... سے کہا تھا...... کہ...... ایسا کبھی نہیں ہوگا...... مہر جی کبھی مجھ پر ہاتھ نہیں اٹھائیں گی۔''

''مجھے یاد ہے۔''

''جانتے ہیں میں نے...... یہ دعویٰ کیوں کیا تھا......؟''

''کیوں......؟'' چند لمحوں کے بعد اختر کے لبوں میں لرزش بیدار ہوئی۔

''اس لئے کہ مجھے...... ان کے دل تک رسائی مل گئی تھی مگ...... گر یہ بہت مضبوط اعصاب کی مالک ہیں کہ روز اول سے لے...... کر آج...... تک انہوں نے مم...... محبت کا اقرار نہیں کیا......'' پھر وہ مہر جی سے مخاطب ہوا۔

''کیوں مہر......! کیا ...... کیا ان لمحوں میں بھی تم خاموش رہو گی......؟'' آ......ج تو اقرار کرلو کہ تم بھی...... مجھ سے محبت کر......تی ہو۔'' اختر یکا یک آپ سے تم پر آ گیا تھا۔ مہر جی کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔

''مہر......! اقرار کرلو...... تس...... تسلیم کرلو میری...... میری تشنگیوں کا مداوہ کر دو۔ سفید لمحوں کی قید سے نجات...... دلا دو مہر......! مہر......! محبت...... دل...... اقرار مہر......!'' اختر کی آواز ڈوب گئی۔ پلکیں جھک گئیں۔ ہونٹوں کی لرزش تھم گئی۔ اس پر غشی کی کیفیت طاری ہوگئی تھی۔

''اختر......! آنکھیں کھولو...... میں...... میں سننا چاہتی ہوں مجھ سے باتیں کرو۔'' مہر جی کی آنکھوں میں سے آنسو گرنے لگے۔

''اختر......! اختر......! ہوش کرو......!'' عارب بھی تڑپ اٹھا۔ اختر آنکھیں کھولو......!'' عارب مضطرب لہجے میں بول رہا تھا۔ اختر آہستہ سے کسمسایا۔

''میرا...... میرا دل ڈوب رہا ہے دم...... دم گھٹ رہا ہے میرا پپ...... پانی...... پینا ہے۔'' وہ ڈوبتی ہوئی آواز میں بڑبڑایا۔ مہر جی مضطرب انداز میں گاڑی سے باہر دیکھنے لگی۔ مگر سڑک کے دونوں اطراف بے آب و گیاہ میدان پھیلے ہوئے تھے بس کہیں کوئی اِکا دُکا جھاڑیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ دور دور تک پانی کے آثار نہیں تھے۔

''انکل......!'' وہ مضطرب انداز میں شلندر سے مخاطب ہوئی۔

''اختر کی حالت بگڑتی جا رہی ہے۔ پانی ...... پانی چاہئے اس کے لئے۔''

''یہاں آس پاس تو پانی دستیاب نہیں ہوگا۔ البتہ جہاں کہیں پانی نظر آیا وہاں گاڑی روک دوں گا۔'' شلندر کا لہجہ گہری سنجیدگی میں ڈوبا ہوا تھا۔

''شہر اور کتنی دور ہے انکل......!''

''ابھی شہر پہنچتے پہنچتے ہمیں گھنٹہ لگ جائے گا۔''

''گھنٹہ......! اتنی دیر ہوگئی ہے ہمیں نکلے ہوئے اور ابھی گھنٹہ اور لگے گا......؟'' عارب تیز لہجے میں بولا۔

''انکل......! گاڑی تیز چلائیں...... تیز......'' مہر جی بے قراری سے بولی حالانکہ گاڑی کی رفتار خطرناک حد تک تیز تھی۔ شلندر کی ایک لمحے کی غفلت ہم لوگوں کو موت کے منہ میں پہنچا سکتی تھی۔

''اختر......! آنکھیں کھولو...... میرے دوست......! کوئی بات کرو...... اختر......! اختر......!'' عارب کی حالت دیدنی تھی۔ مہر جی بھی اسے جھنجوڑ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ میں نے اختر کی کلائی پکڑ لی۔ اس کی نبض بہت دھیمی پڑ چکی تھی۔

''اختر......! آنکھیں کھولو......! پلیز......! خدا کے لئے آنکھیں کھولو......! مجھ سے...... مجھ سے کوئی بات کرو اختر......!'' مہر جی رو رہی تھی، اسے جھنجوڑ رہی تھی مگر وہ بے حس و حرکت پڑا تھا۔ اس پر بے ہوشی طاری ہو چکی تھی اور اس کی رنگت بالکل زرد پڑ چکی تھی۔

''اگر...... اختر کو کچھ ہوگیا تو میں...... میں ہندوستان کے نقشے سے رام پور کا وجود مٹا ڈالوں گا۔'' عارب وحشت بھرے لہجے میں بولا۔

''بڑے بول نہیں بولا کرتے۔'' پروفیسر پہلی دفعہ گویا ہوئے۔ ''کچھ کر سکتے ہو تو اس کے لئے دعا کرو۔ اس نے خود کو اذیت کی آواز دی ہے۔ یہ اسے سزا مل رہی ہے۔ اس نے مقدس ہستیوں کے متعلق غلط الفاظ استعمال......''

''ارے...... ایسی کی تیسی مقدس ہستیوں کی۔'' عارب غصے سے دھاڑا تھا۔ ''اگر اس کو کچھ ہوگیا تو میں مقدس ہستیوں کے مقدس اجسام بھی آگ میں جھونک دوں گا۔''

''دریدہ دہن......! سوچ سمجھ کر......'' پروفیسر نے کچھ کہنا چاہا مگر عارب ،

وحشت سوار تھی۔ وہ ان کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔

"بس......بس پروفیسر......! بہت سن لیں آپ کی بے سروپا باتیں۔ بند کر لیں اپنا پٹارہ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں فراموش کر بیٹھوں کہ آپ بزرگ ہیں۔" عارب کا لہجہ سلگ رہا تھا۔ پروفیسر بس اسے نفرت سے گھورتے رہ گئے۔ میں نے عارب کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا تو وہ رخ پلٹ کر شلندر سے مخاطب ہوا۔

"شلندر صاحب......! اس بیل گاڑی کی رفتار کچھ تیز کر لیں۔"

"عارب......! کچھ ہوش سے کام لو۔ اس طرح حواس باختہ ہونے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ گاڑی کی رفتار پہلے ہی خطرناک حد تک تیز ہے۔"

"شکیل صاحب......! میں...... میں آپ سے کہہ رہا ہوں، بتا رہا ہوں کہ اگر اسے کچھ ہوگیا تو پھر میرا راستہ نہیں روکئے گا۔ میں مہاراج کے چیتھڑے اڑا دوں گا۔"

"کچھ نہیں ہوگا اسے...... ہم ابھی ہاسپٹل تک پہنچ جائیں گے۔" میں نے اسے تسلی دینا چاہی حالانکہ میری اپنی اندرونی حالت نہایت دگرگوں تھی۔

مہر جی سرک کر تھوڑا آگے ہوئی تو میں تھوڑا سائیڈ پر ہوگیا۔ اس نے اختر کا سر اٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا اور اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

"اختر......! آنکھیں کھولو......! میری طرف دیکھو...... کچھ بولو اختر......! کوئی بات کرو...... دیکھو آج میں خود کہہ رہی ہوں کہ بولو......! مجھے تنگ کرو......! ہنسو......! مجھے زچ کرو......! میرے بالوں کا ذکر کرو...... میرے...... میرے ہونٹوں کا ذکر کرو...... مجھ پر اپنی محبت، اپنے جذبات کا اظہار کرو...... اختر......! بولو......! کچھ تو بولو......! دیکھو میں اعتراف کرتی ہوں کہ پہلی ہی نظر میں تمہاری محبت میں گرفتار ہوگئی تھی...... میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ اختر......! تم...... تم سن رہے ہو نا...... میں محبت کا اعتراف کر رہی ہوں۔ جاہل تھی، کم عقل تھی کہ اپنے اندر پنپنے والے جذبوں کو نہ سمجھ سکی...... مگر آج...... آج سمجھ گئی ہوں، جان گئی ہوں اختر......! مجھے تم سے محبت ہے...... بے انتہا محبت۔"

مہر جی پر ایک ایسی کیفیت طاری ہوگئی تھی کہ اسے اپنے گرد و پیش کی کچھ خبر ہی نہ تھی۔ اسے یہ بھی احساس نہ تھا کہ وہ جس سے مخاطب ہے وہ ہوش و حواس میں نہیں۔ اس کی آنکھوں سے بہنے والے شفاف آنسو اختر کے چہرے پر گر رہے تھے۔ وہ سسک رہی تھی۔ ایک بے خود کے عالم میں بولے جا رہی تھی۔ مگر مجھ میں یا عارب میں اتنی ہمت نہ ہو سکی کہ اسے ٹوک دیتے، احساس دلانے کی کوشش کرتے کہ اختر بے ہوش ہے۔

''اختر......! میں اپنے اندر کے چور کو پہچان نہیں پائی تھی اور اس قصور کی مجھے اتنی بڑی سزا نہیں دو۔ یونہی نہیں روٹھو مجھ سے...... میں تمہاری یہ ناراضگی، یہ خاموشی برداشت نہیں کر پاؤں گی۔ مسکراؤ اختر......! مسکرا کر دکھاؤ...... تمہیں...... تمہیں اندازہ نہیں تمہاری مسکراہٹ کتنی خوب صورت ہے۔ زندگی کے تمام رنگ سمٹ آتے ہیں تمہاری ایک مسکراہٹ میں۔ میں زندگی کا دیدار کرنا چاہتی ہوں...... ایک بار...... صرف ایک بار مسکرا دو اختر......!''

وہ بولے جا رہی تھی۔ اختر کو واسطے ڈال رہی تھی۔ آنکھیں کھولنے کے لئے التجائیں کر رہی تھی۔ اس کی ایک مسکراہٹ کی طلب میں مگر...... وہ بیچارا کیا آنکھیں کھولتا؟ کیا مسکراتا؟ آخرکار مہر جی کا ضبط جواب دے گیا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ اپنی آنکھیں بھیگ گئیں۔ کافی دیر یوں ہی گزر گئی۔ اچانک گاڑی کی رفتار کم ہونے لگی اور کچھ ہی دیر بعد گاڑی ایک دو جھٹکے کھانے کے بعد رک گئی۔

''کیا ہوا شلندر صاحب......!'' میں نے تیز لہجے میں پوچھا۔

''پٹرول ختم ہوگیا۔''

''اوہ نو......!'' میرے ہونٹ سختی سے بھینچ گئے۔ عارب ایک جھٹکے سے نیچے اترا اور جا کر ٹینکی چیک کرنے لگا۔

''اب...... اب کیا ہوگا......؟'' مہر جی وحشت زدہ انداز میں بڑبڑائی۔ میں خاموشی سے نیچے اتر آیا۔

دور دور تک کسی گاڑی یا آدمی کا وجود دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ تاحد نظر ویرانی

اور سناٹا تھا۔ اختر کی حالت اتنی نازک تھی کہ ہمارے لئے ایک ایک لمحہ قیمتی تھا اور صورتِ حال بڑی بھیانک شکل اختیار کر گئی تھی۔ بے چینی اور پریشانی سے مجھے اپنی کنپٹیوں میں درد محسوس ہونے لگا۔ ہم بیچ منجدھار بے یار و مددگار پھنس کر رہ گئے تھے۔

شلندر اور ڈاکٹر عقیل بھی نیچے اتر آئے۔ دونوں کے چہروں سے پریشانی ہویدا تھی۔

''بہت برا ہوا...... بڑے نازک وقت پر یہ رکاوٹ کھڑی ہوئی ہے۔'' عقیل ہونٹ کاٹتے ہوئے بولا۔

''یہاں سے سواری ملنا بھی بہت مشکل ہے۔ گھنٹوں بعد کوئی گاڑی گزرتی ہے۔'' شلندر نے متفکرانہ انداز میں کہا۔

''اختر کی حالت بہت خراب ہے۔ ہر گزرتا لمحہ اسے زندگی سے دور کر رہا ہے۔ اگر ہمیں یہاں زیادہ وقت گزرا تو وہ بے ہوشی کے عالم میں دم توڑ دے گا۔''

''تو پھر اب کیا کیا جائے......؟''

''تمام صورتِ حال تم لوگوں کے سامنے ہے۔ ایسے میں بھلا کیا کیا جا سکتا ہے......؟''

''مہر جی اور پروفیسر بھی گاڑی سے نیچے اتر آئے۔ عارب بھی تلملاتا ہوا ہمارے قریب آ گیا۔

''ٹینکی بالکل سوکھی پڑی ہے۔ پٹرول کا ایک قطرہ بھی نہیں بچا۔''

''اس پٹرول کو بھی ابھی ختم ہونا تھا۔''

''یہاں رکنے سے بہتر ہے کہ اختر کو کندھے پر ڈال کر آگے کی جانب دوڑ پڑیں۔'' عارب نے کہا۔

''شہر یہاں سے پچیس کلو میٹر کے فاصلے پر ہے۔ ہمارے پہنچنے سے پہلے وہ دم توڑ دے گا۔''

''تو یہاں کھڑے رہنے سے کیا وہ جیتا رہ جائے گا......؟''

''ارے...... وہ دیکھو...... لگتا ہے گاڑی آرہی ہے۔'' بیک وقت ہم سب کی نظریں اٹھ گئیں۔ شہر کی سمت سے واقعی ہی کوئی گاڑی آتی دکھائی دے رہی تھی۔ میرے وجود میں مسرت کی لہریں دوڑ گئیں۔ ایسی صورت حال میں یہ تائید غیبی کسی کرشمے سے کم نہیں تھی۔

''ہاں......! یقیناً گاڑی ہے۔''

''اسے روکنا ہوگا۔'' ہر حال میں روکنا ہوگا۔'' عارب نے تیز لہجے میں کہا۔

''قریب آنے دو دیکھتے ہیں۔'' ہم سب بے چینی سے گاڑی کے قریب آنے کے منتظر تھے۔ ہماری گاڑی بالکل سڑک کے درمیان رکی تھی اور سڑک کے اطراف میں اتنی جگہ نہ تھی کہ آنے والی گاڑی گزر سکتی۔ سو یقیناً جب تک ہم اس گاڑی کو ایک طرف نہیں ہٹاتے وہ گاڑی گزر نہیں سکتی۔

عارب اور مہرجی تھوڑا آگے ہو کر اپنی گاڑی کے فرنٹ کے قریب جا رکے۔ آنے والی گاڑی جب بالکل قریب پہنچی تو ہماری مسرت دوچند ہوگئی۔ گاڑی پک اپ ٹائپ لانگ باڈی تھی او رہم سب بآسانی اس میں سوار ہو سکتے تھے۔ ڈرائیور نے قریب آکر بریک لگائے تو شلندر آگے بڑھ گیا۔

''کیا مسئلہ ہے......؟ گاڑی بیچ راستے میں کاہے کھڑی کر رکھی ہے......؟''

ڈرائیور نے کھڑکی سے سر باہر نکالتے ہوئے کہا۔ اس کے برابر ایک آدمی بیٹھا تھا۔ عارب پلٹ کر گاڑی کی عقبی طرف آگیا۔

''پٹرول ختم ہوگیا ہے۔ اگر آپ کے پاس کوئی گیلن وغیرہ ہو تو دے دیں۔''

شلندر نے نارمل انداز میں کہا۔ وہ ڈرائیور گیٹ کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا۔

''ہم ٹینکی فل رکھتے ہیں۔ پھالتو پٹرول نہیں۔''

''چلیں ٹینکی سے ہی تھوڑا نکال دیں۔ ہم نے شہر پہنچنا ہے۔''

''ارے بھایا...... کیسے نکال دیویں......؟ ہم نے مال اتار کر واپس شہر بھی جانا ہے۔''

اس کی بات مکمل ہوتے ہی شلندر نے ایک جھٹکے سے گیٹ کھولا اور اس کو

گریبان سے دبوچ لیا۔ آئندہ ہی لمحے وہ چیختا ہوا سڑک کے ایک طرف جا گرا۔ دوسرا آدمی بڑی تیزی سے اپنی سائیڈ کا دروازہ کھول کر نیچے اترا تھا۔ وہ شلندر کی طرف بڑھا مگر راستے میں اسے مہر جی نے جا لیا۔ وہ بھی چیختا ہوا ڈرائیور کے برابر جا گرا۔ ابھی وہ اٹھے ہی تھے کہ عارب بندوق لے کر ان کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

''دیکھو...... تم لوگوں سے ہماری کوئی دشمنی نہیں...... ہم نے ایمرجنسی شہر پہنچنا ہے فوراً بھاگ لو ورنہ تمہاری لاشوں کو یہاں گدھ نوچیں گے۔''

''پر بھایا...... ہم نے مال......'' ڈرائیور نے بولنا چاہا تو عارب نے ٹریگر دبا دیا۔ کارتوس کے چھرے ان کے پیروں کے قریب دھول اڑا گئے۔ دونوں اچھل کر پیچھے ہو گئے۔

''مہر......! دیکھو گاڑی میں کیا ہے......؟'' شلندر نے کہا اور مہر عقبی طرف بڑھ گئی۔

''دوسری بار بولے تو سینے میں بارود بھر دوں گا...... بھاگو......!'' شلندر غرایا اور وہ دونوں ایک طرف کو دوڑ پڑے۔ شاید انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ شخص جو کہہ رہا ہے وہی کرے گا۔

''انکل......! گتے کے کچھ کارٹن ہیں۔'' مہر جی نے عقبی طرف سے کہا اور ہم تیزی سے آگے بڑھ گئے۔

''جلدی کرو۔ نکال کر ایک طرف پھینک دو۔''

تقریباً پچیس کارٹن تھے۔ بالکل ویسے ہی جیسے ہم اس کوٹھی میں دیکھ چکے تھے جہاں سے فرار ہو کر آئے تھے۔

کچھ دیر بعد کیبن خالی ہو چکا تھا۔ عارب نے سیٹیں سیدھی کر دیں۔

''اختر کو اٹھا لائیں۔ جلدی کرو۔'' عارب اور مہر جی چند ہی لمحوں میں اختر کو اٹھا لائے۔ شلندر نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ عقیل اس کے برابر ہی تھا۔ ہم ایک بار پھر طوفانی رفتار سے شہر کی جانب بڑھ گئے۔

عارب نے عقبی طرف کے دونوں پٹ بند کر دیئے۔ مہر جی اختر کے سینے پر

ہاتھ رکھے اس کی دھڑکن کا اندازہ کر رہی تھی۔ میں نے اختر کی نبض چیک کی۔ حیرت انگیز اور ناقابل یقین طور پر اس کی نبض پہلے سے بہتر تھی۔ عارب میری صورت کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''نبض بہتر ہوگئی ہے۔''

''موت سے لڑ رہا ہے۔'' گاڑی برق رفتاری سے آگے بڑھ رہی تھی۔ ہمارے دل بہت بری طرح دھڑک رہے تھے۔ قلب و ذہن امید و بیم کی کیفیت سے دوچار تھا۔ مہرجی کی حالت دیدنی تھی۔ ان لمحوں مجھے اس پر بڑا ترس آ رہا تھا۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد گاڑی جنرل روڈ پر چڑھ آئی۔ میری انگلیاں اختر کی نبض پر تھیں۔ یکایک اس کی نبض ایک بار پھر ڈوبنے لگی۔ عارب میرے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لے رہا تھا۔

''چراغ بجھنے سے پہلے بہت پھڑپھڑاتا ہے۔'' اس نے گھمبیر لہجے میں کہا۔ پھر رخ بدل کر شلندر سے مخاطب ہوا۔

''شلندر صاحب......! گاڑی فوراً کسی ہاسپٹل لے چلیں۔''

''اگر ہم یونہی کسی ہاسپٹل چلے گئے تو بہت مسائل پیدا ہوں گے۔ مہاراج بھی زخمی ہوا ہے۔ ہم لوگ فوراً دھر لئے جائیں گے۔ البتہ شہر شروع ہوتے ہی ایک پرائیویٹ ہاسپٹل آتا ہے اس کا مالک ''پرکاش دیو'' میرا احسان مند ہے۔ سو اس وقت ہم ادھر ہی جا رہے ہیں، بنا کسی جھنجٹ کے اختر کا فوراً آپریشن ہو جائے گا۔''

''جیسا آپ مناسب جانیں لیکن جس ہاسپٹل بھی جانا ہے، فوراً چلیں......!''

ہم لوگ ابھی شہری آبادی سے کچھ دور ہی تھے کہ سامنے سے پولیس کی دو تین گاڑیاں آتی دکھائی دیں اور ''زائیں'' کی آواز سے ہماری گاڑی کے قریب سے نکل گئیں۔

''بڑے بروقت یہاں تک پہنچ آئے ہیں ورنہ بڑے مسائل میں گھر جاتے۔'' شلندر نے کہا مگر ہم میں سے کسی نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

ڈرائیونگ سیٹ اور عقبی حصے کے درمیان جالی نما دیوار تھی جس کے درمیان

سے میں سامنے دیکھ رہا تھا کہ اچانک چونک پڑا۔ دور ہی سڑک پر کھڑی گاڑیوں کی طویل قطار دکھائی دے گئی تھی۔ کچھ باوردی پولیس والے بھی نظر آ رہے تھے۔ راستہ بلاک تھا۔

''یہ ایک اور مصیبت پیدا ہوگئی۔'' شلندر نے جھنجلائے ہوئے انداز میں کہا۔

''یقیناً مہاراج پر قاتلانہ حملے کی اطلاع پولیس تک بھی پہنچ چکی ہے۔''

''اب کیا ہوگا......؟'' عارب پُرتشویش انداز میں بولا۔

''انکل......! گاڑی روکنے کی بجائے رکاوٹیں اڑا دیں۔ پہلے اختر کو ہاسپٹل تک پہنچا دیں بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔'' مہر جی نے کہا۔

''بس......تھوڑا سا انتظار......!'' شلندر گاڑی آگے لے گیا۔

پولیس والے ایک ایک گاڑی کی تلاشی لے رہے تھے اور ڈرائیور مسافروں سے سوال جواب کر رہے تھے۔ ایک بتیس پینتیس سال کا جوان آفیسر خود گاڑیوں میں جھانک رہا تھا۔ ڈرائیوروں کو گالیاں دے رہا تھا۔ سپاہیوں کو جھاڑیں پلا رہا تھا۔

اچانک شلندر نے گیئر بدلا اور گاڑی قطار سے نکال کر آگے لے گیا۔ ہماری دھڑکنیں تیز ہوگئیں۔ اگر کوئی سپاہی عقبی دروازہ کھول کر اندر جھانک لیتا تو ہم بری طرح پھنس جاتے۔ اختر خون میں لت پت بالکل موت کے کنارے تھا۔

گاڑی کو یوں قطار توڑ کر اپنی طرف آتا دیکھ کر سپاہی چونک پڑے تھے۔ کئی ایک نے ہماری گاڑی کی طرف بندوقیں سیدھی کر لیں۔ شلندر نے ان کے قریب جا کر بریک لگائے اور کھڑکی سے سر باہر نکال کر اس پولیس آفیسر سے مخاطب ہوا۔

''انسپکٹر صاحب......! پہلے میری گاڑی چیک کر لیں میں ذرا جلدی میں ہوں۔'' انسپکٹر کے بگڑے ہوئے تاثرات شلندر کی صورت دیکھتے ہی اعتدال پر آگئے۔ وہ مسکراتا ہوا قریب آگیا۔

''شلندر صاحب......آپ......؟ اور سنائیں...... کیسے ہیں......؟ کدھر سے آ رہے ہیں......؟''

''ابھی تک ٹھیک ہی ہیں مگر......اب حالات بتا رہے ہیں کہ ٹھیک نہیں رہیں

گے۔'' شلندر نے معنی خیز انداز میں کہا اور وہ آفیسر قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔

''ویسے یہ سب کیا ہے......؟ کس سلسلے میں اتنی سخت چیکنگ ہو رہی ہے......؟'' شلندر کے لہجے میں تعجب تھا۔

''ابھی ابھی خبر ملی ہے کہ رام پور کے مہاراجہ کو چند افراد نے قتل کرنے کی کوشش کی ہے اور ایک کوٹھی میں انہوں نے چند افراد کو ہلاک بھی کیا ہے۔ ان مجرموں کا بھی ایک ساتھی زخمی ہوا ہے بس اسی چکر میں بیٹھے بٹھائے سر دردی آن پڑی ہے۔''

''چلیں...... پھر پہلے میری گاڑی چیک کر لیں۔ ہوسکتا ہے وہ مجرم میں ہی ہوں اور میرا کوئی ساتھی پیچھے زخمی پڑا ہو۔ دراصل ذرا جلدی میں ہوں۔'' شلندر نے ہنستے ہوئے کہا۔

''شلندر صاحب......! اب آپ ہمیں ذلیل کرنا چاہتے ہیں۔''

''انسپکٹر صاحب......! ہم نے کیا کرنا ہے......؟'' شلندر کے معنی خیز لہجے پر انسپکٹر ایک بار پھر قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔

''جائیں آپ......!'' آفیسر ایک طرف ہٹ گیا اور سپاہیوں سے مخاطب ہوا۔ جانے دو انہیں۔''

شلندر نے تھینکس کہتے ہوئے گاڑی آگے بڑھا دی اور ہماری جان میں جان آئی۔ میں نے ایک گہری سانس لی۔ مہر جی اختر کا سر گود میں رکھے بیٹھے تھی اور اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے بڑی حسرت زدہ نظروں سے اس کی زرد صورت کو تک رہی تھی۔ میں رخ بدل کر سامنے کی سمت دیکھنے لگا۔ تقریباً پانچ منٹ بعد شلندر نے گاڑی ایک عمارت کے کھلے گیٹ کی طرف موڑ دی اور اندھا دھند اندر لیتا چلا گیا۔ چند ایک افراد سامنے آئے اور اچھلتے ہوئے ایک طرف ہٹ گئے۔ ایک طرف ایک جہازی سائز بورڈ پر ''پرکاش ہسپتال'' لکھا نظر آیا تھا۔ شلندر گاڑی مین عمارت کے بالکل سامنے لے گیا۔ گاڑی کے بریک بری طرح چیخے تھے اور گاڑی اس بری طرح گھومی تھی کہ اس کا عقبی حصہ عمارت کی طرف گھوم گیا۔ ہم خود لڑھک کر

ایک دوسرے سے ٹکرا گئے مگر ہم نے سنبھلنے میں دیر نہیں لگائی۔

عارب نے جھپٹ کر دروازہ کھول دیا۔ میں نے اور عارب نے اختر کو باہر نکالا اور پھر میں نے اس کا نیم مردہ وجود بازوؤں پر اٹھایا اور اندرونی جانب دوڑ پڑا۔ شلندر ہم سے پہلے ہی اندر داخل ہو چکا تھا۔

''آپریشن روم چلو تم......!'' اس نے پلٹ کر چیختے ہوئے کہا اور ایک طرف کو دوڑ گیا۔ عارب اور مہر جی میرے آگے آگے تھے اور پروفیسر اور عقیل میرے ساتھ۔

سیڑھیاں چڑھتے ہی دائیں ہاتھ استقبالیہ تھا جہاں ایک نوجوان بیٹھا تھا۔

لوگ منہ پھاڑے ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ گاڑی جس طوفانی انداز میں آ کر رکی تھی، اس پر سبھی کی توجہ ہماری جانب مبذول ہو گئی تھی۔ ایک ہلچل سی مچ گئی تھی۔ ایک طرف سے دو وارڈ بوائے دوڑتے ہوئے ہمارے قریب پہنچ آئے۔

''آپریشن روم......؟'' عارب تیز لہجے میں ان سے مخاطب ہوا۔

''یہ...... یہ تو پولیس کیس......'' ان میں سے ایک نے بولنا چاہا تو عارب نے جھپٹ کر اس کی گردن اپنے چوڑے پنجے میں دبوچی اور چیختے ہوئے بولا۔

''آپریشن روم کدھر ہے......؟''

''وہ...... وہ اس طرف......!'' اس نوجوان نے گھٹے گھٹے انداز میں دائیں ہاتھ کی راہ داری کی طرف اشارہ کیا اور میں اس طرف دوڑ پڑا۔ عارب اور مہر جی بدستور میرے آگے تھے۔

راستے میں کچھ ڈاکٹر اور کچھ نرسز بھی آئیں۔ وہ پوچھتے رہ گئے۔

''کیا مسئلہ ہے......؟ کیا ہوا ہے......؟'' مگر ہم بغیر کچھ کہے، رکے آگے بڑھتے گئے۔ ایک جگہ رکتے ہوئے عارب پلٹ کر مجھ سے مخاطب ہوا۔

''آ جائیں اس طرف......!'' وہ دائیں طرف راہ داری میں پلٹ گیا۔ میرے قدم بھی رکے نہیں۔ اس طرف بالکل نکڑ پر ایک دروازہ نظر آ رہا تھا۔ جس کی پیشانی پر لکھا ہوا تھا ''آپریشن روم'' اوپر لگا ہوا سرخ بلب روشن تھا۔

عارب نے آگے بڑھ کر لات ماری اور دروازہ چوپٹ کھل گیا۔ ہم پانچوں

اندر داخل ہوگئے۔ ڈاکٹر عقیل نے عقب میں دروازہ بند کر دیا تھا۔ ایک طرف پردوں کی اوٹ میں تین ڈاکٹر اور نرسیں آپریشن میں مصروف تھے۔ ہمارے یوں اندر گھس آنے پر وہ سبھی چونک پڑے۔

''یہ...... یہ کیا بے ہودگی ہے......؟ کون ہیں آپ......؟ اور ...... اور آپ اندر کیسے گھس آئے ہیں......؟'' ایک ڈاکٹر نے ترش لہجے میں کہا۔

''ہم بھی ڈاکٹر ہیں، ایک مریض کو لے کر آئے ہیں اور دروازے سے گھس کر آ رہے ہیں۔ کیا آپ کو دکھائی نہیں دیا......؟'' عارب اس ڈاکٹر سے مخاطب ہوا اور میں نے آگے بڑھ کر اختر کو ایک ٹیبل پر لٹا دیا۔

''کیا بدتمیزی ہے......؟ باہر...... باہر جائیں آپ...... یہ کوئی طریقہ ہے......؟'' ڈاکٹر پردے کی اوٹ سے نکل کر سامنے آیا تو عارب نے اسے کندھے سے پکڑ کر ایک طرف دھکیل دیا۔

''زیادہ بکواس کی ضرورت نہیں۔ کہیں ہم تمہیں بات کرنے کا طریقہ نہ سمجھا دیں۔ ہمارے ساتھی کو گولی لگی ہے اس کا فوری آپریشن کرنا ہے۔'' اچانک دروازہ ایک زور کی آواز سے کھلا اور عارب کی بات درمیان میں ہی رہ گئی۔

آنے والا شلندر تھا اس کے ساتھ دو افراد اور تھے۔ ایک جوان آدمی تھا اور دوسرا ایک خوش پوش ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔ ڈاکٹر فوراً اس آنے والے خوش پوش آدمی کی طرف متوجہ ہوگیا۔

''سر......! سر......! یہ دیکھیں یہ لوگ......'' نووارد نے ڈاکٹر کی بات درمیان سے ہی کاٹ دی۔

''مجھے علم ہے...... یہ لوگ اجنبی نہیں...... میرے محسن ہیں۔ ان کی پوری پوری مدد کرو۔'' آنے والا یقیناً پرکاش دیو تھا۔

''جی سر......!'' ڈاکٹر قدرے حیران تھا۔ پرکاش اپنے ساتھ آنے والے دوسرے نووارد سے مخاطب ہوا۔

''سکھ دیو......! یہ میرا ذاتی کیس ہے...... خیال رہے کہ اس بارے میں کوئی

خبر ہاسپٹل سے باہر نہیں جانی چاہئے۔''

''جی بہت بہتر......!''

''ہمیں جراحت کا سامان اور ''اوپازیٹو'' بلڈ کی ضرورت ہے فوری......!'' میں نے پرکاش کو مخاطب کیا۔

''انہیں ان کی ضرورت کی ہر چیز مہیا کرو۔'' پرکاش ڈاکٹر سے مخاطب ہوا اور وہ سر ہلا کر رہ گیا۔

''اب اس کی ضرورت نہیں۔'' ڈاکٹر عقیل کی آواز پر ہم سبھی چونک پڑے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ اختر کی نبض تھامے کھڑے تھے اور ان کے چہرے پر گہرا سکوت چھایا ہوا تھا۔ چند لمحوں کے لئے آپریشن روم میں موت کی سی خاموشی چھا گئی۔ دھڑکنیں ساکت رہ گئیں اور ایک لمحے کو سانسیں جیسے تھم گئیں۔

''کک...... کیا مطلب ہے آپ کا......؟'' میں ہکلایا۔

''بہت لڑا ہے یہ...... ہار گیا......'' ڈاکٹر عقیل نے گھمبیر آواز میں کہا اور اختر کی کلائی چھوڑ دی۔ میں تڑپ کر اختر کے قریب پہنچا۔ میں نے اس کی نبض چیک کی مگر نبض......نبض تو انگلیوں کے نیچے آ ہی نہیں رہی تھی یا...... یا شاید انگلیاں نبض کو ڈھونڈ نہیں پا رہی تھیں۔ میں دیوانوں کی طرح اختر کی کلائی ٹٹولنے لگا مگر نبض ہوتی تو انگلیاں اسے محسوس کرتیں۔ اس کی نبض تو کہیں تاریک پاتالوں میں اتر گئی تھی۔ سرد لمحوں کی گرفت میں آ کر منجمد ہو چکی تھی۔

وہ موت سے لڑتے لڑتے زندگی ہار بیٹھا تھا۔ جا چکا تھا ہم سب کو چھوڑ کر۔ اس کی نبض، دھڑکن، سانس، زندگی کی ہر رمق دم توڑ چکی تھی اور اس کا جسم بالکل مردہ پڑ چکا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے ملک الموت نے اس کی نہیں میری روح قبض کر لی ہو۔ میں اس کی سرد اور زندگی سے خالی کلائی تھامے اپنی جگہ سکتے کی سی کیفیت میں کھڑا رہ گیا۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں جیسے سلب ہو گئیں تھیں۔

اچانک عارب آگے بڑھا اور اختر کے سینے پر دباؤ ڈالنے لگا۔ اس پر ایک وحشت سوار ہو گئی تھی۔ کبھی وہ اس کا سینہ دبانے لگتا اور کبھی منہ سے اختر کے منہ میں

بانہیں بھرنے کی کوشش کرتا۔ مگر اب بھلا اس سب سے کیا ہونے والا تھا......؟ وہ تو بے ہوشی کے عالم میں ہی دم توڑ چکا تھا۔

میں نے بے جان ہاتھوں سے اس کی کلائی چھوڑ دی۔ موت ہم سے زیادہ تیز رفتار نکلی تھی جو اس کی زندگی کا گھونٹ بھر گئی تھی۔ میں نے رخ پھیر لیا۔ مہر جی دو قدم کے فاصلے پر کسی سنگی مجسمے کی طرح بے حس و حرکت کھڑی میری ہی جانب دیکھ رہی تھی۔ مجھے پلٹتا دیکھ کر اس کے ہونٹ لرزے مگر کوئی آواز نہیں نکل سکی۔

"ہار گئے...... ہار گئے پروفیسر......! پوری طرح ہار گئے...... ہمارے ہاتھ کچھ بھی نہ آ سکا اور ہم نے اختر جیسا ایک بہترین دوست بھی کھو دیا۔" میری آواز بھرا گئی۔

مہر جی پر طاری سکتہ میرے الفاظ کے سنگریزوں سے ٹوٹ گیا۔ وہ آہستہ قدموں سے اختر کی لاش کی طرف بڑھی اور اس کے تلوؤں سے پیشانی ٹیکتی ہوئی گھٹنوں کے بل نیچے فرش پر بیٹھ گئی اور پھر اچانک ہی وہ پھٹ پڑی۔

"اخ......تر......!" اس کی قلق انگیز چیخ پر میرا دل کٹ کر رہ گیا۔ آپریشن روم کی دیواریں بھی جیسے ایک بار جھرجھری لینے پر مجبور ہو گئیں۔ سبھی اپنی اپنی جگہ ساکت کھڑے تھے۔ ڈاکٹر آپریشن کرنا بھول گئے تھے۔ شلندر فوراً آگے بڑھ گیا۔

"مہر......! بیٹا......! سنبھالو خود کو...... اس......"

"نہیں انکل......! نہیں......! میں خود کو کبھی معاف نہیں کر سکوں گی...... میں...... میں اختر کی گنہگار ہوں۔ میں نے بہت دل دکھایا تھا اس کا...... بہت برا بھلا کہتی رہی ہوں اس کو...... یہ...... یہ میرے منہ سے محبت کے دو بول سننے کی حسرت دل میں لئے چلا گیا اور...... اور جب میں نے...... میں نے محبت کا اقرار کیا...... اس نے سننا پسند نہیں کیا...... یہ مجھ سے ناراض...... مجھ سے ناراض تھا یہ انکل......! میں اس کی مجرم ہوں۔ میں نے بہت زیادتی کی ہے اس کے ساتھ۔ بہت تکلیف دی ہے اس کو۔"

مہر جی زار و قطار رونے لگی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو نہیں جیسے دریا رواں

گئے تھے۔ ہم سب کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ پروفیسر جیسے خشک مزاج شخص کی
ھیں بھی بھیگ گئیں۔ اختر کا مزاج اس کے عادات و اطوار اس کی شخصیت ہی
تھی کہ اس کے مرنے پر پتھر بھی رو پڑے تھے۔

میرے لئے وہاں کھڑے رہنا مشکل ہو رہا تھا۔ سو میں جلدی سے باہر نکل
۔

سانس کی نالی میں جیسے کوئی گولا سا پھنس گیا تھا۔ دم گھٹ رہا تھا۔ یوں محسوس
ہا تھا کہ جیسے چلتے چلتے اچانک سینہ ایک زوردار آواز سے دھجیوں میں بٹ جائے
میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہاسپٹل کی عمارت کی عقبی طرف نکل آیا۔

یہاں ایک وسیع زمرد پوش پلاٹ تھا۔ کافی لوگ موجود تھے۔ کچھ گھاس پر
ہوئے تھے اور کچھ سیمنٹ کے بنچوں پر بیٹھے تھے۔ پلاٹ کا مشرقی کونا قدرے
ن تھا۔ میں اس طرف بڑھ گیا اور کونے میں پڑے سنگی بنچ پر جا بیٹھا۔

اختر کی موت حالانکہ غیر متوقع نہیں تھی، اس کے باوجود اعصاب اس دھچکے
ٹ پھوٹ کا شکار ہو گئے تھے۔ دل و دماغ پر مایوسی اور دکھ کا انتہائی زیادہ بوجھ
تھا۔ قلب و ذہن کی کیفیت نہایت دگرگوں ہو رہی تھی۔ مجھے احساس ہو رہا تھا
تر کی موت کا ذمہ دار میں ہوں۔ یہ سب کچھ میری وجہ سے ہوا تھا۔ ممی کا عشق
چڑھ آیا تھا۔ اس کے حصول کا جنون مجھ پر ہی طاری ہوا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا۔
ری ہو جانے پر میں اس قصے پر لعنت ڈال دیتا، ہندوستان کا رخ نہ کرتا تو نہ
کا کبھی ادھر آنا ہوتا اور نہ ہی وہ یوں موت کا شکار ہوتا۔

مگر ممی کی تلاش و جستجو کے اشتیاق میں میں جیسے حواس ہی گنوا بیٹھا تھا۔ اس
چکر میں پتا نہیں کتنے ہی انسان موت کا شکار ہو گئے تھے اور اب...... اب
پیاسی موت نے اختر کی زندگی بھی چھین لی تھی اور اتنا کچھ ہو جانے کے
س تابوت یا ممی کا کچھ پتا نہیں تھا۔ راج محل، مہاراج کی خواب گاہ، تہہ خانے
عجائب خانہ...... موت کے حلق تک سے ہو آئے تھے ہم مگر خالی داماں ممی
لینا تو دور ہم اس کی جھلک تک نہ دیکھ پائے تھے۔

میں نے سوچ لیا تھا کہ اختر تو ہم سب سے منہ موڑ کر چلا گیا، اس سے پہلے کہ کسی اور کو کوئی نقصان پہنچے، میں اس مشن کو یہیں ختم کر کے مصر واپس روانہ ہو جاؤں گا۔ ممی جائے بھاڑ میں، نامعلوم وہ کون سا منحوس لمحہ تھا جب میں نے اہرام دریافت کرنے کا قصد کیا تھا۔

اختر کا سراپا بار بار میری نگاہوں کے سامنے سرک آتا۔ ہنستا مسکراتا، شوخ و شنگ، زندگی کی گدگداہٹوں سے بھرا لہجہ۔ چہرے پر شفق کے رنگ سمیٹے اور...... اور پھر اچانک اس کا سرد، زندگی کے رنگوں سے عاری زرد چہرہ میری نگاہوں کے سامنے آجاتا۔ میں کافی دیر کونے میں پڑے اس سنگی بنچ پر بیٹھا خاموشی سے آنسو بہاتا رہا۔ اندر سے سسکتا رہا مگر وہاں سے اٹھ کر آپریشن روم تک جانے کی مجھ میں ہمت نہ ہو سکی۔ روتی آنکھیں، اداس وملول چہرے اور...... اور اختر کی لاش دیکھنے کی میں اپنے اندر طاقت نہیں پا رہا تھا۔

پھر مہر جی کی حالت بھی بڑی درد ناک تھی۔ اختر جب تک زندہ تھا، مسلسل اسے مجبور کرتا رہا تھا کہ میری محبت کا دم بھر لو مگر وہ نہ جانے کس خیال، کس جذبے کے تحت اسے جھاڑیں پلاتی رہی تھی......؟ وہ بیچارہ مہر جی کے منہ سے محبت کے دو جملے سننے کی آرزو دل میں لئے دنیا سے گزر گیا تھا اور اب جبکہ کچھ حاصل نہ تھا، مہر جی نے نہ صرف اس کی محبت کا اقرار کر لیا تھا بلکہ اس کی محبت میں پاگل ہوئی جا رہی تھی۔

بہت دیر تک میں وہاں ہزار ہا سوچوں میں غلطاں و پیچاں بیٹھا رہا۔ پھر شلندر کی آواز نے میری سوچوں کے تار بکھیرے۔

''شکیل صاحب......!'' میں چونک پڑا۔ شلندر اور عقیل دونوں میرے عقب میں موجود تھے۔

''شکیل صاحب......!'' شلندر گہری سنجیدگی سے دوبارہ گویا ہوا۔ ''اختر کی موت کا مجھے بھی انتہائی رنج ہے۔ وہ ایسا جوان تھا، ایسی طبیعت اور مزاج کا مالک تھا کہ تھوڑے سے وقت میں ہی میرے دل میں اتر گیا تھا۔ مگر

اس کی موت پر آپ سے ہمدردی کے الفاظ نہیں کہوں گا کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ رسمی کلمات اور ہمدردی کے لفظوں سے ایسے زخموں کا مداوا نہیں ہوا کرتا اور ویسے بھی میں رسمیات کا قائل نہیں ہوں۔'' میں نے ایک گہری سانس لی۔ عقیل نے کچھ کہنا چاہا مگر میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے منع کر دیا۔

''شکیل صاحب......! اختر جتنا آپ......''

''کچھ نہیں کہئے عقیل صاحب......! شلندر صاحب نے ٹھیک کہا ہے۔ کچھ زخم ایسے ہوتے ہیں کہ جو مرہم لگتے ہی سلگ اٹھتے ہیں...... کچھ دکھ ایسے ہوتے ہی جو دل کے نہاں خانوں میں سینت سینت کر رکھے جاتے ہیں۔ انسان ان غموں پر نہ تو ہمدردی کے لفظوں کے پھاہے پسند کرتا ہے اور نہ ہی ان کی تقسیم۔ براہ کرام میرا یہ غم بانٹنے کی کوشش مت کیجئے گا اور اپنا اپنے تک سنبھال کر رکھئے گا۔ یہ میرا اور اختر کا مسئلہ ہے۔ ہم دونوں کے درمیان ہی رہے گا۔''

عقیل دوبارہ کچھ نہیں بولا۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد شلندر گویا ہوا۔

''اختر کی باڈی میں نے سرد خانے میں رکھوا دی ہے...... بعد میں...... کوئی فیصلہ کر لیں گے۔ میرے کچھ آدمی بھی پہنچ آئے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں...... واپس جانا چاہئے۔''

''چلئے......!'' ہم لوگ دوبارہ ہاسپٹل کی اندرونی عمارت میں آگئے۔ باقی ساتھی، پرکاش دیو کے کمرے میں موجود تھے۔ شلندر نے اس کا شکریہ ادا کیا اور ہم باہر نکل آئے۔ کمپاؤنڈ میں دائیں طرف ایک ڈارک گلاس، ہائی ایس کھڑی تھی جس کے قریب ہی دو خوش پوش جوان کھڑے سگریٹ پھونک رہے تھے۔ ہمیں اپنی طرف آتا دیکھ کر دونوں نے سگریٹ پھینکے اور مستعد ہو گئے۔

''پریم......!'' شلندر نے قریب پہنچ کر ایک کو مخاطب کیا۔ ''تم وہ پک اپ لے جاؤ اور کسی سنسان سڑک پر چھوڑ دینا خود ٹیکسی کے ذریعے ایس پوائنٹ چلے جانا۔ اور تم خود ہمیں لے کر چلو۔'' آخری الفاظ شلندر نے دوسرے جوان سے کہے جلدی سے گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ کی طرف بڑھ گیا اور دوسرا عمارت کے دروازے

کے سامنے کھڑی پک اپ کی جانب۔

ہم سب ہائی ایس میں سوار ہو گئے۔ گاڑی بے آواز حرکت میں آئی اور گیٹ سے نکل کر سڑک پر دوڑتی ہوئی دوسری گاڑیوں کے ہجوم میں شامل ہو گئی۔

عارب کے چہرے پر مکمل سکوت تھا اور مہر جی کے چہرے پر ویرانی۔ پروفیسر تو ویسے بھی زیادہ تر گم سم ہی رہتے تھے۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد شلندر کی کوٹھی پر پہنچ گئے۔ راستے بھر ہمارے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ سبھی اپنی اپنی ذات میں گم اداس وملول خاموش بیٹھے رہے تھے۔

گاڑی رکتے ہی ہم لوگ نیچے اتر آئے۔ سورج مغرب کی جانب جھکنے لگا تھا۔ ہم گزشتہ تین دنوں سے بھوکے پیاسے تھے۔ احساس تو تھا مگر اختر کی موت نے ہماری بھوک پیاس کی طلب کو وقتی طور پر دبا دیا تھا۔

کوٹھی کے لان میں کرسیوں پر دو آدمی اور ایک پختہ عمر عورت بیٹھی تھی۔ ہم لوگوں کے گاڑی سے اترتے ہی وہ تینوں اپنی جگہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں نے محسوس کیا کہ عورت پر نظر پڑتے ہی شلندر واضح طور پر چونک پڑا تھا مگر اس نے فوراً ہی اپنے تاثرات پر قابو پالیا۔ وہ عورت ہماری جانب بڑھ آئی۔ شلندر کے آگے بڑھتے قدم رک گئے۔

''ایسا...... ہے کہ آپ لوگ جا کر آرام کریں پھر......'' اس کا لہجہ بڑا عجیب سا تھا۔

''مہر بیٹا......! تم انہیں ان کے کمروں تک پہنچا دو۔ خود بھی ذرا فریش ہو لو......نہا دھولو...... کچھ آرام کرو......'' وہ کچھ اس انداز میں بات کر رہا تھا جیسے لفظوں کے چناؤ میں دقت ہو رہی ہو۔

مہر جی نے ایک گہری نظر قریب آنے والی عورت پر ڈالی اور خاموشی سے آگے بڑھ گئی۔ ہم نے بھی قدم آگے بڑھا دیئے۔ ہمارے مخصوص کمروں تک وہ ہمارے ساتھ آئی۔ دروازے پر ایک ذرا ٹھٹک کر رکی پھر وحشت زدہ سی وہیں سے

واپس پلٹ گئی۔

عارب اور عقیل دوسرے کمرے میں چلے گئے ہیں اور پروفیسر خاموشی سے لیٹ گئے۔ ہمارے درمیان کوئی قابل ذکر بات نہیں ہوئی۔ کافی دن کی بے آرامی اور تھکن تھی۔ طبیعت پر یاسیت اور رنجیدگی طاری تھی۔ جسم پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا اور سر وزنی ہو رہا تھا۔ شام تک صورت حال یہی رہی۔ تقریباً مغرب کے وقت میں باتھ روم میں گھس گیا اور دیر تک ٹھنڈے پانی کے نیچے کھڑا رہا۔ نہا دھو کر کپڑے تبدیل کرنے کے بعد جب میں باہر نکلا تو اعصاب بڑی حد تک پُرسکون ہو گئے تھے۔ مگر ذہن کا بوجھ کم نہیں ہوا تھا۔ اختر کی تصویر جیسے آنکھ کی پتلیوں میں جم کر رہ گئی تھی۔

شلندر کے اصرار پر ہم سب رات کے کھانے پر اکٹھے ہو گئے مگر باوجود کوشش کے کوئی بھی ٹھیک طرح سے کھانے پر توجہ نہ دے سکا۔ شلندر بڑے مضبوط اعصاب کا مالک تھا۔ اس نے ہر ممکن کوشش کی تھی کہ اختر کے خیال کی طرف سے ہمارے ذہن ہٹا دے مگر......"

کافی بھی ہم سب نے اکٹھے بیٹھ کر پی تھی اور مجھے یقین ہے کہ شلندر نے کافی میں اعصابی و ذہنی سکون کی کوئی دوا ملا دی تھی اور شاید پُرسکون نیند کی بھی۔ کیونکہ اس کے بعد ہم زیادہ دیر تک بیٹھ نہیں سکے تھے اور اپنے کمروں میں آتے ہی بے سدھ ہو کر سو گئے اور وقت گزرنے کا احساس تک نہیں ہوا۔

دوسرے دن دوپہر تک ہم لوگ بے خبر سوتے رہے۔ البتہ جب آنکھ کھلی تو میں نے خود کو ذہنی واعصابی طور پر بالکل فریش پایا۔ سارا غم، سارا اضمحلال جیسے ڈھل گیا تھا البتہ زندگی کہیں سینے کے پاتالوں میں ایک پھانس، ایک چبھن سی موجود تھی۔

ہم لوگ نہا دھو کر فارغ ہوئے ہی تھی کہ وہ عورت آدھمکی جسے گزشتہ روز لان میں دیکھ کر شلندر چونک پڑا تھا۔

"شلندر صاحب ناشتے کی ٹیبل پر آپ لوگوں کے منتظر ہیں۔"

"چلیں......!" میں اٹھ کھڑا ہوا اور پھر ہم سب اکٹھے ہی ڈائننگ ہال پہنچے۔

شلندر اور مہر جی وہاں پہلے سے موجود تھے۔ شلندر نے اپنی جگہ سے اٹھ کر ہمیں تعظیم دی البتہ مہر جی اپنی جگہ لاتعلق سی بیٹھی رہی۔

''طبیعت کیسی ہے آپ لوگوں کی......؟'' شلندر نے فریش لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے......!''

''طبیعت تو پہلے بھی ٹھیک ہی تھی۔'' شلندر بیٹھ گیا اور وہ عورت بھی۔ ناشتہ کے دوران ہمارے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ ایک ملازم برتن سمیٹ کر لے گیا اور کافی کے برتن ہمارے سامنے سجا گیا۔

''اب آپ لوگوں نے آئندہ کے لئے کیا سوچا ہے......؟'' میرا مطلب ہے کہ آئندہ کیا کرنے کا ارادہ ہے......؟'' شلندر نے اچانک کہا۔

''واپس......!'' میں نے کافی کا کپ اٹھاتے ہوئے کہا۔

''ہم لوگ جلد سے جلد اختر کی باڈی لے کر واپس مصر پہنچنا چاہتے ہیں۔'' میرا لہجہ سنجیدگی لئے ہوئے تھا۔

''لگتا ہے آپ لوگوں نے اچانک ہی یہ فیصلہ کرلیا ہے......؟''

''ہاں......! ایسا ہی سمجھ لیں......!'' شلندر کچھ دیر خاموش ہوگیا۔

''اور وہ ممی......؟''

''چھوڑیں اس قصے کو شلندر صاحب......! میں مزید کسی بھی قسم کے نقصان کا متحمل نہیں ہوسکتا۔'' میں نے کافی کی ایک چسکی لی۔

''جو دھچکا لگ چکا ہے شلندر صاحب......! شاید ساری زندگی میں اپنے اندر سے اس کا ارتعاش نکال نہیں پاؤں گا۔ اب جلد سے جلد میں جاکر اسے مصر کی خاک کے سپرد کرنا چاہتا ہوں کیونکہ یہ اس مٹی کی امانت ہے اور اس مٹی پر اس بے جان کا حق ہے۔ آپ اگر اس سلسلے میں ہماری مدد کرسکیں تو ہم مشکور ہوں گے۔''

''یہ تو کوئی بڑا مسئلہ نہیں...... بآسانی حل ہو جائے گا۔''

''تو بس پھر جتنی جلدی ہو سکے آپ اس کا بندوبست کر دیں۔''

''آپ کب تک واپس جانا چاہتے ہیں......؟''

''اگر دن میں بندوبست ہو جائے تو ہم رات کی فلائٹ سے نکل جائیں گے اور اگر آج رات کو ہو جائے تو ہم صبح کی فلائٹ سے نکل جائیں گے۔''

''آپ تو لگتا ہے کہ ہمارے ملک سے بالکل ہی بیزار ہو گئے ہیں......؟'' شلندر دھیرے سے مسکرایا۔

''یہاں کی فضا میں سے مجھے اختر کے خون کی مہک آتی ہے۔'' میں نے آخری گھونٹ لیتے ہوئے کپ ٹیبل پر رکھ دیا۔

''چند ایک روز تو لگ ہی جائیں گے کیونکہ......'' شلندر کچھ کہتے کہتے رک گیا پھر مسکراتے ہوئے گویا ہوا۔

''خیر......! آئیں میرے ساتھ میں نے آپ لوگوں کے لئے ایک تحفہ رکھا ہوا ہے۔ وہ بھی آپ کے ساتھ ہی جائے گا۔'' شلندر اٹھ کھڑا ہوا۔

میں نے اک لمحے کو سوچا، پھر میں نے بھی جگہ چھوڑ دی۔ باقی افراد بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔

شلندر ہمیں لے کر اپنے لائبریری نما اسٹڈی روم میں آ گیا اور جب میں دروازے سے اندر داخل ہوا تو بے اختیار میرے قدم ٹھٹک کر رک گئے۔ سنسنی کی ایک تیز لہر میری ریڑھ کی ہڈی کو جھنجوڑ گئی۔

دائیں ہاتھ صوفوں کے درمیان کارپٹ پر ایک سیاہ آبنوس کی لکڑی کا بنا تابوت پڑا تھا۔ میں کچھ دیر کے لئے مبہوت کھڑا رہ گیا۔ میری متحیر نظریں اسی تابوت سے چپکی ہوئی تھیں۔ بلاشک و شبہ یہ وہی تابوت تھا جو میں نے اہرام کے اندر سے دریافت کیا تھا۔

''مریاقس'' کا تابوت ''بیوسا'' کی بیٹی مریاقس کا تابوت۔ جس کی تلاش و جستجو میں میں مصر سے ہندوستان آیا تھا۔ جس کی وجہ سے یہ تمام کھڑاگ پھیلا تھا۔ بیسیوں لوگ ہلاک ہوئے تھے اور...... اور اختر بھی موت کا شکار ہو گیا تھا۔ اسی مریاقس کا تابوت تھا یہ......

میرے ساتھیوں کی حالت بھی مجھ سے کچھ مختلف نہ تھی جبکہ شلندر کے

ہونٹوں پر ایک دلچسپ سی مسکراہٹ تھی۔ مہر جی اور وہ عورت البتہ بے تاثر چہرے لئے کھڑی تھیں۔

میں نے تیزی سے آگے بڑھ کر تابوت کا ڈھکن الٹا دیا۔ اندر وہی سنہری مجسمہ محو استراحت تھا۔ خوب صورت تیکھے نقوش کی مالک دوشیزہ کے ہونٹوں پر ایک سحر خیز سی مسکراہٹ۔ سبھی آگے بڑھ آئے۔ پروفیسر کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ان کے چہرے پر ہیجان کے تاثرات تھے۔

''تحفہ پسند آیا شکیل صاحب......!'' شلندر کی آواز پر میں چونک پڑا۔

''یہ...... یہ یہاں تک کیسے پہنچا......؟ کون لایا......؟'' میں نے حیرت و استعجاب سے کہا۔

''آئیں......! میں پوری تفصیل بتاتا ہوں آپ کو۔'' شلندر نے کہا اور ہم سب دوبارہ ڈائننگ ہال میں آگئے۔

''میرا خیال ہے کہ ایک دور کافی کا اور ہو جانا چاہئے...... کیا خیال ہے......؟'' شلندر نے سوالیہ نظروں سے ہماری جانب دیکھا۔

''کوئی مضائقہ نہیں......!'' عقیل نے فوراً کہا۔

شلندر نے مسکراتی نظروں سے اس عورت کی طرف دیکھا تو وہ سر ہلاتی ہوئی اٹھ کر ہال سے باہر نکل گئی۔

''رانی کا ذکر تو آپ نے سنا ہی ہوگا......؟ میں نے بتایا تھا کہ وہ راج محل میں ایک ملازمہ کے روپ میں موجود ہے...... خیرو کی بیوی......!'' شلندر نے گفتگو کا آغاز کیا۔

''ذکر سنا ہے......!'' عقیل نے کہا۔

''مجھے بھی یاد ہے۔'' میں نے کہا۔

''یہ خاتون رانی ہی تھی۔ اس لئے کل جب میں نے غیر متوقع طور پر اسے یہاں دیکھا تو چونک پڑا تھا کیونکہ اسے راج محل میں ہونا چاہئے تھا۔ اسی وجہ سے میں نے آپ لوگوں کو آرام کا کہہ دیا تھا اور خود رانی سے اس کی یہاں موجودگی کے

متعلق پوچھا تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ کتنا بڑا کارنامہ سرانجام دے آئی ہے۔ جو کام ایک پوری فوج نہیں کر سکتی تھی، وہ کام اس نے تن تنہا کر ڈالا اور کسی کی نظروں میں آئے بغیر یہ تابوت راج محل سے نکال لائی۔

''یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے......؟'' عقیل نے حیرت و بے یقینی سے کہا۔

''میں بتاتا ہوں نا...... کہ یہ کیسے ممکن ہوا......؟ مہاراج رام پرشاد کے بھائی، شام پرشاد کے متعلق تو میں نے آپ لوگوں کو بریف کیا ہی تھا۔ شرابی اور عیاش قسم کی طبیعت کا مالک۔ وہ رانی کی زلف کا اسیر ہو گیا تھا۔ رانی بھی بڑی ذہین عورت ہے۔ یہ اس کو بہلاتی تڑپاتی رہی اور اس کے اندر کی آگ کو ہوا دیتی رہی اور وہ دن بدن رانی کا دیوانہ ہوتا گیا اور رانی نے آہستہ آہستہ اسے پوری طرح شیشے میں اتار لیا۔ اب رانی موقع کی تلاش میں تھی کہ اسے استعمال کر سکے پھر جس روز ہم لوگ رام پور پہنچے اسی رات رانی کو موقع مل گیا۔

اس روز مہاراج کے کچھ خاص مہمان آئے ہوئے تھے۔ مہاراج اپنے مہمانوں کے ساتھ راج محل کے عشرت کدے میں پینے پلانے اور رقص و سرور کی محفل میں گم تھا کہ رانی نے شام پرشاد کو جا کر قابو کیا۔ پہلے تو عشوہ طرازیوں سے اسے جام پلاتی رہی جب اس کا دماغ سن ہو گیا تب رانی نے اسے اس کام پر راضی کر لیا۔ شام پرشاد فوراً ہی تیار ہو گیا۔ گاڑی بالکل خواب گاہ کے سامنے لے جائی گئی۔ وہاں موجود پہرے دار شام پرشاد کے حکم پر دوسری طرف چلے گئے۔ راہ داری کی لائٹ آف کر دی گئی۔ میرے دو اور آدمی جو ملازموں کے روپ میں وہاں موجود تھے، انہوں نے تہہ خانے سے تابوت نکال کر گاڑی تک پہنچانے میں شام پرشاد کی مدد کی۔ دوسری طرف ہم اس کوٹھی میں بے ہوش پڑے تھے اور مہاراج کے سپاہی ہمیں گرفتار کرنے کے لئے نکل چکے تھے اور شام پرشاد اور رانی تابوت لے کر چل پڑے۔ اب بھلا شاہی گاڑی کا راستہ کون روکتا یا کون، یہ دیکھنے کی کوشش کرتا کہ اس کے اندر کیا ہے؟'' شبلندر تفصیل بتا رہا تھا۔ اس دوران رانی ایک ملازم کے ساتھ واپس آ گئی۔ ملازم ٹرالی دھکیلتا ہوا آیا۔ کافی کے برتن اس نے ٹیبل پر رکھے اور خود

واپس چلا گیا۔ رانی خاموشی سے بیٹھ گئی۔ شلندر بول رہا تھا۔

''ادھر مہاراج کے سپاہی ہم لوگوں کو اٹھا لائے اور رانی وہاں پہنچ گئی، فی الوقت تو ایک بہت بڑا معرکہ سر ہو گیا تھا لیکن شام پرشاد کسی وقت بھی خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ سو رانی نے اسے اسی کوٹھی کے اندر دفن کر دیا۔ شام پرشاد کے ساتھ ہر اندیشہ دفن ہو گیا۔ اب رانی کو ہم لوگوں کے متعلق کوئی علم، کوئی اطلاع نہیں تھی اور خیرو اس وقت راج محل میں موجود تھا۔ سو رانی اسے لے کر یہاں آ پہنچی اور تابوت اسٹڈی روم تک پہنچا دیا گیا۔ یہ تھی تابوت کے یہاں تک پہنچنے کی مکمل تفصیل۔'' شلندر نے ایک گہری سانس لی اور کافی کا کپ اٹھا لیا۔

''زبردست......! حیرت انگیز کتنے آرام سکون سے رانی صاحبہ یہ تابوت یہاں تک لے آئیں، بلا خوف و خطر۔'' عقیل تحسین آمیز انداز میں بولا۔ رانی نے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا۔ جبکہ شلندر بول پڑا۔

''عقیل بن عاص......! یہ ایک حسن اتفاق رہا ورنہ ذرا سی بات بھی لیک آؤٹ ہو جاتی تو رانی کی لاش تک کا پتا نہ چلتا کہ کدھر گئی......؟''

''ہاں......! یہ بات تو ہے...... قدم تو انتہائی خطرناک تھا۔''

''اب ہمیں جلد سے جلد یہاں سے واپس لوٹ جانا چاہئے۔'' پروفیسر کی گھمبیر آواز ابھری۔ شاید وہ کچھ اور کہتے کہ عارب خشک لہجے میں بول پڑا۔

''فار گاڈ سیک پروفیسر......! مزید کچھ مت کہئے گا۔'' پروفیسر نے انتہائی ناگواری سے عارب کو گھورا مگر بولے کچھ نہیں۔

''اس تابوت کو یہاں سے مصر لے کر جانا آسان نہ ہوگا۔ بڑا خطرناک کام ہے۔ اس لئے اس خطرے کا بندوبست کرنے میں کچھ وقت تو لگے گا۔'' شلندر نے کہا۔

''مصر سے یہاں تک بھی تو پہنچا ہے۔''

''مہاراج کے پاس جو ذرائع ہیں، وہ ہمارے پاس نہیں ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ کسی قسم کا اندیشہ نہ رہے اور یہ ممی اور تابوت بغیر کسی جھنجٹ کے مصر تک پہنچ

جائے اور ایسے انتظام میں چند ایک روز تو لگ ہی جائیں گے، مگر......'' شلندر کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ اس کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات پھیل گئے۔

''مگر کیا......؟'' میں نے استفہامیہ انداز میں پوچھا۔

''مگر خطرہ تو پھر بھی باقی رہے گا۔''

''جب ہم اپنے ملک، اپنے گھر تک پہنچ جائیں گے پھر بھلا کیا خطرہ رہ جائے گا......؟''

''مہاراج رام پرشاد...... جو ایک بار یہ تابوت مصر سے ہندوستان اسمگل کروا سکتا ہے، وہ دوسری بار بھی ایسا کر گزرے گا اور یہ بھی ممکن ہے کہ ساتھ ہی آپ لوگوں کو کوئی ناقابل تلافی نقصان پہنچا دے۔''

''اس کی طرف سے آپ بے فکر ہو جائیں۔'' میرے بولنے سے قبل عارب بول پڑا اور ہم سب اس کی جانب متوجہ ہو گئے۔

''کیا مطلب......؟''

''آپ تابوت اور ان لوگوں کے جانے کا بندوبست کر دیں۔ میں یہیں رکوں گا۔ تب تک جب تک مہاراج کی سانسیں اس سے چھین نہیں لیتا۔''

''عارب......! پاگلوں والی باتیں نہیں کرو۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔

''جو ہونا تھا ہو گیا...... اب ہمیں مزید کسی مصیبت میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔''

''آپ مت پڑیں کسی مصیبت میں...... مگر میں ضرور پڑوں گا۔ جب تک میں مہاراج سے اختر کے خون کے ایک ایک قطرے کا حساب نہیں لوں گا، مجھے سکون نہیں ملے گا۔''

''بچوں جیسی باتیں نہیں کرو...... ختم کرو اس قصے کو۔''

''ختم کرو......؟ کیسے ختم کر دو......؟ کیا اختر کا خون اتنا ہی ارزاں تھا......؟ کیا اس کی زندگی اتنی ہی بے وقعت تھی......؟ وہ اتنا غیر اہم تھا کہ اس کی موت کو یوں فراموش کر دیا جائے......؟''

’’تو مہاراج کے مرنے سے کیا وہ زندہ ہو جائے گا......؟‘‘

’’بات کسی کے مرنے یا زندہ ہونے کی نہیں ہے شکیل صاحب......! بات حساب کی ہے، ضمیر کے سکون اور بے سکونی کی ہے۔ میں یوں سکون کی زندگی نہیں گزار سکتا۔‘‘ عارب نے زہر خند لہجے میں کہا۔

’’عارب......! اتنا جذباتی مت بنو...... ذہن کو ٹھنڈا کرو......‘‘ عقیل نے اسے سمجھانا چاہا تو وہ تیز لہجے میں بولا۔

’’ایک چوسنی اور فیڈر لا دیں مجھے...... پھر آپ لوگوں کو مجھے سمجھانے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔‘‘

’’میں کوئی......‘‘ عقیل نے کچھ کہنا چاہا تو میں نے انہیں ٹوک دیا۔

’’عقیل صاحب......! چھوڑیں اس موضوع پر بعد میں بات کریں گے۔‘‘ میں سمجھ گیا تھا کہ اس وقت عارب کی جو ذہنی کیفیت ہے اس میں ہم اسے قائل نہیں کر پائیں گے۔

’’شلندر صاحب......! آپ انتظامات مکمل کریں جتنی جلدی ہو سکے۔‘‘

’’ٹھیک ہے......!‘‘ میں آج ہی کوشش شروع کر دیتا ہوں۔ ابھی مجھے راج محل سے بھی رپورٹ لینی ہے کہ وہاں کی صورت حال کیا ہے۔ مہاراج کے تعلقات اتنے اوپر تک ہیں کہ ایک بار تو پورے ملک میں بھونچال آجائے گا۔ ہمارے لئے خاصی مشکل، خاصی سر دردی پیدا ہو سکتی ہے۔‘‘

’’جو ہونا ہے وہ تو ہو کر رہے گا۔‘‘ میں نے ایک گہری سانس لی۔

’’تو میں پھر آج اور ابھی سے آغاز کر دیتا ہوں۔‘‘ شلندر اٹھ کھڑا ہوا۔

’’آپ لوگ آرام کریں۔ میری غیر موجودگی میں کوئی کام، کوئی ضرورت یا کسی قسم کا بھی مسئلہ ہو تو مہر موجود ہے۔‘‘ پھر وہ رانی سے مخاطب ہوا۔

’’تم میرے ساتھ آؤ......!‘‘ پھر وہ دونوں ڈائننگ ہال سے باہر نکل گئے۔

ان کے جاتے ہی مہر جی بھی اپنی جگہ سے اٹھی اور خاموشی سے دوسرے دروازے میں غائب ہو گئی۔ اتنی دیر میں وہ ایک بار بھی نہ بولی تھی اور نہ ہی اس کے ہونٹوں پر

مسکراہٹ نظر آئی تھی۔

ہم لوگ بھی اٹھ کر اپنے اپنے کمرے میں آ گئے۔

یہ تو مجھے معلوم نہ تھا کہ ممی کو واپس لے جانے کے سلسلے میں شلندر کیا کرے گا؟ مگر اتنا یقین ضرور تھا کہ وہ لازمی کوئی نہ کوئی آسان راستہ نکال لے گا۔ اب مجھے انتظار اس بات کا تھا کہ شلندر کب تک انتظامات مکمل کرتا ہے اور کیا انتظامات کرتا ہے۔ شلندر گیا تو چھ روز تک دوبارہ اس کی شکل دکھائی نہ دی۔ نامعلوم وہ کن چکروں میں تھا؟ مہاراج کی طرف سے بھی اندیشہ تھا۔ اوپر سے شلندر کی بے خبری، میں نے مہر جی سے ذکر کیا تو اس نے کہا کہ بے فکر رہیں۔ انکل خیر خیریت سے ہیں اور دو چکر بھی لگا چکے ہیں مگر رات کے وقت۔ ایک رات وہ تابوت لے گیا تھا۔ ہم سے ملاقات نہ ہونے کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو یہ کہ رات کے اس وقت ہم لوگ سو رہے تھے اور شلندر نے ہمیں ڈسٹرب کرنا مناسب خیال نہیں کیا۔ دوسرا دونوں بار شلندر کچھ جلدی میں تھا۔ یہ خبر نہیں تھی کہ وہ ''مریاقس'' کا تابوت کہاں لے گیا ہے؟

مہر جی سے جب بھی سامنا ہوا میں نے اسے سنجیدہ اور خاموش ہی پایا۔ ایک مستقل اداسی نے جیسے اس کی آنکھوں میں ڈیرے ڈال لئے تھے۔

میں نے اور عقیل نے عارب کو بھی سمجھانے کی بہت کوشش کی تھی مگر اس کی سوئی وہیں کی وہیں اٹکی ہوئی تھی کہ ہم لوگ مصر کے لئے جیسے ہی روانہ ہوں گے، وہ راج محل کو منہ کر جائے گا۔ ہم دونوں ہی اسے سمجھا سمجھا کر تھک چکے تھے مگر اس پر ہماری کسی بات کا کوئی اثر نہ ہوا تھا۔ اس روز بھی ہم لان میں کرسیوں پر بیٹھے تھے اور یہی موضوع زیر بحث تھا کہ کسی گاڑی کے ہارن کی آواز سنائی دی۔ پھر گیٹ کھلا اور گاڑی اندر آ گئی۔ آنے والا شلندر ہی تھا۔ گاڑی میں دو جوان اور بھی تھے۔

شلندر گاڑی سے اترا اور مسکراتا ہوا ہماری جانب ہی آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں کاغذ کا ایک رول سا بھی تھا۔

''ہیلو...... ایوری باڈی......!'' اس نے خوش گوار انداز میں کہا اور ایک خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''کہاں گم ہیں آپ..... شلندر صاحب.....! اتنے دن ہو گئے شکل تک نہیں دکھائی۔'' عقیل نے مصنوعی خفگی سے کہا۔

''بھئی..... اب آ گیا ہوں دیکھ لو جی بھر کے۔''

''تھے کہاں تم.....؟''

''بس..... جھنجٹیں نبٹا تا پھر رہا تھا۔''

''اب نبٹ گئی ہیں.....؟''

''ہاں.....! سب کچھ فائنل ہے..... آپ لوگ بتائیں..... بور ہوتے رہے ہوں گے.....؟''

''بور کیا ہونا ہے.....؟ بس عارب صاحب سے الجھے رہے ہیں۔''

''کیوں.....؟''

''وہی..... خون کا بھوت سوار ہے۔''

''اب اتر جائے گا.....!'' شلندر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب.....؟'' شلندر نے ہاتھ میں پکڑا ہوا اخبار کا رول سیدھا کیا، وہ دو مختلف اخبار ''روزنامہ دہلی'' اور ''کرائم ٹائمز'' کے فرسٹ پیج تھے۔ وہ اس نے درمیان میں پڑی ٹیبل پر بچھا دیئے اور ہم بھی چونک پڑے۔

دونوں پر مہاراج رام پرشاد کی تصویریں چھپی ہوئی تھیں اور جلی سرخیوں میں لکھا ہوا تھا۔

''ریاست رام پور کے مالک مہاراج رام پرشاد کا قتل.....!''

اور نیچے مرچ مصالحوں کے ساتھ تفصیل درج تھی۔

''ملزموں نے راج محل میں گھس کر مہاراج کو قتل کر ڈالا تھا۔ انہیں کارتوس کا فائر لگا تھا۔ بروقت طبی امداد نہ مل سکنے کی وجہ سے مہاراج دم توڑ گئے تھے۔ رام پور ہی کی ایک کوٹھی سے چند اور لاشیں بھی برآمد ہوئی تھیں۔ مجرموں کا کچھ پتا نہ چل سکا تھا کہ وہ کون تھے؟ راج محل کے اندر مہاراج کی خواب گاہ تک کیسے پہنچے اور مہاراج پر فائر کرنے کے بعد اچانک پُراسرار طور پر کہاں غائب ہو گئے؟ پولیس فورس چکرائی

ہوئی تھی۔ پولیس کا خیال تھا کہ مہاراج کے قتل کی سازش محل کے اندر ہی تیار ہوئی تھی اور شک مہاراج کے بھائی شام پرشاد پر کیا جا رہا تھا کیونکہ مہاراج کے قتل کی صبح سے گزشتہ رات ہی سے شام پرشاد اور ایک ملازمہ گاڑی میں بیٹھ کر کہیں گئے تھے اور تاحال ان کی واپسی نہیں ہوئی تھی۔ پولیس والوں نے شک کی بنا پر راج محل سے چند افراد کو گرفتار کر لیا تھا۔''

''یہ تو کمال ہو گیا، ہمارے لئے سارے راستے آسان ہو گئے۔'' میں نے خوش گوار حیرت سے کہا۔

''ہاں بالکل......! سارے راستے سیدھے ہو گئے ہیں۔ دوسرا شخص شام پرشاد تھا جس کی طرف سے ہمیں کچھ خطرہ ہو سکتا تھا۔ وہ پہلے ہی پرلوک سدھار گیا، اب کوئی پریشانی نہیں، اصل معاملے کی تہہ تک کوئی پہنچ ہی نہیں سکے گا۔'' شلندر نے مطمئن انداز میں کہا۔

''حیرت ہے......! یقین نہیں آتا کہ مہاراج جیسا شیطان، اتنا باوسائل انسان اتنی آسانی سے موت کا لقمہ بن گیا۔'' عقیل نے حیرت سے کہا۔

''مسٹر عقیل بن عاص......! موت کچھ نہیں دیکھتی، پتا نہیں کیسی کیسی ہستیاں بے نشان کر ڈالی ہیں اس نے۔ ہاں البتہ ایسے لوگوں کی ایسی اچانک اور غیر متوقع موت سے کچھ دھچکا سا ضرور لگتا ہے اور ایسے ہی احساس ہوتا ہے کہ ایک خدا کی ذات بھی ہے، جس کے سامنے سب کے اختیارات دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔''

''ہاں......! یہ بات بھی ہے۔''

''عارب صاحب......! آپ بتائیں......اب آپ کا کیا ارادہ ہے......؟ اب تو آپ ہمارے ساتھ چل رہے ہیں ناں......؟'' مہاراج آپ کے ہاتھوں ہی ہلاک ہوا ہے۔'' میں نے عارب کو مخاطب کیا۔

''اب یہاں رکنا فضول ہی ہوگا۔'' عارب نے ایک گہری سانس لی۔

''پر مجھے ہمیشہ اس بات کا افسوس رہے گا کہ میں مہاراج کو تڑپا تڑپا کر مار نہ

سکا۔“

”پروردگار نے جس کی موت جس طرح لکھی ہوتی ہے وہ اسی طرح مرتا ہے۔“ پھر میں شلندر سے مخاطب ہوا۔

”شلندر صاحب......! آپ بتائیں...... آپ کے انتظامات کہاں تک پہنچے ہیں......؟“

”سب کچھ فائنل ہے۔ میں نے ایک سپیشل تابوت بنوایا ہے۔ نیچے مجسمہ ہے اور اوپر اختر کی باڈی، اجازت نامہ بھی لے چکا ہوں۔ یہ خیال رہے کہ قانونی کاغذات میں اختر کی موت ہارٹ اٹیک کے باعث ہوئی ہے۔ تابوت اس وقت گاڑی میں موجود ہے۔ اول تو یہاں یا مصر کے ائیر پورٹ پر چیکنگ ہوگی ہی نہیں اگر ہوئی بھی تو محض خانہ پوری کے طور پر...... کیونکہ اس کے انتظامات بھی میں کر چکا ہوں۔

اس سب کے باوجود مجسمہ میں نے ایک ایسے پلاسٹک بیگ میں پیک کروایا ہے کہ کوئی بھی برقی رو اس بیگ کو کراس نہیں کر سکے گی۔ سو ہر خطرہ ہر خدشہ ختم۔ مجھ سے جو ہو سکا میں نے ہر ممکن حد تک کرنے کی کوشش کی ہے اگر...... کوئی کوتاہی ہوگئی ہو تو اعلیٰ ظرفی سے نظرانداز کر دیجئے گا۔“ شلندر نے انتہائی پرخلوص لہجے میں کہا۔

”شلندر صاحب......! یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں......؟ ہم لوگ تو آپ کے شکر گزار ہیں آپ نے اتنا بھرپور ساتھ دیا ہے ہمارا۔ اپنی، اپنے ساتھیوں کی زندگیاں تک آپ نے داؤ پر لگا ڈالیں۔ ایسی باتیں کر کے ہمیں شرمندہ مت کیجئے۔“ میں نے دل سے کہا۔

اس کے بعد ہمارے درمیان کچھ رسمی باتیں ہوئیں۔ عقیل نے شلندر کو اس کے پیشے کا احساس دلا کر معاوضے کی بات کرنا چاہی تو وہ بھڑک اٹھا۔ اس نے عقیل کی اتنی تین پانچ کی کہ عقیل کچھ بول ہی نہ سکا۔ میں نے پہلی فلائٹ سے مصر جانے کی خواہش کا اظہار کیا تو شلندر نے مسکراتے ہوئے اپنے کوٹ کی اندرونی جیبوں سے ہمارے پاسپورٹ نکال کر ہمارے سامنے رکھ دیئے اور تابوت لے جانے کا

قانونی اجازت نامہ بھی۔ رات بارہ بجے کی فلائٹ تھی۔

حسب معمول رات کا کھانا ہم لوگوں نے اکٹھے ہی کھایا تھا۔ پھر شلندر اور مہر جی ہمیں ائیر پورٹ تک چھوڑنے آئے۔ پتا نہیں کس جذبے، کس خیال کے تحت مہر جی کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔ اور وہ جا کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔ پھر فلائٹ کی روانگی کا اعلان ہوا تو ہم لوگ بریف کیس سنبھالتے ہوئے شلندر سے رخصت لے کر آگے بڑھ گئے۔ ہمارے چلتے ہی مہر جی دوبارہ شلندر کے قریب آ کھڑی ہوئی۔

یکایک طبیعت پر ایک بوجھل سی یاسیت طاری ہوگئی۔ نہ جانے وہ کون سے عوامل تھے جن کے باعث دل دکھنے لگا تھا۔

جہاز میں سوار ہوتے وقت کلیجہ کٹ رہا تھا مگر میں خود اپنی کیفیت کو سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ شلندر اور مہر جی آخر وقت تک اپنی اپنی جگہ کھڑے رہے۔

پھر جہاز حرکت میں آیا اور کچھ ہی دیر بعد ہندوستان کی سرزمین سے بلند ہوتا چلا گیا۔

ہم اپنی آمد کی اطلاع پہلے ہی کر چکے تھے سو باسط اور حمید (ڈاکٹرز) دونوں گاڑیاں لے کر پہنچے ہوئے تھے۔ یہ تو علم نہیں کہ تابوت کی چیکنگ ہوئی یا نہیں البتہ ہمیں نہ تو زیادہ دیر انتظار کی زحمت کا شکار ہونا پڑا اور نہ کسی جھنجٹ کا۔

باسط ویگن لے کر آیا تھا اور حمید میرے والی سبز مرسڈیز۔ تابوت ویگن میں رکھوانے کے بعد ہم لوگ مرسڈیز میں بیٹھے اور گاڑیاں قاہرہ کی پر رونق سڑک پر دوڑ پڑیں۔ دل و دماغ پر ایک سوگواریت طاری تھی۔ ہم سبھی افسردہ اور ملول تھے۔

جب مصر سے ہندوستان روانہ ہوئے تھے تو اختر مسلسل ہنستا ہنساتا رہا تھا۔ مزے مزے کے چٹکلے سناتا رہا تھا۔ ایک لمحے کو بھی تو اس کی زبان خاموش نہیں ہوئی تھی۔ اس کے پھیپھڑوں میں شاید کوئی ایسی مشین فٹ تھی جو مسلسل قہقہے اچھالتی رہتی تھی۔ لیکن اسے تھکنے نہیں دیتی تھی اور آج...... آج ہمارے ساتھ وہ بھی تو واپس آیا تھا مگر کس صورت میں......؟''

''ایک...... ایک سرد اکڑی ہوئی لاش کے روپ میں۔ اس کے چہرے پر

مسکراہٹ نہیں تھی۔ سنگین سناٹے تھے...... اس کے ہونٹوں پر قہقہے نہیں موت کے قفل تھے...... ازل سے چمکتی ہوئی آنکھیں بے نور تھیں اور اس کے چہرے پر پھیلی رہنے والی زندگی کی شفق کی جگہ خزاؤں کے عفریت خیمہ زن تھے...... وہ ہمارے ساتھ سفر کر رہا تھا مگر ایک لاش کے روپ میں۔

''میری آنکھوں میں آنسو امنڈ آئے ہمارے...... ہمارے کیا خود اس بیچارے کے اپنے خواب خیال میں نہیں آیا ہوگا کہ اس کی واپسی اس انداز میں ہوگی۔

ہم ہاسپٹل پہنچے تو جسے اختر کی موت کا علم ہوا وہی رو دیا۔ ہم نے سب کو یہی کہانی سنائی کہ اس کی موت ہارٹ اٹیک کے باعث ہوئی ہے۔ ہم ہندوستان کیوں گئے تھے اس حقیقت کا علم ہمارے سوا اور کسی کو نہیں تھا۔ اختر کی لاش کو غسل بھی ہم لوگوں نے اپنے ہاتھوں سے دیا اور دوسرے دن دوپہر کے وقت سپرد خاک کر دیا۔ اس کا خمیر مصر ہی کی پُراسرار مٹی سے اٹھا تھا اور آج وہ اسی مٹی کے نیچے جا پہنچا تھا۔

تابوت میں نے اپنے بنگلے میں خواب گاہ میں رکھوا کر خواب گاہ کو لاک کر دیا تھا اور خود عقیل کے بنگلے میں سونے لگا تھا۔ پروفیسر دو روز بعد یونیورسٹی چلے گئے تھے اور جاتے جاتے کہہ گئے تھے کہ جب میری ضرورت ہو تو مجھے یاد کر لینا مگر میں اس تابوت اس مجسمے سے کچھ ایسی وحشت محسوس کرنے لگا تھا کہ میں نے اسے صرف نظرانداز ہی نہیں کر دیا بلکہ اپنے بنگلے میں سونا بھی چھوڑ دیا تھا۔ اس مجسمے اس ممی کی وجہ سے بہت خون بہا تھا، بہت لوگ قتل ہوئے تھے۔ مہاراج اور اختر بھی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ مجھے خوف محسوس ہوتا تھا کہ جس دن اس مجسمے کو تابوت سے نکالا گیا اس دن بہت بڑی تباہی آئے گی۔

اختر کا غم کچھ ہلکا ہوا تو میں ''سیوا'' اپنے گھر چلا گیا اور تقریباً ایک مہینہ وہاں رکا رہا۔ طبیعت بالکل فریش ہوگئی۔ جب میں خود کو ذہنی و روحانی طور پر بالکل تر و تازہ محسوس کرنے لگا۔ تب واپس ہاسپٹل آ گیا۔ زندگی کے شب و روز معمول پر آ گئے اور پھر ایک دن میں نے پروفیسر کو فون کر دیا۔

دوسرے روز صبح ہی صبح پروفیسر آ پہنچے۔ جب میں اپنے بنگلے پر ہی موجود تھا۔ عقیل بھی وہیں تھا جبکہ عارب پروفیسر کو لئے آ پہنچا۔

ہم بیڈ روم میں موجود تھے۔ دائیں ہاتھ صوفے کے ساتھ ہی وہ بھاری بھرکم تابوت پڑا تھا جس میں مجسمہ موجود تھا۔ اندر داخل ہوتے ہوئے پروفیسر کی نظریں اس تابوت پر جم کر رہ گئیں۔ ان کی آنکھوں میں چمک اور چہرے پر اشتیاق کے تاثرات سمٹ آئے۔ انہوں نے ہاتھ میں پکڑا بیگ ایک طرف رکھ دیا۔

''جی شکیل صاحب...... ! کہیئے خیر سے یاد کیا تھا مجھے......؟'' وہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولے۔

''ہاں پروفیسر صاحب...... ! خیر ہی ہے۔'' میں اب اس مجسمے سے متعلق اسراروں سے پردہ اٹھانا چاہتا ہوں اور اس کے لئے مجھے آپ کی مدد کی ضرورت تھی۔ آپ کو اپنا ادھورا کام مکمل کرنا ہے۔ مجسمے پر کندہ تحریر کا ترجمہ......''

''شوق سے...... میں تیار ہوں۔'' پروفیسر خوش دلی سے بولے۔

''بلکہ مجھے تو شدت سے انتظار تھا اس دن کا۔''

''چلیں پھر خدا کا نام لے کر اپنے کام کا آغاز کرتے ہیں۔'' میں نے کہا اور اٹھ کر تابوت کے قریب پہنچ گیا۔ وہ تینوں بھی میرے قریب آ گئے۔

''تابوت کو الٹانا ہوگا کیونکہ یہ دوسری طرف سے کھلے گا۔'' میں نے کہا۔ اور پھر ہم چاروں نے مل کر تابوت کو پلٹ دیا اوپر کا حصہ نیچے اور نیچے والا اوپر ہو گیا۔ اچھا خاصا وزنی تابوت تھا۔

''یہ کھلے گا کیسے......؟'' عارب نے کہا۔

''شلندر نے کوئی طریقہ کار بتایا تھا...... شکیل صاحب...... ! کیا آپ کو یاد ہے......؟''

''صبر کرو...... !'' میں لمبائی کے رخ سے تابوت کا جائزہ لینے لگا۔ تابوت کے ٹاپ سے دو انچ نیچے تختہ غیر محسوس سے انداز میں تھوڑا بڑھا ہوا تھا۔ میں نے وہاں ہاتھ رکھ کر پوری قوت سے دبا دیا۔

''ادھر سے...... دوسری طرف اوپر اٹھاؤ......!'' میں نے عارب کو مخاطب کیا اور اس نے تیزی سے آگے بڑھ کر ٹاپ کے کنارے سے پکڑ کر اٹھایا تختہ آرام سے اٹھ آیا۔ اس طرف سے میں نے پکڑا اور وہ تختہ اٹھا کر ایک طرف ڈال دیا۔ اندر وہ پُراسرار سنہری مجسمہ موجود تھا جس کی وجہ سے اتنا دنگا فساد پیدا ہوا تھا۔

''پکڑو ادھر سے...... باہر نکال اس کو۔'' میں نے مجسمے کو ٹانگوں کی طرف سے تھاما اور عارب نے سر کی طرف سے۔ مجسمہ کسی لاش کی طرح سرد تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ زیادہ وزنی نہیں ہوگا۔ مگر جب ہم نے اسے اٹھایا تو چودہ طبق روشن ہو گئے۔ یوں لگا جیسے اس میں پارہ بھرا ہوا ہو۔

قریب تھا کہ وہ ہمارے ہاتھوں سے گر جاتا۔ عقیل اور پروفیسر نے جلدی سے آگے بڑھ کر بوجھ بانٹ لیا۔ ہم چاروں نے مشکل سے اسے ایک طرف ایستادہ کیا تھا۔

''بہت زیادہ وزنی ہے یہ تو......!'' عقیل نے کہا۔

میں گہری نظروں سے مجسمے کا جائزہ لے رہا تھا جس کے سرتا پا تک باریک باریک نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ آڑے ترچھے تیروں کے نشان۔ مجسمے کی قامت بھی اچھی خاصی تھی۔ میرا قد چھ فٹ سے بھی نکلتا ہوا تھا جبکہ وہ مجسمہ چھ سے بھی چند انچ اونچا رہا ہوگا۔

''میخی طرز تحریر ہے۔'' پروفیسر بڑبڑائے۔

''آپ وثوق سے کہہ سکتے ہیں......؟''

''ہاں...... بالکل...... یہ تیر، یہ تیروں کا مثلث یہ میخی خطوط کہلاتے ہیں اور یہی وہ چیزیں، وہ علامتیں ہوتی ہیں جن کی مدد سے آثارِ قدیمہ والے ایسی چیزوں کی قدامت کا اندازہ لگاتے ہیں۔''

''جو بھی ہے پروفیسر......! اب یہ آپ کا کام ہے کہ آپ اسے ''عربی'' میں ڈھالیں تاکہ ہمارے پلے بھی کچھ پڑ سکے کہ اس مجسمے کے پیچھے کیا کہانی چھپی ہے......؟'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

پروفیسر نے ایک بھرپور نظر سے پورے مجسمے کا جائزہ لیا پھر گویا ہوئے۔
''اس عبارت کے مکمل ترجمے میں مجھے کم از کم چار گھنٹے لگ جائیں گے۔''
''تو بس......! آپ اپنا کام شروع کر دیں۔''
''میں تیاری کر کے آیا ہوں۔'' پروفیسر نے مسکراتے ہوئے کہا اور کچھ فاصلے پر پڑا اپنا بیگ اٹھا کر دوبارہ مجسمے کے قریب آ گئے۔ جبکہ ہم تینوں پیچھے ہٹ کر صوفوں پر بیٹھ گئے۔

''عارب......! یار تم جا کر کافی بنا لاؤ......! ایسا کرنا تھرماس بھر لانا ورنہ یوں چار گھنٹے گزارے نہیں جائیں گے۔'' میں نے عارب کو مخاطب کیا اور وہ مسکراتا ہوا اٹھ کر باہر نکل گیا۔

پروفیسر اپنے کام میں مگن ہو گئے اور ہم ادھر ادھر کی باتوں میں۔ کچھ دیر بعد عارب کافی کا تھرماس بھر لایا اور کافی کا سلسلہ چل پڑا۔ ایک کپ پروفیسر کو پیش کیا گیا۔

وہ کاغذ پنسل لئے اپنے کام میں لگے رہے۔ کبھی کبھار قریب رکھی موٹی سی کتاب اٹھا کر اس میں کچھ دیکھنے لگتے پھر دوبارہ مجسمے کی طرف متوجہ ہو جاتے۔
ہم وقت گزاری کے لئے فضول کی باتوں میں الجھتے رہے۔ وقفے وقفے سے کافی کے دور چلتے رہے اور تھرماس خالی ہو گیا۔ بے اختیار بار بار میری نظریں گھڑی پر جم جاتیں۔ آخر کار ساڑھے چار گھنٹے کے صبر آزما انتظار کے بعد پروفیسر ایک گہری سانس لیتے ہوئے مجسمے کے قریب سے ہٹ آئے۔
''لو جی......! یہ تو فائنل ہو گیا۔ بڑی دلچسپ کہانی ہے۔''
''لائیں دکھائیں ذرا......!'' میں نے بے قراری سے ہاتھ پروفیسر کی طرف بڑھایا۔

''ارے اکیلے اکیلے پڑھو گے کیا......؟'' یہ دو افراد بھی تو بیٹھے ہیں، میں خود پڑھ کر سناتا ہوں۔''
''تو پھر پڑھیں ناں......!''

''جناب.....! میرا دماغ پلپلا ہوگیا ہے۔ پہلے ایک کپ کافی پیئوں گا تاکہ ذہن کچھ تر و تازہ ہو جائے۔ ذہنی تھکاوٹ رفع ہو جائے۔'' پروفیسر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''پروفیسر.....! اب آپ تنگ کرنا چاہتے ہیں.....؟''

''عجیب بات ہے.....! اس میں تنگ کرنے والی کون سی بات ہے.....؟ ایک کپ کافی ہی مانگی ہے، میرا معاوضہ سمجھ لیں..... ساڑھے چار ہزار سال پرانے راز فاش کرنے جا رہا ہوں میں آپ لوگ شکریہ میں ایک کپ کافی نہیں پلا سکتے.....؟''

''جاؤ یار..... عارب.....! پھر لاؤ یہ.....'' میں نے تھرماس عارب کی طرف سرکایا وہ تھرماس اٹھا کر باہر نکل گیا۔ میری روح میں بے چینیوں کے بھنورے بیدار ہوگئے تھے۔ وجود میں سنسنی کی لہریں مچلنے لگی تھیں۔ ایک پُراسرار عہد، ایک تاریخ ہمارے سامنے بے نقاب ہونے والی تھی۔

تقریباً دس منٹ بعد عارب کی واپسی ہوئی۔ وہ صوفے پر بیٹھ کر کپوں میں کافی انڈیلنے لگا۔ میں نے جلدی سے ایک کپ اٹھا کر پروفیسر کی جانب بڑھا دیا۔

''یہ لیں..... اور بتائیں کیا داستان ہے.....؟'' پروفیسر نے کپ اٹھا کر ایک سکی لی۔ اور کاغذ کھول لئے۔

''سنو.....!'' انہوں نے چند لمحے توقف کیا پھر دوبارہ گویا ہوئے اور ہم یوں ہمہ تن گوش ہوگئے۔

''اے مسیحا.....!''

''اے موت کو شکست دے کر انسان کو دوبارہ زندہ کر دینے والے.....!''

''تیری نگاہِ مقدس، جسموں کے اندر تک دیکھنے کی صلاحیت رکھتی ہے.....!''

''مجھے معلوم ہے کہ یہ تو ہی ہے.....!''

''کہ تیرے سوا کوئی دوسرا اس تابوت اور مجسمے تک کبھی نہیں پہنچ پائے.....!''

''میں تجھے خبر کرتی ہوں کہ یہ مجسمہ محض مجسمہ ہی نہیں ہے......!''

''بلکہ اس کے اندر ایک زندہ وجود ہے......!''

''میری لخت جگر......!''

''مریاقس......!''

''وہ سو رہی ہے...... عذاب جھیل رہی ہے......!''

''محض انتظار میں......!''

''سن...... کہ پہلے میں تجھے مکمل احوال سے آگاہ کر دوں......!''

''میرا نام ''بیوسا'' ہے......!''

''میں شاہ مصر اخناتون کی داشتہ ہوں......!''

''مریاقس...... میری بیٹی ہے، اس کے علاوہ میری ایک بیٹی اور ہے جس کا نام ''انا آطو'' ہے......!''

''دونوں بہنیں ایک دوسرے پر جان چھڑکتی ہیں......!''

''میری دونوں بیٹیاں ہی دیوتا کی مہربانی سے بہت خوب صورت ہیں......!''

''شاہ مصر اخناتون ''مریاقس'' سے والہانہ اور دیوانہ وار محبت کرتا تھا......!''

''حالانکہ یہ اس کی ناجائز اولاد تھی......!''

''مریاقس...... سے اسے روحانی لگاؤ تھا......!''

''اس محبت کو دیکھ کر اخناتون کی جائز بیوی اور جائز اولاد ''مریاقس'' سے حسد کرنے لگی......!''

''مجھے اس کا بخوبی اندازہ تھا......!''

''یہ حسد نفرت کی اس انتہاء کو پہنچا کے انہوں نے ''مریاقس'' کو مار ڈالنے کا منصوبہ بنایا......!''

''مگر میری اتنی اوقات نہ تھی کہ ان کی شکایت اخناتون سے کرتی......!''

''آخر اخناتون کے جائز خون نے ساحروں کی مدد سے ''میرقاس'' کی روح کو کیل دیا......!''

''اس کے وجود میں ہی سلا دیا گیا، محبوس کر دیا گیا......!''

''اس کے تمام جسمانی افعال بند کر دیئے گئے......!''

''اس کے جسد خاکی پر ایسا طلسمی حصار ڈال دیا گیا کہ اس کی روح جسم سے پرواز نہ کر سکے......!''

''اور ہمیشہ کے لئے اس کے وجود کے اندر رہائی کے لئے تڑپتی رہے......!''

''اور اس قید کا عذاب جھیلتی رہے......!''

''طبی طور پر میری بیٹی مر چکی تھی کہ طب و حکمت جسم سے متعلق ہوتی ہے......!''

''اور ''مریاقس'' کے تمام جسمانی افعال منجمد ہو چکے تھے......!''

''مگر اس کی روح ابھی جسم میں محبوس ہے......!''

''اگر میں اخناتون سے کہتی تو وہ سمجھتا کہ میں اس کے عزیزوں سے حسد کرتی ہوں......!''

''اس لئے ایسا الزام لگا رہی ہوں......!''

''سو میں خاموش ہو رہی......!''

''اخناتون نے حکم دیا کہ اسے حنوط کرنے کے بعد......!''

''اس کے ذاتی اہرام میں دفن کیا جائے......!''

''حنوط کرنے کے لئے پہلے لاش کی کھوپڑی سے بھیجا نکالا جاتا ہے......!''

''پھر اس کے پہلو میں شگاف کر کے شکم سے آلائشیں نکالی جاتی ہیں......!''

''پھر وجود میں مصالحے بھرے جاتے ہیں......!''

''اور لاش کو کم از کم ستر دن تک کھارے نمک میں رکھا جاتا ہے......!''

''اگر وہ مصالحہ بھرنے کے لئے ''مریاقس'' کا شکم چاک کرتے تو طلسمی حصار ٹوٹ جاتا......!''

''اور ''مریاقس'' کی روح آزاد ہو جاتی......!''

''مگر اس سنگ دل اور سفاک عورت نے ایسا نہ کرنے دیا......!''

''مریاقس...... کے ظاہر کھلے اعضاء میں مصالحہ ٹھونس دیا گیا......!''

''اور محلول میں پٹیاں ڈبو کر اس کے وجود کو لپیٹ دیا گیا......!''

''گویا حنوط کر دیا گیا......!''

''شاہ مصر کے اہرام میں ''مریاقس'' کے تابوت کی جگہ......!''

''ایک ہیرے جواہرات سے مرصع ، خوب صورت خالی تابوت رکھوا دیا گیا......!''

''اور ''مریاقس'' کے تابوت کو ایک نہر میں پھنکوا دیا گیا......!''

''تابوت پر دال اور روغن کی ہلکی ہلکی پالش کر دی گئی تھی ......!''

''تا کہ فوراً نہ ڈوب جائے بلکہ تیرتا ہوا دور کہیں جا کر غرق آب ہو......!''

''میں ماں تھی سمجھ رہی تھی کہ بیٹی کی روح......!''

''کس کرب ناک و دردناک عذاب اور تکلیف کا شکار ہوگی......!''

''کافی دوری پر سے وہ تابوت میں نے نکلوا لیا......!''

''گو کہ میرے وسائل محدود تھے داشتہ ہی سہی مگر شاہ مصر کی منظور نظر تھی......!''

''میں نے ساحروں سے رابطہ کیا......!''

''اور انہیں کہا کہ میری بیٹی کی روح کو آزادی دلوائیں......!''

''مگر وہ باوجود کوشش کے ناکام رہے......!''

''کہ ''بندھ'' مضبوط تھا......!''

''انہوں نے کہا ساڑھے چار ہزار سال گزر جانے کے بعد......!''

''ایک ''مسیحا'' ان علاقوں میں آئے گا......!''

''اور اسے اس قید سے آزادی دلوائے گا......!''

''کہ اس کے سوا اور کوئی ایسا نہ کر پائے گا......!''

''وہ ''مسیحا'' انسانوں میں نئی زندگیاں اور خوشیاں بانٹتا ہوگا......!''

''وہ انسانی وجود کو کپڑوں کی طرح کھول کر اندرونی اعضاء دیکھنے کی صلاحیت

رکھتا ہوگا......!''

''اور وہی ''مریاقس'' کا رستہ نفس کھولے گا......!''

''جو اس کی آزادی کا باعث بنے گا......!''

''ایک روز شاہ مصر اخناتون کا موڈ بہت اچھا تھا......!''

''میں نے ''مریاقس'' کی ذات کا واسطہ دے کر ایک فرمائش کی جو اس نے فوراً مان لی......!''

''میں نے کہا کہ پلوز (موجودہ شہر فارمی کا قدیم نام)......!''

''اور بلیوس (بلبیس شہر کا قدیم نام) کے وسط میں جو پہاڑی خطہ ہے......!''

''وہاں زیر زمین میرے لئے ایک اہرام تعمیر کروا دے......!''

''اور اس نے ایسا کر دیا......!''

''جب تعمیر مکمل ہوگئی تو میں نے نیا تابوت بنوایا......!''

''اور ''مریاقس'' کا جسم چاک کروا کر حنوط کرواتی......!''

''تو میرے ساتھ ساتھ میری بیٹی انا آطو بھی موت کا شکار ہو جاتی......!''

''کہ اس کا وقت پہلے گزر چکا تھا......!''

''سو میں نے ایسے ہی......!''

''مریاقس......کو اہرام کے ایک الگ گوشے میں دفن کر دیا......!''

''انا آطو سترہ سال کی تھی......!''

''کہ شاہ مصر اخناتون کے ایک عزیز دیمتر اطوس نے انا آطو سے شادی کر لی......!''

''وہ انا آطو سے دوگنا بڑا تھا......!''

''اس کے باوجود انا آطو اس کے ساتھ خوش تھی......!''

''مگر اس سفاک عورت سے ان کی خوشیاں دیکھی نہ گئیں......!''

''اور اس نے انا آطو اور اس کے خاوند......!''

''دونوں کو زہر کے ذریعے ہلاک کروا دیا !''

''میرے بھی آخری دن آچکے ہیں......!''

''کہ کسی وقت بھی مرا چاہتی ہوں......!''

''مرنے پہلے مجبوراً......!''

''مجھے ''مریاقس'' کا تابوت دوبارہ کھولا نا پڑ رہا ہے......!''

''کہ میں یہ پیغام تیرے نام......!''

''مجسمے پر کندہ کروا رہی ہوں......!''

''کہ اے مقدس ''مسیحا......!''

''بعد الموت جسم ایک بستر ایک سرائے ہوتا ہے روح کے لئے......!''

''کہ وہ اس میں آتی جاتی رہتی ہے......!''

''مگر میری بیٹی کے لئے یہ عذاب خانہ ہے......!''

''اسے اس عذاب خانے سے نجات دلا......!''

''مجسمے کے شکم سے اس کا وجود باہر نکالنے کے لئے......!''

''تجھے مجسمے کے دونوں پستانوں پر دباؤ ڈالنا ہوگا......!''

''رع دیوتا تیرا حامی ہو......!''

''فقط......!''

''حرماں نصیب بیٹی کی حرماں نصیب ماں......!''

''بیوسا......!''

پروفیسر خاموش ہو گئے اور میں سوچوں کے اتھاہ سمندر میں ڈوبتا چلا گیا۔

ایک ایک حرف میرے ذہن میں بری طرح کھٹک رہا تھا اور......اور مجسمے پر کسی قدر مستحکم یقین کے ساتھ پیغام درج کیا گیا تھا۔ میرے ذہن میں آندھیوں کے جھکڑ سے چلنے لگے۔

خواب گاہ میں ہم چار افراد موجود تھے موت کی سی خاموشی تھی۔ گہرا......بوجھل سکوت، سبھی ان لفظوں کے زیر اثر تھے۔ مجسمے پر درج تحریر کا تمام مفہوم میری

ذات کو حصار میں لے رہا تھا۔ اور مجسمے تک پہنچنے والا شخص بھی تو میں ہی تھا۔

میں نے سر اٹھا کر دیکھا وہ سنہرا مجسمہ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ جس کے ہونٹوں پر ایک لافانی مسکراہٹ ثبت تھی اور جس کے اندر مریاقس کی غیر حنوط شدہ ممی تھی۔

میں لاشعوری طور پر اٹھ کر مجسمے کے قریب جا کھڑا ہوا، ہزاروں سال پہلے کے اور آج کے انسانی وجود کے درمیان صرف ایک سونے کی چادر حائل تھی۔ ماضی اور حال ایک دوسرے میں سمٹنے والے تھے، آپس میں مدغم ہونے والے تھے۔

''عارب......! پروفیسر......!'' میرے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔

''مریاقس کو اس دھاتی تابوت سے باہر نکالیں......!''

عارب، عقیل اور پروفیسر تینوں آگے بڑھ آئے۔ ہم نے مل کر بااحتیاط مجسمے کو پشت کے بل نیچے لٹا دیا۔

''کھولو اسے عارب......!'' میں نے عارب کو مخاطب کیا تو وہ ایک نظر ہماری صورتیں دیکھتا ہوا مجسمے کے قریب بیٹھ گیا۔ چند لمحے کے تذبذب کے بعد اس نے مجسمے کے سینے کے ابھاروں پر ہاتھ رکھے اور ان کو دبا دیا۔ ایک ذرا دونوں پستان نیچے کی جانب دبے اور پھر پُراسرار طور پر مجسمے کا اوپری حصہ کسی ڈھکن کی طرح بے آواز کھلتا چلا گیا۔

اس کے کھلتے ہی عارب بے اختیار بوکھلا کر پیچھے ہٹ گیا۔ ایک انوکھی اور نئی مہک آزادی نصیب ہوتے ہی فضا میں پھیل گئی۔ مجسمے کے اندر ایک ممی لیٹی ہوئی تھی۔ سر سے پاؤں تک سفید پٹیوں میں ملفوف۔ اس کا پورا وجود ان پٹیوں میں چھپا ہوا تھا۔ جسم کا معمولی حصہ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ کچھ دیر کے لئے کمرے کی فضا میں ایک پُراسراری خاموشی تیرتی رہی پھر ڈاکٹر عقیل کی آواز ابھری۔

''اب...... اب کیا کرنا ہے اس کا......؟''

''آپریشن......!'' مجھے اپنی آواز کچھ اجنبی سی لگی۔

''ممی کا آپریشن......؟'' ڈاکٹر عقیل کے لہجے میں سوال سے زیادہ حیرت تھی۔

''ہاں......! عارب......! تم اسٹریچر لے آؤ......!'' میں نے ڈاکٹر عقیل کو جواب دینے کے بعد عارب کو مخاطب کیا۔ اور وہ خاموشی سے باہر نکل گیا مگر اس نے آنے میں دیر نہیں لگائی۔ اسٹریچر وہ خواب گاہ کے دروازے تک لے آیا تھا۔

''اٹھاؤ اسے...... اسٹریچر پر لٹاؤ......!'' ڈاکٹر عقیل اور عارب دونوں ہی قدرے ہچکچائے پھر آگے بڑھ کر انہوں نے اس ممی کو ٹانگوں اور کندھوں سے تھام کر اٹھایا اور اسٹریچر پر لٹا دیا۔ اوپر ایک سفید چادر ڈال کر اسے مکمل طور پر چھپا دیا گیا۔ پھر ہم اسٹریچر دھکیلتے ہوئے باہر آئے اور ہاسپٹل کی عمارت کی جانب بڑھ گئے۔

سبھی ماتحت تھے، میں خود مختار کل تھا۔ سو کوئی پریشانی والی بات نہ تھی۔ آپریشن روم میں پہنچ کر ممی کو ہم نے آپریشن ٹیبل پر لٹا دیا اور ٹن اسٹینڈ کھینچ کر ٹیبل اور دروازے کے درمیان کر دیا۔

''شکیل صاحب......! آپ کو کچھ اندازہ ہے کہ آپ کیا کرنے جا رہے ہیں......؟'' عارب نے کہا۔

''کیا تمہیں لگتا ہے کہ میں حواسوں میں نہیں ہوں......؟''

''نہیں......! ایسی بات تو نہیں ہے مگر یہ سب......'' عارب نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''ایک ہزاروں سال پرانی ممی کا آپریشن...... کچھ عجیب سا لگ رہا ہے۔'' ڈاکٹر عقیل نے عارب کے خیال کا اظہار کر دیا۔ میری اپنی ذہنی حالت ان سے کچھ مختلف نہیں تھی۔ مگر میں کچھ نہ کچھ کرنا چاہتا تھا مگر راستہ مجھے سجھائی نہیں دے رہا تھا جبکہ ساڑھے چار ہزار سال قبل مجھے پر میرے لئے پورے وثوق کے ساتھ پیغام کنندہ کر دیا گیا تھا کہ مجھے مریاقس کو اس عذاب سے نجات دلانی ہے۔ اس کی مدد کرنی ہے مگر کیسے......؟ اس بارے میں خود مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔ میں ڈاکٹر تھا اور آ جا کر یہی بات میرے ذہن میں آتی تھی کہ مجھے مریاقس کا آپریشن کرنا ہوگا اور دل نے فوراً ذہن کے اس فیصلے پر مہر تصدیق ثبت کر دی تھی اور میں تیار بھی ہوگیا تھا۔ یہ آج تک کی تاریخ کا سب سے انوکھا اور عجیب وغریب آپریشن ہوگا۔

میں نے گہری سنجیدگی سے کہا اور ماسک چڑھا لئے۔ وہ اس آپریشن کے سلسلے میں خاصے متذبذب دکھائی دے رہے تھے۔

پروفیسر ایک جانب خاموش کھڑے ہوگئے۔ ہم نے دستانے پہنے اور تیز روشنیاں آن کر دی گئیں۔ میں نے قینچی کی مدد سے ایک پٹی کاٹی اور پھر ان پٹیوں کو کھولا جانے لگا۔ پٹیوں کو سینے اور جوڑ لگانے کے لئے ''تانت'' کا دھاگہ استعمال کیا گیا تھا۔ مگر سب کچھ انتہائی خستہ ہو چکا تھا۔ تقریباً بیس منٹ کی محنت کے بعد وہ تمام پٹیاں ایک طرف فرش پر ڈھیر کی صورت پڑی تھیں اور مریاقس کا وجود مادر زاد برہنہ حالت میں آپریشن ٹیبل پر پڑا مسیحائی کا منتظر تھا۔

ساڑھے چار ہزار سال کا طویل ترین سفر طے کر کے آج حال میں، لمحہ موجود میں مریاقس ہماری آنکھوں کے سامنے موجود تھی۔ چوبیس پچیس سال کے دکھائی دینے والے صحت مند وجود کی حامل ایک ایسی دوشیزہ جو درحقیقت ہزاروں سال عمر کی مالک تھی لیکن اس کا وجود آج بھی جوں کا توں موجود تھا۔ گویا اس نے وقت کے ساتھ سفر کیا ہی نہ ہو۔ ہزاروں سال وقت کے بہاؤ سے علیحدہ رہ کر گزارے ہوں اور آج یکا یک وقت کے بہاؤ سے ابھر کر حال میں ہمارے سامنے جلوہ افروز ہوگئی ہو۔

مریاقس کے جسمانی نشیب و فراز اور تمام خال و خد بالکل درست اور اپنی موزوں حالت میں تھے۔ البتہ اس کا پورا وجود اپنی اصل رنگت سے محروم دکھائی دے رہا تھا اور اس کی حتمی وجہ محلول آلود پٹیاں تھیں جو آج سے ہزاروں سال پہلے اس کے وجود پر لپیٹی گئی تھیں اور یقیناً مریاقس کے اجلے وجود کی موجودہ سیاہی مائل بھوری رنگت، کسی نامعلوم محلول میں تر انہی پٹیوں کی ودیعت کردہ تھی۔ رنگت کے علاوہ اس وجود میں اور کوئی غیر معمولی تبدیلی نہ تھی۔ وہ بالکل ایک عام انسانی وجود کی مانند تر و تازہ اور زندہ محسوس ہوتا تھا۔

اسے پٹیوں کی گرفت سے نجات دلاتے ہوئے ہم سب پر یہ حیرت انگیز انکشاف بھی ہوا کہ اس وجود میں آج بھی قدرتی نرمی اور اعضاء کی مخصوص لچک

برقرار تھی۔ حتیٰ کہ جسمانی حرارت بھی موجود تھی۔ گو کہ وہ حرارت ایک زندہ وجود کے مساوی نہ تھی پھر بھی اس قدر ضرور تھی کہ اسے چھونے والا کوئی فرد اسے لاش نہیں کہہ سکتا تھا۔

میں نے ایک نظر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا، ان کی سوالیہ نظریں مجھ ہی پر مرکوز تھیں۔

''اسے نہلانا دھونا پڑے گا۔''

''یہ فریضہ تو آپ خود ہی سرانجام دیں پھر......'' عارب نے لندھے اچکاتے ہوئے کہا تو ڈاکٹر عقیل فوراً بولے۔

''میں آپ کو مدد دیتا ہوں۔'' عارب اور پروفیسر پیچھے ہٹ گئے جب کہ میں ڈاکٹر عقیل کی مدد سے مریاقس کی جلد کی صفائی کے لئے مختلف کیمیکلز سے ایک مخصوص لیکوئڈ تیار کرنے میں لگ گیا۔ اس لیکوئڈ سے پہلے تو میں نے خوب اچھی طرح مسل مسل کر مریاقس کے پورے بدن کی مالش کی اس کے بعد عقیل اور میں اسے اٹھا کر باتھ روم میں لے گئے۔ مریاقس کے جسم کو باتھ ٹب میں لٹا کر میں نے نل کھول دیا۔ ڈاکٹر عقیل نے ڈس انفیکٹنٹ کی ایک مخصوص مقدار لاکر باتھ ٹب کے پانی میں ملا دی۔

اسے غسل دینے میں ہمیں اچھا خاصا وقت لگا۔ ایک عجیب سی میل جیسے اس کی جلد میں سے پھوٹتی رہی۔ ایک گہرا سیاہی مائل بھورا سا مواد اس کے کانوں اور نتھنوں میں سے بہتا رہا۔ تین، چار بار تو ہمیں باتھ ٹب کا پانی تبدیل کرنا پڑا تھا۔ پھر تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد جب میں اور ڈاکٹر عقیل نے اسے لاکر آپریشن ٹیبل پر لٹایا تو ڈاکٹر عارب اور پروفیسر متحیرانہ نظروں سے اسے دیکھتے رہ گئے۔

ڈیڑھ دو گھنٹے پہلے والے اور اب والے وجود میں فرق ہی اتنا واضح تھا۔ مریاقس کی جسمانی رنگت اسّی فیصد تک اپنی اصل حالت پر لوٹ آئی تھی۔ اس کی جلد کی ملائمیت آج بھی ویسے کی ویسی تھی۔

ہم سب ایک بار پھر آپریشن ٹیبل کے گرد اکٹھے ہو گئے۔

بظاہر کچھ ہوا تو نہیں تھا پھر بھی میرے احساس نے کہا کہ یکا یک تیز روشنی کچھ مدہم سی پڑ گئی ہے۔ مریاقس کے وجود کی موجودہ چمک نے تیز روشنیوں کو چندھیا کر رکھ دیا ہے۔

سبھی حیرت و بے یقینی سے آنکھیں پھاڑے ٹیبل پر بے حس و حرکت پڑے مریاقس کے برہنہ وجود کو تک رہے تھے اور میں ان کے ساتھ ساتھ اپنی متحیر حالت کو بھی بخوبی سمجھ رہا تھا۔ ہماری جگہ دنیا کا کوئی بھی انسان ہوتا کبھی بھی، کسی بھی صورت یہ یقین کرنے کو تیار نہ ہوتا کہ یہ تر و تازہ وجود ساڑھے چار ہزار سال پرانا ہے۔ بلکہ یہ تو بڑی بات رہی کوئی یہی یقین نہ کرتا کہ یہ زندہ نہیں مردہ ہے۔

یوں لگ رہا تھا کہ وہ حسینہ خود کو کپڑوں کی قید سے آزاد کئے نیند کے مزے لے رہی ہے۔ ہم تو سانس بھی اتنے دھیمے انداز میں لے رہے تھے کہ کہیں ہماری سانسوں کا ارتعاش محسوس کر کے وہ قتالہ عالم آنکھیں نہ کھول دے۔

عقیل اور عارب آنکھوں میں حیرت و بے یقینی کی تمام شدتیں سمیٹے کبھی مریاقس کے بے جان وجود کو دیکھنے لگتے، جس کا ایک ایک عضو تیز روشنیوں میں چمک اٹھا تھا اور روشنیاں جسم پر سے پھسل پھسل جا رہی تھیں اور کبھی وہ میری اور پروفیسر کی طرف دیکھتے گئے۔

"یہ...... یہ......" فرط حیرت سے عارب جملہ مکمل نہ کر سکا۔ ناممکن...... ناممکن ہے یہ سب......"

آنکھوں کے سامنے موجود، روز روشن کی سی اٹل حقیقت سے نظریں تو چرائی جا سکتی ہیں مگر اسے جھٹلایا نہیں جا سکتا۔" پروفیسر متانت سے بولے۔

"مگر یہ کیسے ممکن ہے کہ ہزاروں سال گزرنے کے بعد بھی کوئی انسانی وجود اسی...... ایسی اپنی اصل حالت پر برقرار ہو۔"

"قدرت کے سب کام نرالے ہیں اور دائرہ قدرت میں کچھ بھی ناممکن نہیں۔"

"یقین نہیں آ رہا......!" ڈاکٹر عقیل خود کلامی کے سے انداز میں بولے۔

''تقویٰ اور ایمان کی کمزوری کی علامت ہے یہ اگر ''قادر'' اور اس کی قدرت پر کامل یقین ہو تو پھر کسی بھی منظر پر کسی بھی جلوے کے ظہور پر بے یقینی نہیں آتی۔''

میں ٹیبل کی دائیں طرف آ گیا۔ لگتا تھا کہ پروردگار نے کائنات کا تمام حسن، تمام رعنائیاں و دلکشی سانچے میں ڈھال کر مریاقس کا وجود بنا دیا ہو۔ بے شک وہ لافانی حسن خوب صورتی کا شاہکار پیکر تھا۔

میں تمام سوچیں جھٹک کر مریاقس کے وجود کا باریک بینی سے جائزہ لینے لگا۔ جسم کے کھلے حصوں میں مصالحے بھرے ہوئے تھے اس کے منہ، ناک اور کانوں میں بری طرح مصالحہ ٹھنسا ہوا تھا۔ جس کی عجیب ناگوار...... ہلکی ہلکی بو نتھنوں سے ٹکرا رہی تھی۔ مصالحہ غالباً سانس کی نالی تک پہنچا ہوا تھا جس کی صفائی کے لئے حلق کا آپریشن ضروری تھا۔

''نشتر دو......!'' میں نے عارب سے کہا تو وہ الماری کی طرف بڑھ گیا۔ الماری کھول کر اس نے ''انسٹرومنٹ کٹ'' (Instrument Kit) نکال کر ٹرالی پر رکھی اور ٹرالی دھکیلتا ہوا قریب آ گیا۔ میں نے نشتر لیا اور اللہ کا نام لے کر مریاقس کے حلق پر چلا دیا۔

کھال، گوشت بالکل آسانی سے چیرا گیا مگر اس کے حلق میں پڑ جانے والے شگاف سے خون کا ایک قطرہ بھی خارج نہیں ہوا۔ البتہ سیاہی مائل بھورے رنگ کا تھوڑا سا مصالحہ ضرور برآمد ہوا۔ میں سکنگ پائپ کی مدد سے اس کے کانوں اور حلق میں ٹھنسا ہوا مصالحہ نکالنے لگا۔ پہلے اس کے ناک، کان اور حلق میں جما ہوا مصالحہ نکالا گیا پھر کیمیکلز کی مدد سے انہیں دھویا گیا۔

''واٹر گن'' کی مدد سے پریشر کے ساتھ اینٹی سپٹک کیمیکلز کا استعمال کیا گیا۔ ناک، کان اور گلے کو اچھی طرح دھونے کھنگھالنے کے بعد میں نے مریاقس کے حلق کے کٹ پر سٹیچز لگائے اور بینڈیج کر دی۔ مصالحہ ایک باؤل میں اکٹھا کرنے کے بعد وہ باؤل میں نے ڈاکٹر عقیل کے حوالے کر دیا۔

''اس کو سنبھال لیں، کسی وقت اس کا ''ایگزیمن'' کریں گے۔''

اب وہ پوری طرح اپنی اصل حالت میں تھی اور مزید کچھ کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ اس آپریشن میں تقریباً ہمیں ڈیڑھ گھنٹہ لگ گیا تھا۔ میں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے، سب کے چہروں پر ایک نظر ڈالی۔ ڈاکٹر عقیل اور عارب سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے جبکہ پروفیسر بغور مریاقس کے بے حس و حرکت وجود کو۔

اس کے خدوخال، نین نقش اپنے اندر قیامت خیز کشش رکھتے تھے اور وہ وہ سراپا قیامت تھی۔ یا پھر قیامت کی سب سے زیادہ خوب صورت نشانی۔ اس کے چہرے پر تازہ گلاب کی سی نرمی اور شگفتگی تھی۔

یہ میری پوری زندگی کا پہلا اور یقیناً آخری آپریشن ہوگا بلکہ آج تک کسی ڈاکٹر نے ایسا آپریشن نہ کیا ہوگا نہ ایسے آپریشن کا کہیں سنا ہوگا کہ صدیوں پہلے مر جانے والے کسی شخص کو آپریشن کے ذریعے زندگی کی جانب واپس لائے جانے کی کوشش کی گئی ہو۔

آپریشن کامیابی سے پائے تکمیل تک پہنچ چکا تھا مگر نتیجہ کوئی نہ تھا۔ بے ہوشی توڑنے والا انجکشن لگایا گیا مگر باڈی نے اسے قبول ہی نہ کیا۔ گیس سنگھائی گئی مگر اسے ہوش نہ آنا تھا سو نہ آیا۔ ہر طرح چیک کر کے دیکھ لیا مگر کوئی امید افزا بات سامنے نہ آئی۔ آکسیجن ماسک چڑھایا گیا کہ مصنوعی گیس دے کر دیکھا جائے شاید نظام تنفس چل پڑے۔ مگر ناکامی ہوئی، کچھ سمجھ نہ آ رہی تھی کہ کیا کروں اور کیا نہ کروں؟ آخر ایک آخری حل سمجھ میں آیا کہ شاک مشین سے اس قتالہ عالم کے دل کو شاک دیئے جائیں شاید اسی طرح اس کی ''ہارٹ بیٹ'' اسٹارٹ ہو جائے۔

آخر مشین سیٹ کی گئی میں نے شاکنگ پیڈ سنبھالا، وولٹیج ایڈجسٹ کیے اور اللہ کو یاد کر کے پیڈ مریاقس کے ساکت سینے پر رکھ دیا...... مگر اس کے وجود میں کوئی تحریک پیدا نہیں ہوئی...... دوسری بار...... تیسری بار...... چوتھی بار کچھ دیر یونہی گزر گئی مگر کوئی تسلی بخش نتیجہ نہ نکلا۔ آخر میں نے پیڈ ہٹا دیا اور ایک طرف سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

اور اپنی حماقت پر غور کرنے لگا۔

میں ایک ڈاکٹر تھا۔ جدید سائنس سے تعلق تھا میرا اور کیسی بے تکی فضول اور احمقانہ حرکتیں کر رہا تھا میں۔ صدیوں پرانی ایک ممی کا آپریشن .....! اسے ہوش میں لانے کی کوششیں..... کیا حماقت تھی.....؟

''شکیل صاحب.....! پریشان مت.....'' ڈاکٹر عقیل نے کچھ کہنا چاہا مگر اس کی بات ادھوری رہ گئی ایک کرشمہ، ایک انہونی ہوئی تھی۔

آپریشن ٹیبل پر پڑی ہوئی مریاقس کی برہنہ لاش نے ایک جھٹکا لیا تھا اس..... اس کے حلق سے ایک قلق انگیز کراہ خارج ہوئی تھی۔ ساکت سینہ آہستہ آہستہ پھولنے پچکنے لگا تھا۔ ٹیبل پر معلق لائٹیں دفعتہً معدوم ہوگئیں۔ اس کے جبڑے بھی آہستہ آہستہ حرکت کرنے لگے تھے۔ میں تڑپ کر اپنی جگہ سے اٹھا اور تیزی سے اس کے قریب پہنچ گیا۔ نہ جانے کس نرم جذبے کے زیر تحت میری آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے تھے، خون رگوں میں چھبنے لگا تھا اور دھڑکنیں اپنی رفتار سے تجاوز کر گئی تھیں۔

آہستہ آہستہ اس کی بھنویں اور خوب صورت پلکیں لرزنے لگیں۔ سینے کا زیرو بم بڑھتا گیا اور روشنیاں معدوم پڑتی گئیں اور پھر حیرت انگیز طور پر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ کتنی حیرت کی بات تھی کہ صدیوں سے زمین کی گہرائیوں میں دفن ایک لاش میری کوششوں سے زندہ ہوگئی تھی۔ میں خوش فہمی میں مبتلا تھا کہ آنکھیں کھولتے ہی وہ مجھے پہچان لے گی۔ بھلا وہ مجھے کیسے پہچان سکتی تھی۔

آنکھیں کھولتے ہی وہ ہم سب کی صورتیں تکنے لگی اور میں نے فوراً چہرے سے ماسک ہٹا دیا۔ لیکن اس کی آنکھوں میں ناشناسائی تھی۔

چند لمحے تک وہ ہماری صورتیں دیکھتی رہی۔ میں چونکہ اس کے زیادہ نزدیک تھا، اس نلئے وہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔ اس کے لب ہلے، ایک مترنم جلترنگ سا گنگنایا، اس کی دھیمی سی آواز ابھری اور ہم سب ایک دوسرے کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ وہ جانے کون سی زبان میں بولی تھی کہ ایک لفظ بھی سمجھ میں نہ آسکا تھا۔ البتہ پروفیسر فاضل بصاری اس کے مزید قریب ہوئے اور ٹوٹے ہوئے سے

انداز میں اٹک اٹک کر انہوں نے مریاقس سے چند نامانوس الفاظ کہے تو وہ پروفیسر کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے دھیمی آواز میں ان سے کچھ کہنے لگی۔

اس کے چہرے پر شدید ترین درد و کرب کے تاثرات پھیلے ہوئے تھے۔ پروفیسر صاحب نے کسی بات پر میری جانب اشارہ کیا تو اس نے میری طرف ایسی عقیدت و محبت سے دیکھ کر کچھ کہا کہ میرا دل حلق میں آ دھڑکا۔ وہ دوبارہ پروفیسر کی جانب متوجہ ہوگئی۔

"میں نے ایک نظر ڈاکٹر عقیل اور عارب کی سمت دیکھا۔ یقیناً میری طرح وہ دونوں بھی شدید سنسنی کا شکار تھے۔ جیسے انہیں اپنی اپنی بصارت اور سماعت کی کارکردگی پر شبہ ہو۔

مریاقس میں زندگی کی رمق بیدار ہوتے ہی جیسے اچانک مجھے اس کی برہنگی ناگوار گزرنے لگی تھی۔ میرا ارادہ تھا کہ میں اسے چادر اوڑھا دوں لیکن اس سے پہلے کہ میں اپنے اس ارادے کو عملی شکل دیتا، مریاقس کے پیروں کی رنگت نے مجھے چونکا دیا۔

اس کے پیروں کی رنگت تیزی سے تبدیل ہو رہی تھی۔ جیسے کوئی سایہ انہیں ڈھانپ رہا ہو یا پیروں میں موجود زندگی کی روشنیاں مدھم پڑ رہی ہوں، بجھتی جا رہی ہوں۔

"پروفیسر......! یہ...... یہ مریاقس کے پاؤں دیکھیں تو...... ان کی رنگت کیسے تبدیل ہوتی جا رہی ہے۔" میری فکرمندانہ آواز پر ڈاکٹر عقیل، عارب اور پروفیسر بھی مریاقس کے پیروں کی جانب متوجہ ہوگئے۔

ڈاکٹر عقیل نے جھکتے ہوئے بغور اس کے پیروں کو دیکھا اور متحیرانہ انداز میں بولے۔

"حیرت انگیز......! اس کی کھال تو تیزی سے سوکھتی جا رہی ہے۔"

پروفیسر ایک بار پھر مریاقس سے کچھ کہنے لگے اور میری رگوں میں گویا بے چینیاں کسملانے لگیں۔ ہماری دیکھتے ہی دیکھتے مریاقس کے پیروں کی سیاہ پڑتی رنگت بڑھتے بڑھتے اس کی رانوں تک پہنچ گئی۔ اس کے پاؤں اور پنڈلیوں کی کھال

سوکھتے سوکھتے کسی درخت کی جلی ہوئی چھال کی سی صورت اختیار کر گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کے پاؤں کی انگلیاں جھڑنا شروع ہو گئیں۔ بھربھری مٹی کی طرح۔

''پروفیسر.....! اس کے پاؤں.... انگلیاں....'' شدتِ جذبات کے باعث میں اپنا جملہ مکمل نہ کر پایا۔

مریاقس کے چہرے پر شدید کرب کے تاثرات چھائے ہوئے تھے۔ اب وہ خاموش تھی۔ اس کی نظریں میرے ہی چہرے پر جمی ہوئی تھیں اور مجھے اپنے لئے ان میں بڑی عقیدت اور بڑا احترام نظر آ رہا تھا۔

پروفیسر بھی بغور اس کے مٹی میں تبدیل ہوتے پیروں کو دیکھ رہے تھے۔ میں نے جھپٹ کر بے اختیار اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

''مریاقس......! مریاقس......! یہ تمہارا وجود مٹی کیوں ہوا جا رہا ہے......؟ یہ...... یہ ایسا کیوں ہو رہا ہے......؟'' اس کے ہونٹوں پر ایک بوجھل اور زخمی سی مسکراہٹ ابھری۔ آنکھوں میں محبت و احترام کے طوفان ایک ذرا کسمسائے اور پھر اس کے ہونٹوں سے چند آخری الفاظ خارج ہوئے۔

''میرے لئے...... میرے نام...... صرف میرے لئے......!''

اس کے پاؤں اور پنڈلیاں مٹی کی صورت اختیار کر چکی تھیں اور باقی کا جسم بھی لحہ بہ لحہ بکھرتا جا رہا تھا۔ مٹی ہوا جا رہا تھا اور میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ایسی صورت حال میں مجھے اس کے لئے کیا کرنا چاہئے؟

مریاقس کی آنکھیں چڑھتی جا رہی تھیں۔ میں نے اس کے رخسار تھپتھپائے۔

''مریاقس......! مریاقس......! آنکھیں کھولو......!'' میری آواز پر ایک ذرا اس نے میری جانب دیکھا۔ ہونٹوں پر دل نواز سی مسکراہٹ سمیٹی اور اس کی گردن میرے ہاتھوں میں ہی ڈھلک گئی اور پھر چند لحوں بعد میرے ہاتھوں میں اس کے خوب صورت چہرے کی بجائے ایک مشت خاک بچی تھی۔

یک بہ یک روشنیاں تیز ہوگئیں مگر مجھے یوں لگا جیسے میرے اطراف میں اندھیرے پھیل گئے ہوں۔ گھٹا ٹوپ اندھیرے......!

پروفیسر صاحب بتانے لگے کہ ان کی اس سے کیا گفتگو ہوئی۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے پروفیسر کہیں بہت دور سے بول رہے ہوں۔

''ہوش میں آتے ہی اس نے دریافت کیا تھا کہ میں کہاں ہوں......؟ آپ لوگ کون ہیں......؟ اور یہ کون سے فرعون کا دورِ حکومت ہے......؟ میں نے بتایا کہ یہ کون سا دورِ حکومت ہے اور وہ کہاں ہے اور یہ کہ اسے ساڑھے چار ہزار سال بعد زیرِ زمین دفن اہرام سے نکالا گیا ہے۔ اس نے کہا میں مسلسل عذاب میں مبتلا تھی، میرا محسن کون ہے جس نے مجھے اس عذاب سے نجات دلائی۔ میں نے تمہاری جانب اشارہ کیا تو وہ عقیدت بھرے انداز میں تمہارا شکریہ ادا کرنے لگی۔

پھر کہنے لگی کہ مجھے تازہ ہوا کی ضرورت تھی جو مجھے میسر آ رہی ہے اور اسی میں میری نجات ہے۔ میں عالم ارواح میں چلی جاؤں گی اور خاک کا پتلا خاک میں مل جائے گا اور جب تم نے اس کا چہرہ تھام کر اسے مخاطب کیا تو وہ بولی۔

میرے محسن......! تم نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے کہ مجھے اس خاک کی قید سے آزادی دلائی اور میں تمہاری اس بے قراری کو خوب سمجھ رہی ہوں۔ تمہاری محبت کا اندازہ ہے مجھے۔ میری زندگی صدیوں پہلے پوری ہو چکی تھی مگر آزادی اب نصیب ہو رہی ہے، میں جا رہی ہوں...... میں جا رہی ہوں......!'' پروفیسر صاحب خاموش ہو گئے۔ آپریشن روم میں گہری بوجھل سوگوار خاموشی پھیل گئی۔

فطرت میں پڑی گرہیں کھل چکی تھیں، رکاوٹیں سرک گئی تھیں اور ان رکاوٹوں کے ہٹتے ہی مریاقس کا وجود فطرت کی گرفت میں آ کر اپنی پہچان کھو بیٹھا تھا۔ اپنے فطری انجام کو پہنچ چکا تھا۔

میں نہایت نرمی سے آپریشن ٹیبل پر بکھری ہوئی خاک کو سہلا رہا تھا۔ یوں جیسے اس خاک میں میری کوئی عزیز ترین شے کھو گئی ہو۔

بعد صدیوں کے جو آئی تھی نظر کے روبرو
دیکھتے ہی دیکھتے وہ لاش مٹی ہو گئی!

اختتام